رنگا رنگ کہانیوں سے آراستہ دلچسپ جریدہ
ماہنامہ
نئے اُفق
کراچی
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

ابتدائیہ

سچی کہانیاں

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

ناول

مغرب سے انتخاب

مستقل سلسلے

خط وکتابت کا پتا: ماہنامہ نئے افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبر 021-35620771/2
فیکس 021-35620773 مطبوعات نئے افق پبلی کیشنز ای میل Info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

آج کی صحافت بے اثر کیوں ہے......؟

حقیقی صحافت سے منسلک افراد کو یہ شکوہ پیدا ہو چکا ہے کہ اب صحافت اتنی پُراثر اور مؤثر نہیں رہی جیسا کہ ماضی میں تھی۔ نہ ویسے صحافی رہے نہ وہ دم خم وہ اثر رہا۔ جب کہ آج پڑھنے والے بھی زیادہ ہیں اور اخبارات وجرائد بھی لاتعداد ہیں پھر کیا بات ہے کہ چار پانچ سو اشاعت والے اخبارات وجرائد کا ملک و قوم پر جس طرح اثر انداز ہوتے تھے اب پچاس ہزار اشاعت والے اخبارات کا بھی وہ اثر نہیں رہا صحافت بے دم ہوگئی ہے؟

ہاں اہلِ صحافت کی یہ فکر مندی' یہ سوچ حقیقت پر مبنی ہے۔ کیونکہ اب نہ مولانا حسرت جیسا کوئی صاف گو صحافی ہے' نہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کی ٹکر کا کوئی مدیر ہے اور نہ ہی ان کے بعد کی نسل کے چراغ حسن حسرت' حمید نظامی' الطاف حسین' میر خلیل رحمٰن' ارشاد بیگ چغتائی' عثمان آزاد' فخر ماتری سا کوئی ہنر مند ہے۔ صحافت سے وابستہ ہر چھوٹا بڑا منافع کمانے میں لگ چکا ہے۔ کیونکہ صحافت اور اخبار سازی کو اب مشن یا مقصد کی جگہ صنعت کا درجہ دے دیا گیا ہے اور اب تمام اخباری ناشرین' مدیر اور اہلِ صحافت سب کا قبلہ بدل چکا ہے پہلے لوگ دیانت داری سے اپنے ذاتی مفادات سے بے پروا ہو کر ملک وقوم کے مفادات کو پیش نظر رکھتے تھے ملکی قومی عوامی مفادات کے لیے ذاتی مفادات کو طاق میں رکھ دیتے تھے مشکلات ومصیبتوں کا سامنا کرتے تھے۔ پیسے سے زیادہ انہیں اپنے نام کی فکر ہوتی تھی آج کے اہلِ صحافت کارکنان پریس کلبوں میں پائے جاتے ہیں اور مالکان ومدیران اپنی اپنی انجمنوں میں اپنے اپنے مفادات کے تحفظ میں مصروف نظر آتے ہیں اب خبر کی خبریت اور اہمیت سے زیادہ انہیں مفادات عزیز ہو چکے ہیں۔ پہلے مدیر اور کارکن خبر کے پیچھے پیچھے بھاگا کرتے تھے اب خبر بے چاری اتنی مجبور وبے بس ہو چکی ہے کہ وہ مدیران اور اخباری کارکنان کے پیچھے بھاگتی نظر آتی ہے۔ اہلِ صحافت کی آرام طلبی مفاد پرستی نے اب خبر کا مزاج بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اب خبر خبر نہیں قصہ کہانی بن کر سامنے آتی ہے اور کہانی کے ہی طور پر دہرائی جاتی ہے۔

اہلِ صحافت کی آسانی بلکہ تن آسانی میں برقی ذرائع ابلاغ نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہر گلی محلہ کا اپنا الگ چینل نظر آنے والا ہے۔ جن پر خبر سے زیادہ دل جوئی دل چسپی کے پروگرام ڈراموں گیتوں مذاکروں کی صورت نظر آتے ہیں۔ وہ بھی بڑے اور اہم چینلز پر باقی کا تو اللہ ہی حافظ ہے کہیں کسی چینلز پر رسم بسم اللہ کی تقریب نظر آرہی ہے تو کہیں کسی کے عقیقہ شادی بیاہ اور دُکان کے افتتاح کی تقاریب یا پھر ان کے حوالوں سے ملنے والے اشتہارات جیسی روح ویسے فرشتے کے

مصداق اخبارات وجرائد کا یہی عالم ہوگیا ہے کہ ان میں بھی ملکی غیر ملکی قومی بین الاقوامی خبروں کے حصول کے لیے کوئی ادارہ اب ذاتی کوشش وکاوش نہیں کرتا بلکہ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ سے نقل کر لی جاتی ہیں۔ ہاں کوئی ایسی خبر جو از خود وجود میں آجاتی ہے' جس کا سرا زبردستی ہاتھ آجاتا ہے۔ جیسے خود کش حملے ایسے ہی قدرتی غیر قدرتی حادثات جن کی خبریں از خود بنتی چلی جاتی ہیں وہ تو پھر مجبوری ہے اور مقابلے کی دوڑ میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا جائے ان کی جتنی چٹنی پیسی جاسکتی ہو پیسی جائے لیکن ان کے پس پردہ حقائق کو جاننے ان کی خبر لینے کی زحمت کوئی نہیں کرتا' پہلے کے لوگ ضرور بال کی کھال نکالا کرتے تھے۔ وہ ہر خبر کا تعاقب کیا کرتے تھے اس کی اصل حقیقت تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کیا کرتے تھے۔ کوئی خبر بغیر تصدیق تحقیق کے نہیں لگایا کرتے تھے جب کہ آج کے اہلِ صحافت کا سارا زور خود بخود آجانے والی پریس ریلیزوں پر ہوتا ہے۔

آج جب کہ ہم یورپ اور امریکا کی ہر معاملے میں نقالی کر رہے ہیں اہل صحافت بھی ان کے برقی ذرائع ابلاغ سے بے دریغ استفادہ کر رہے ہیں۔ پریس کلبوں میں یا اپنے دفاتر میں مانیٹرنگ ڈیسک پر بیٹھ کر عالمی خبریں بنا لیتے ہیں لیکن کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ تمام یورپ اور دیگر ممالک کے اخبارات کیا یوں مفت ہاتھ آجانے والی پریس ریلیز بغیر اپنے رپورٹر کی تصدیق کے شائع کر دیتے اور کیا ان کے لیے یوں ہر خبر خبر ہوتی ہے انہیں خوب اندازہ ہوتا ہے کہ کس خبر کی کیا اہمیت ہے۔ اسے اخبار کے کس صفحہ پر کس جگہ لگانا چاہیے یہی وجہ ہے کہ وہاں صحافت آج بھی ایک مقدس اور اہم شعبہ ہے جب کہ ہمارے یہاں تو جوتیوں میں دال بٹ رہی ہے۔ ہرا یرا غیرا جس کی جیب میں سرمایا ہو وہ بے کھٹکے اخبار نکال لیتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اسے سرکار دربار میں بہ آسانی رسائی حاصل ہو جاتی ہے اور ایسے اخبارات وذرائع ابلاغ میں ایسے ایسے کارکنان کام کرنے لگتے ہیں جن کا مقصد صرف پیسا کمانا ہی ہوتا ہے ان کے لیے اپنے اور اپنے اخبار یا ادارے کے نام کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ دونوں ہاتھوں سے نا صرف جیبیں بھرتے ہیں بلکہ ان کا پیٹ بھرا رہتا ہے۔ اب دو میں سے ایک ہی کام ایک وقت میں ہو سکتا ہے یا تو نام کما لیں یا پیسا اس لیے ہی اہلِ صحافت اور صحافت دونوں ہی بے اثر ہو کے رہ گئے ہیں۔ صحافت جب تک ایک مشن کے طور پر ایک مقصد کے طور پر کام کرتی رہی پر اثر اور طاقت ور رہی اور جب مشن نے صنعت کا لبادہ اوڑھ لیا تو مفادات کا دامن پھیلتا چلا گیا جو دراز اور دراز ہو رہا ہے۔ صحافت جو کبھی ایک مشن تھی اب مرتی جا رہی ہے۔ اللہ ہمیں عقل سلیم عطا فرمائے اور صحافت کی آبیاری کی توفیق دے۔ آمین

عمران احمد

’’حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو اور وہ بغض و عداوت ہے جو صرف اللہ کے لیے ہو۔‘‘ (سنن ابی داؤد)

عزیزان محترم ...... سلامت باشد۔

نومبر کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔

گزشتہ ماہ زلزلہ نے پوری قوم کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا۔ سات اعشاریہ سات کی شدت کے زلزلے نے کراچی کو ہلایا ہی تھا، بلوچستان کے شہر آواران کو بالکل مٹی کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ یہ ہمارا ذاتی مشاہدہ ہے کہ جب زلزلہ کے جھٹکے آئے تو لوگ بے ساختہ کلمہ پڑھتے ہوئے گھروں عمارتوں اور دفاتر سے باہر نکل آئے اور اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ و استغفار کرنے لگے مگر یہ سب وقتی تھا۔ اگلے روز تمام لوگوں کے وہی شب و روز تھے۔ تمام ٹی وی چینلوں پر وہی راگ رنگ کی محفلیں تھیں۔ انڈین ڈرامے اور فلمیں چل رہی تھیں اور عوام زلزلہ کے خوف سے آزاد یہ سب کچھ دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔ علما مساجد اور جمعہ کے خطبے میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے مشورے اور نصیحتیں کر رہے تھے۔ پتا نہیں ہم لوگوں کی یہ کیا نفسیات بن گئی ہے کہ ہر کام خوف کے زیر اثر ہی کرتے ہیں۔ سڑک پر قانون کی پابندی اس لیے نہیں کرتے کہ یہ ہماری ذمہ داری ہے بلکہ اس لیے کرتے ہیں چالان نہ ہو جائے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارا یہی وتیرہ بن گیا ہے۔ ہمارے عالم دین بھی ہمیں صرف دوزخ کے عذاب اور اللہ کے قہر سے ڈراتے ہیں مساجد جانے والوں کی اکثریت بھی خوف کے باعث سربسجود ہوتی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ ڈرانے والی اور صرف سزا دینے والی قوت کا نام ہے؟ کیا وہ زلزلے اور طوفان ہمیں سزا اور اذیت دینے کے لیے بھیجتا ہے؟ جبکہ وہ کہتا ہے کہ میں اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ ایک ماں کی محبت کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کے بچے کو معمولی سی سوئی بھی چبھ جائے تو تڑپ اٹھتی ہے تو پھر ستر ماؤں سے زیادہ اپنے بندوں سے پیار کرنے والی ہستی کیسے اپنے کسی بندے کو تکلیف دے سکتی ہے؟ یاد رکھیں ہم پر نازل ہونے والی مصیبتیں اور مشکلیں منجانب اللہ نہیں بلکہ خود ہماری تخلیق کردہ ہیں۔ اللہ رب العزت کے سامنے جھکیں، خوف سے نہیں بلکہ اس کے پیار میں اس کے عشق میں۔ اس کی شکر گزاری میں کہ اس نے ہمیں انسان بنایا۔ ہمیں نام نہاد ہی سہی مگر مسلمان خاندان میں پیدا کیا۔ وہ تو رحیم اور شفیق ہے وہ نعمتیں دینے والا، ہمارے ہر ہر چھوٹے سے چھوٹے نیک عمل پر جو ہم نادانستہ کر بیٹھتے ہیں جس کا ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا، اس پر بھی انعام دیتا ہے جو صرف استغفار کہنے پر ہماری غلطیوں کو معاف کر دیتا ہے۔ تو وہ ظالم کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے ڈریں مت اس سے پیار کریں۔ اس کی محبت میں اس کی شکر گزاری میں اس کے آگے جھکیں یقیناً وہ بڑا رحیم اور کریم اور معاف کرنے والا ہے۔

اب آئیے اپنے تلخ و شیریں محبت ناموں کی طرف۔

کراچی صدر سے عبدالرحمن مانی رقم طراز ہیں۔ برادرم عمران احمد اور تمام اسٹاف نئے افق کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ تمام لوگوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ اکتوبر کا نئے افق کراچی کی خوف و دہشت کی فضا میں بہار کے خوشگوار جھونکے کی مانند ملا۔ گو ڈائجسٹ تو بہت سے ہیں لیکن نئے افق کی بات ہی نرالی ہے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا، نئے افق کو اشیائے ضروریہ کی مانند ہر ماہ گھر میں آتے دیکھا ہے۔ نئے افق میں نے تب سے پڑھنا شروع کیا جب سے میں نے لکھنا پڑھنا شروع کیا۔ یہ پرچہ میرے والد صاحب باقاعدگی سے پڑھا کرتے تھے۔ بچپن میں تو میں صرف کہانیوں کے شروع میں چھپنے والے اسکیچ دیکھ کر خوش ہوتا تھا، جب اسکول جانے لگا اور پڑھنے کے قابل ہوا تو نصاب سے ہٹ کر جو پہلی کتاب میں نے پڑھی وہ نئے افق تھی اور پہلی تحریر محترم ابن صفی کا ناول ڈاکٹر دعا گو تھا۔ اسے پڑھنے کی ترغیب میرے والد صاحب نے ہی دی تھی۔ مجھے یاد ہے اس وقت میری امی جان نے اعتراض بھی کیا تھا اور ابا سے کہا تھا تم ابھی سے بچے کا ذہن خراب کر رہے ہو۔ پہلے اسے نصابی کتابیں تو پڑھنے دو اگر اسے کہانیوں کی لت پڑ گئی تو پھر یہ پڑھنے لکھنے سے رہا۔ تب ابا نے کہا تھا میں نے سوچ سمجھ کر یہ رسالہ اسے دیا ہے۔ اس میں شائع ہونے والی تحریریں نہ صرف اس کی کردار سازی کریں گی بلکہ اسے تعلیم کی جانب بھی راغب کریں گی۔ بس وہ دن اور آج کا دن۔ نئے افق میری زندگی کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ جب ابا کی ایما پر میں نے نئے افق میں عمران سیریز پڑھنا شروع کی اور اس کا عادی ہو گیا تو اچانک انہوں نے نئے افق گھر پر لانا بند کر دیا۔ اب مجھے بے چینی ہونے لگی ایک تشنگی کا احساس ستانے لگا جیسے زندگی میں کسی شے کی کمی ہو گئی ہو۔ میں نے ابا سے احتجاج کیا تو انہوں نے فریئر مارکیٹ میں واقع کے ایم سی کی لائبریری کا پتا دیا کہ وہاں جا کر پڑھ لو۔ یوں پہلی بار میرا تعارف لائبریری سے ہوا۔ جب میں پہلی بار لائبریری گیا تو کتابوں کا ذخیرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ دو گھنٹے بعد نئے افق میرے ہاتھ لگا اس دوران میں دیگر رسائل و جرائد دیکھتا اور پڑھتا رہا۔ یوں میرا رشتہ لائبریری سے قائم ہو گیا۔ اب آتے ہیں اکتوبر کے نئے افق کی طرف۔ گفتگو میں آپ نے جس دردمندانہ انداز میں کراچی اور ملک کے حالات کی منظر کشی کی ہے وہ بالکل درست ہے اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو یہ حالات ہمیں اچانک رونما ہوتے عجیب نہیں لگیں گے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال قبل ہی اس کی پیشن گوئی کر دی تھی۔ آپ نے بالکل درست لکھا کہ

دجال اور یاجوج ماجوج کا خروج ہو چکا ہے ہم اس فتنہ کا شکار ہو چکے ہیں۔ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں کہا تھا کہ اشیاء خورد ونوش کے تمام ذخائر دجال کے پاس ہوں گے وہ جسے چاہے زندگی دے یا بھوکا مار دے۔ آپ دیکھ لیں ہم سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کشکول اٹھائے آئی ایم ایف کے سامنے کھڑے ہیں۔ وہ چاہے تو بیک جنبش ابرو ہماری معیشت کو تباہ کر سکتا ہے۔ اللہ ہم سب کو عقل سلیم دے اور آپ کے اشاروں اور تجزیوں کو سمجھنے کی توفیق دے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے امجد جاوید کا سلسلے وار ناول ''قلندر ذات'' کا مطالعہ کیا، کہانی بڑے احسن انداز میں آگے بڑھ رہی ہے اگر اسے نئے افق کے ماتھے کا جھومر کہا جائے تو بے جا نہیں ہوگا۔ واقعات کی تیزی اور سسپنس اس کہانی کا خاصہ ہے۔ اتنی خوب صورت کہانی پر آپ کو اور امجد جاوید کو مبارک باد۔ امید ہے وہ اس کہانی کا ٹیمپو برقرار رکھیں گے۔ ایک شکایت ہے مجھے خورشید پیر زادہ سے میں نے اس سے قبل بھی ان کی کچھ تحریریں نئے افق میں پڑھی تھیں۔ ان کا معیار بہتر تھا اور انداز تحریر بھی خوب صورت تھا مگر ''درندہ'' جیسا ناول لکھ کر انہوں نے اپنے نام پر بٹہ لگا لیا ہے لگتا ہی نہیں کہ یہ تحریر خورشید پیر زادہ کی ہے۔ نہ تو اس کہانی میں کوئی تسلسل ہے نہ کوئی سر پیر اس کہانی پر یہ مثال صادق آتی ہے ''کہیں کی مٹی کہیں روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا'' عمران صاحب آپ سے بھی شکوہ ہے کہ آپ نے ایسا ناول کیسے قبول کیا؟ یہ بالکل نئے افق کی روایت کے مطابق نہیں۔ آپ اسے جتنا جلد ختم کر دیں تو بہتر ہے۔ معروف مصنف شمیم نوید کی تاریخی اور سچی کہانی ''جگت سنگھ'' بہت خوب جا رہی ہے۔ جگت سنگھ عرف جگا ہمارا لوک ہیرو ہے اسے پڑھ کر نئی نسل کو ہمارے خطے میں انگریز سامراج کے خلاف ہمارے اجداد کی جدوجہد سے آگاہی حاصل ہوگی۔ نیا سلسلے وار ناول ''آتش زیر پا'' کی اٹھان بتا رہی ہے کہ یہ بہت جلد قارئین کو اپنی گرفت میں لے لے گا۔ محمد یعقوب بھٹی اس سے پہلے بھی بہت اچھے اچھے ناول لکھ چکے ہیں۔ یقیناً وہ ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔ آپ نے انگریزی تراجم بہت کم کر دیے ہیں۔ اس کے صفحات میں اضافہ کریں۔ سچی کہانیوں کا وہ معیار نہیں رہا۔ چونکہ آپ نئے لکھنے والوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ قابل برداشت ہیں۔ آخر میں ایک درخواست کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ ایک ماہ ابن صفی کی جاسوسی دنیا کا ناول اور ایک ماہ عمران سیریز کا ناول شائع کریں یقین جانیں ابن صفی کی تحریروں کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔

ریاض بٹ ...... حسن ابدال۔ ماہ اکتوبر کا شمارہ اس بار کافی لیٹ یعنی 28 تاریخ کو ملا۔ خیر شکر کیا کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ سرورق حسب معمول منفرد اور دلکش تھا۔ اس کے بعد مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پڑھی۔ واقعی ہم نہ گھر کے رہے ہیں اور نہ گھاٹ کے۔ ملک کے حالات لوگوں کو خودکشیوں پر مجبور کر رہے ہیں اور ارباب اختیار صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا کر رہے ہیں۔ اس کے بعد بوجھل قدموں اور دکھی دل کے ساتھ قدم رکھا اپنی محفل میں یہاں عمران بھائی کراچی کے حالت پر سیر حاصل بحث کر رہے تھے۔ بھائی کس کس بات کا رونا روئیں۔ جب

تک ہم خود ٹھیک نہیں ہوں گے حالات اسی طرح رہیں گے۔ جب ہم پولیس کے ساتھ خود ہی مک مکا کی بات کریں گے تو......؟ سب سے پہلا خط بہن این شاہین کا ہے ارے بہن خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ آپ بالکل ہمارے پڑوس میں آ گئیں۔ بلکہ میں تو حسن ابدال اور واہ کینٹ کو ایک ہی سمجھتا ہوں۔ یہاں یعنی واہ کینٹ میں حبیب لائبریری ہے یہاں رسالہ بہت جلدی آ جاتا ہے۔ آپ کی باتیں اور خیالات موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ امید ہے آئندہ آپ کہانیوں اور باقی رسالے پر تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ شجاع جعفری بھائی کیسے ہو؟ میری کہانیاں آپ کو پسند آتی ہیں یہ آپ کے اعلیٰ ذوق کی غمازی ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ بہن طاہرہ جبیں تارہ ہمیں آپ کی غیر حاضری بہت محسوس ہوتی ہے۔ واقعی صنف نازک ہی سے کائنات میں رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ امین مراد انصاری صاحب خوش آمدید۔ اتنی لمبی غیر حاضری تو اچھی نہیں ہوتی۔ عمر فاروق ارشد اس بار تو آپ کے لیے شاید خوشی کا سامان ہو گیا۔ بتایئے کیسے؟ باقی رہی تبصرے کی بات تو بھائی ہر ماہ گفتگو میں شامل ہونا ہوتا ہے اور کبھی کبھی کہانیاں مصروفیت کی وجہ سے نہیں پڑھ سکتا۔ اس لیے ان پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ تواتر سے کہانیاں شائع ہونے کے متعلق ریاض حسین قمر صاحب اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ تو آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ بہرحال خوش بوئے سخن میں آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ پسند آئی آئندہ بھی لکھتے رہیے گا۔ ریاض حسین قمر بھائی اور جاوید احمد صدیقی بھائی میری کہانی اور تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ دل کی آنکھوں سے کہانیاں پڑھتے ہیں۔ اس لیے اتنا خوب صورت اور موثر تبصرہ لکھتے ہیں، بہت خوب۔ محمد اسلم جاوید آپ کا بھی شکریہ۔ کہ آپ کو میری کہانی پسند آئی فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب آپ کیسے ہیں؟ ویسے میں تو ہر وقت دعائیں ہی کرتا رہتا ہوں کہ خدا بزرگ و برتر آپ کو صحت کامل عطا فرمائے اور سدا خوش وخرم رہیں۔ ہم بوڑھے اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔ آپ تو محفل کی جان ہیں۔ میری کہانی ''انتقام'' پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ہم بابا لوگ تو لکھنے کا کام چھوڑ ہی نہیں سکتے۔ میں جب تک ہر ماہ ایک کہانی لکھ نہ لوں چین نہیں آتا۔ اب بڑھتے ہیں کہانیوں کی طرف نئے سلسلے وار ناول آتش زیر پا کی اٹھان بتا رہی ہے کہ یہ آگے چل کر ایک تیز رفتار کہانی ثابت ہوگی۔ مغرب سے انتخاب دونوں کہانیاں ہم رکاب (عبدالسمیع) اور سہاگن (راحیلہ تاج) پسند آئیں۔ ''درندہ'' بہت اچھی جا رہی ہے اسے چلنے دیں، مہربانی ہوگی۔ سچ بیانیاں سب اپنی مثال آپ ہیں۔ شہنی ارشاد کی عاشق زاد بہت اچھی اور ہمارے لیے عبرت کا سامان لیے ہوئے ہے۔ واقعی ہم اسلام سے دوری کی وجہ سے طرح طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔ باری تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین اور بہن آپ ایسی کہانیاں لکھتی رہیں۔ انجم فاروق ساحلی اس بار ''سنگ دل'' لے کر آئے۔ لالچ بری بلا ہے۔ یہ بہن کو بہن سے قتل کروا دیتی ہے اور آخر کار بھیانک انجام سے دوچار کرتی ہے۔ جذبہ جنون (حنیف قادری) اور سوفٹ ویئر (آشبہ مخدوم) بھی اچھی کہانیاں ہیں۔ عمران بھائی آپ کے انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس بار

کتر نیں کافی ہیں شکر ہے اس بار آپ نے اس طرف بھی توجہ فرمائی۔ ذوق آ گہی اور خوشبوئخن کا انتخاب بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اب اجازت، یار زندہ صحبت باقی۔

محمد اسلم جاوید ...... فیصل آباد۔ بڑی آرزو تھی ملاقات کی پھولوں کی طرح ہمیشہ مسکراتے رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ بک اسٹال پر ماہ اکتوبر کا تازہ شمارہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ ایسا خوب صورت اور جاذب نظر انمول تحریروں سے چمکتا ہوا پرچہ نکالنے پر میری طرف سے دلی مبارک قبول فرمائیں۔ سرورق بہت ہی حسین رنگوں سے مزین تھا۔ آپ کی محبت اور خلوص ہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں خط تحریر کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں خط کے ذریعے آپ سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ خط اور غزل شائع کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ تمام عنوان اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں آپ کی زندگی میں سدا رنگ برنگے پھول کھلتے رہیں۔ خدا آپ کو اپنی امان میں رکھے۔ زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔

عمر فاروق ...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ کیسے مزاج ہیں سب ساتھیوں کے امید ہے کہ بخیریت ہوں گے۔ اکتوبر کے شمارے نے ایک ماہ قبل ایڈوانس ہی عید الاضحی کی مبارک باد داغ دی۔ ٹائٹل بھی تقریباً عید کی مناسبت سے تھا۔ موتیوں سے مزین خیمہ پسند آیا۔ خطوط کی محفل ہمیشہ کی طرح مہک رہی تھی۔ تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ کراچی سے ایک صاحب سب ساتھیوں کے ساتھ رابطے کے خواہش مند تھے اور موبائل نمبرز مانگ رہے تھے۔ بھائی جو رابطہ نئے افق کے توسط سے ہے یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔ ریاض بٹ صاحب اللہ آپ کو مہروں کی تکلیف سے نجات دے، آمین۔ باقی میں اپنی بات پر قائم ہوں کہ آپ کو کہانیوں میں کچھ وقفہ لانا چاہیے کیونکہ آپ اکثر و بیشتر دوسرے رسائل میں بھی براجمان ہوتے ہیں۔ ریاض حسین قمر بھائی کا تبصرہ عمدہ تھا۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ اس کے علاوہ بھائیوں اور بہنوں کے خط زبردست تھے دعا و سلام قبول کریں۔ طاہرہ جبیں نے اچھی بات کی طرف توجہ دلائی۔ خورشید پیر زادہ صاحب آپ پتا نہیں کیسے پیر زادہ ہیں میری سمجھ سے باہر ہے۔ درندہ نامی ناول میں عورت کے روپ کو اس قدر بگاڑ کر پیش کرنے کا حق آپ کو کس نے دیا؟ میں اور آپ بھی کسی عورت کے وجود سے ہیں۔ کہانی لکھتے وقت یہ ذہن میں رکھا کریں کہ اگر اسے ہماری ماں بہن پڑھے تو کیسا لگے گا۔ فحاشی و عریانی کا گند پھیلا کر نجانے آپ اپنے کون سے جذبات محروم کی تسکین کر رہے ہیں یا کسی احساس کمتری کا غصہ اتار رہے ہیں۔ ناول میں جو بے حیائی بیان کی جارہی ہے وہ آپ کی ذہنیت کی بخوبی عکاسی کرتی ہے۔ بہرحال عمران بھائی آپ کو بھی اس طرح کے ناول شامل کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ اس بار کہانیاں ٹھیک ہی تھیں۔ نیا ناول تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ وہی

روایتی لٹھ مار انداز ہے۔ کوئی بات نہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ مختصر تحریریں بہترین تھیں۔ خصوصاً مغرب سے جو انتخاب ہوتا ہے وہ دل کو بھا جاتا ہے۔ بہن شہنی ارشاد موجود تھیں۔ دل کو اچھا لگا۔ بہنا میری کوئی بہن نہیں ہے شاید اسی لیے تمہارے بارے میں پاکیزہ جذبات رکھتا ہوں۔ کبھی اچھا نہ لگے تو بتا دینا۔ دیگر کہانیوں میں انجم فاروق کی سنگ دل زیادہ خاص نہیں تھی۔ کہانی میں بے جا حیرت ناکی اور خوفناکی پیدا کرنے کے چکر میں وہ لائن سے اتر گئے اور انجام بھی جلد بازی میں کر دیا۔ میرے مطابق کہانی کا اختتام ایسا ہونا چاہیے کہ قاری کم از کم دس منٹ تک دوسری کہانی شروع نہ کر سکے اور سوچ و بچار کے سمندر میں ڈبکیاں لیتا رہے۔ اس کے علاوہ کہانی میں تجسس اور سسپنس اس حد تک ہو کہ قاری کو مصنوعی نہ لگے۔ جبکہ ہمارے رائٹر اس کے الٹ چل رہے ہیں۔ اب رہ گئی میری فیورٹ کہانی ''قلندر ذات'' تو جناب ہمیشہ کی طرح اس بار بھی یہی ٹاپ پر تھی۔ لکھاری بہت بہترین انداز میں تصویر کے دونوں رخ ہمیں دکھاتے جارہے ہیں۔ امید ہے کہ آنے والے دنوں میں مزید نکھر کر سامنے آئے گی۔ اب آتا ہوں غزلوں کی طرف آپ نے ہماری غزل شامل کر کے بڑے پن کا ثبوت دیا ہے۔ ریاض قمر صاحب نے اچھے موضوع پر غزل ڈھالی۔ باقی سب شاعر وہی عشق و محبت کی راگنی الاپ رہے تھے۔ دراصل ہمارے شاعروں کو ہدایت کے چشمے سے دو گھونٹ پینے کی ضرورت ہے۔ ریحانہ سعیدہ سب ابن آدم ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس لیے یک طرفہ کی بجائے انصاف سے کام لیا ہوتا تو غزل خوب صورت تھی۔ آپ کیوں آدم کے ان جانباز بیٹوں کو بھول گئیں جو محاذوں پر اپنی بہنوں کی عزتوں کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ کشمیر، افغانستان اور فلسطین میں ماؤں بہنوں پر قربان ہو رہے ہیں۔ اللہ آپ کو عقل کامل عطا فرمائے۔ شمارے کو مجموعی طور پر اچھا کہہ سکتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور ہم سب کو صراط مستقیم پر رکھتے ہوئے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

مراد انصاری ...... نیو کراچی۔ السلام علیکم اور آپ سب کو عید مبارک۔ اکتوبر 2013ء کا شمارہ نئے افق عید الاضحی نمبر 3 اکتوبر کو ملا۔ اس شمارے میں آپ نے میرے خط کو انتہائی بے دردی سے کاٹ پیٹ کر شائع کیا جس کی بنا پر تبصرے کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔ چلیے کوئی بات نہیں۔ عمران بھائی آپ نے کالم گفتگو کے آغاز میں کراچی کے حالات اور واقعات پر جو کچھ بھی کہا ہے یقین جانیے آپ کی تحریر پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا ہے۔ سچ کہا ہے آپ نے کہ ہمارا کراچی اب بھی لہولہان ہے اب بھی روزانہ دس پندرہ جنازے اٹھ رہے ہیں۔ بچے یتیم اور سہاگنیں بیوہ ہو رہی ہیں۔ آپ نے کراچی کے مظلوم عوام کے حق میں لکھ کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ لیکن شرم حکمرانوں کو نہیں آتی۔ کالم دستک میں محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے بھی بڑے اچھے انداز میں حکمرانوں کو آئینہ دکھایا ہے اسلام کا نام لے کر حکومت کرنے والوں کو غیرت آجانی چاہیے۔ باقی باتیں ان شاء اللہ مطالعہ کے بعد ہوں گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے قلم میں

مزید طاقت پیدا کرے۔ نئے افق کے تمام دوستوں کو عید مبارک۔

ریاض حسین قمر ...... منگلا ڈیم۔ لائق صد احترام جناب عمران احمد صاحب مع پر خلوص اور محنتی عملہ کے سلام شوق۔ امید واثق ہے کہ آپ سب حضرات باخیریت ہوں گے۔ خدائے لم یزل آپ سب کو اپنے حفظ وامان میں رکھے آمین۔ اکتوبر کا نئے افق پراسرار ٹائٹل کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ محترم ومکرم جناب مشتاق احمد قریشی صاحب نے جس خوب صورت انداز میں ملکی حالت کا پوسٹ مارٹم کیا ہے یہ ان ہی کا کام ہے۔ خداوند قدوس انہیں سچ بولنے پر اسی طرح استقامت بخشے آمین۔ ملکی حالات نے واقعی عوام کو خودکشی پر مجبور کردیا ہے۔ کچھ مہنگائی اور بے روزگاری ہے اور کچھ ہماری سماجی اور معاشرتی مجبوریوں کی وجہ ہے۔ گزشتہ ماہ پانچ بہنوں نے نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی جن میں سے چار اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ نجی ٹی وی کے مطابق ان کی شادی نہیں ہورہی تھی اس بات پر ان کا جھگڑا والدین سے ہوتا رہتا تھا وہ شاکی تھیں کہ ان کا باپ کوئی رشتہ قبول نہیں کرتا۔ ان معصوموں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا باپ رشتہ نہیں ٹھکراتا بلکہ اس متعفن معاشرے کے غلیظ لوگ جہیز نہ ملنے کی وجہ سے ان کو ٹھکرا کر چلے جاتے ہیں یہ بات بچیوں کو بتانے والی تو نہیں۔ ہم عجیب لوگ ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا آقا تو مانتے ہیں مگر ان کی سب سے چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو ملنے والے جہیز کو نہیں مانتے۔ ہمارے ہاں دولت کی کمی نہیں ہے مگر اس کی تقسیم نہایت ہی غیر منصفانہ ہے۔ ایک طرف ان گنت دولت ہے تو دوسری طرف فاقے ہی فاقے ہیں۔ گفتگو کے شروع میں آپ نے بہت پیاری حدیث بیان فرمائی ہے اور دجالی قوتوں کے کرتوتوں سے خوب پردہ اٹھایا ہے۔ خداوند کریم ہم سب مسلمانوں کو ان کے مکروفریب سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ کرسی صدارت پر اس بار این شاہین صاحبہ متمکن ہوئیں اور بھرپور تبصرہ کرکے اپنے آپ کو کرسی صدارت کا اہل ثابت کردیا۔ اللہ کریم تحریر میں مزید نکھار پیدا فرمائے، آمین۔ طاہرہ جبیں تارا صاحبہ مختصر تبصرے کے ساتھ تشریف لائیں انہیں یہ گلہ تھا کہ گفتگو میں گزشتہ ماہ صنف نازک کو جگہ نہیں دی گئی۔ انہوں نے عمران صاحب سے ناانصافی کا گلہ کیا ہے۔ محترمہ طاہرہ صاحبہ عمران بھائی ناانصافی کر ہی نہیں سکتے۔ اب صنف نازک خط ہی ارسال نہ کرے تو عمران بھائی کہاں سے خط شائع کریں۔ بہرحال صنف نازک سے پرزور اپیل ہے کہ وہ گفتگو میں بھرپور حصہ لیا کریں تاکہ گلے والی بات پیدا نہ ہو۔ جناب امین مراد انصاری صاحب پہلی بار تشریف لائے ہیں جی آیا نو۔ مگر خط مختصر ترین تھا۔ محترم کھل کر لکھا کریں اور گفتگو میں حاضری کو فرض اولین سمجھیں۔ عمر فاروق صاحب بھی اچھے تبصرے کے ساتھ شریک گفتگو ہوئے۔ پیارے گزری باتوں کو قصۂ پارینہ سمجھیں اور تلخیوں کو بھول جائیں۔ آئندہ انشاء اللہ پیار محبت کی باتیں ہوں گی۔ محترم شجاع جعفری صاحب غزل پسند فرمانے پر اور اتنے اچھے طریقے سے داد دینے پر آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ خدا آپ کو شادوآباد رکھے۔ محترم ریاض بٹ صاحب کا تبصرہ اور خط خوب رہا۔ بھائی ریاض بٹ صاحب اچھی

چیز کو اچھا کہنا ہمارا فرض اولین ہے۔ جناب اسلم جاوید صاحب مختصر سے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے شکر ہے تشریف تو لائے۔ بھائی ہم شاعروں میں یہ خامی ہے کہ ہم نظم پاروں پر تبصرہ کرنا کسر شان سمجھتے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب حسب سابق اور حسب روایت جامع اور بھرپور تبصرے کے ساتھ تشریف لائے پیارے بھائی آپ نے ہماری بات مان کر مختصر نویسی چھوڑ دی بہت بہت شکریہ۔ آپ نے میری غزل کو نمبر 1 قرار دیا یہ آپ کا حسن ذوق ہے۔ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بہت ہی محترم فقیر محمد بخش صابر لنگاہ صاحب تشریف لائے محفل کی رونق دوبالا ہوگئی خداوند کریم انہیں ہر طرح سے فٹ رکھے اور وہ محفل میں اسی طرح رونق افروز ہوتے رہیں۔ باقی تمام سلسلے اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔ خوشبوئے سخن میں ایک سے بڑھ کر ایک غزل ہمارے ذوق کو تسکین بخش رہی ہے۔ نیک تمناؤں کے ساتھ اللہ حافظ۔

شجاع جعفری ...... اکوال۔ السلام علیکم امید ہے کہ آپ اور آپ کا تمام اسٹاف اور قارئین خیر وعافیت سے ہوں گے۔ ارشاد ربانی ہے کہ ”اور زنا کے قریب بھی نہ جاؤ یقیناً یہ بہت برا فعل ہے۔“ آج ہر روز کوئی نہ کوئی لڑکی یا بچہ زیادتی کا شکار ہوتا ہے اس کی اصل وجہ قرآنی تعلیمات کی کمی اور نماز سے دوری ہے۔ دوسری بڑی وجہ انڈین اور فحش فلمیں ہیں۔ حقیقت میں ہمارا ایمان بہت کمزور ہوگیا ہے۔ دوسرا سانحہ پشاور۔ مذہب اسلام سے تعلق رکھنے والا کبھی ایسا کام نہیں کرسکتا۔ اسلام امن کا پیغام دیتا ہے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق عبادت گاہوں کا احترام واجب ہے چاہے غیر مذہب ہی کی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس ارض پاک کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ دشمنان اسلام اور پاکستان کو نیست ونابود فرمائے، آمین۔ نئے افق کا ٹائٹل اچھا تھا۔ اقرأ پڑھ کر ایمان تازہ اور مضبوط ہوا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خوش بوئے سخن میں تمام کلام اچھا تھا۔ نیک تمناؤں کے ساتھ خدا حافظ۔

حسن اختر پریم ...... کاغان۔ محترم عمران احمد تسلیمات وآداب اکتوبر کا نئے افق میں نے کراچی سے کاغان سفر کے دوران پڑھا۔ یقین جانیں نئے افق کا مطالعہ کرتے ہوئے سفر کی طوالت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ بس ایسا لگا جیسے میں خوابوں کی وادی میں بادلوں کے ساتھ تیر رہا ہوں۔ خاص طور پر امجد جاوید کا ناول قلندر ذات، شمیم نوید کا جگت سنگھ اور یعقوب بھٹی کا آتش زیرپا نے تو مجھے اپنے سحر میں جکڑ سا لیا تھا۔ قلندر ذات پڑھتے ہوئے میں خود کو کبھی مشرقی پنجاب کے شہروں میں گھومتا محسوس کرتا تو جگت سنگھ پڑھتے ہوئے لائل پور (فیصل آباد) کے دیہات میں سرسبز کھیتوں کے درمیان بنی پگڈنڈیوں میں گھوڑی پر سوار مٹرگشت کرتا۔ اس دوران کھیتوں سے اٹھتی سرسوں کے ساگ کی خوشبو مجھے بے خود کیے رکھتی۔ یعقوب بھٹی کا قلم مجھے قبائلی علاقے کے سنگلاخ پہاڑوں کی سیر کرارہا تھا۔ بس سفر کے دوران ایک عجیب سا عالم تھا۔ اب نومبر کے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔ سچی کہانیوں میں شہنی ارشاد کی عاشق زاد بہت اچھی لگی۔ شہنی کی تحریروں میں اب

خاصی پختگی آ گئی ہے۔ وہ بہت اچھی اور معیاری کہانیاں تلاش کر کے لاتی ہیں۔ سنگ دل میں انجم فاروق ساحلی بہت تھکے تھکے سے لگے۔ بھائی انجم آپ تو اب بہت سینئر لکھاری بن چکے ہیں پھر ایسی ہلکی تحریریں کیوں؟ خیال رکھیں اس سے نہ صرف آپ کی شہرت متاثر ہوگی بلکہ آپ کے قارئین کو بھی مایوس ہوگی فہرست میں ریاض بٹ صاحب کا نام نہ دیکھ کر مایوس ہوئی۔ ان کی تحریروں کی سادگی، چھوٹے چھوٹے جملے اور ہمارے دیہات کی منظر کشی دل کو بہت بھاتی ہے۔ مغربی ادب سے صرف دو ہی کہانیاں تھیں لیکن دونوں ہی بہت خوب تھیں۔ تراجم کی تعداد اگر بڑھا دی جائے تو پرچے پر اچھا اثر پڑے گا۔ کیونکہ تراجم پڑھنے والوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے، اس ماہ کورٹ کہانی بھی غائب تھی کیا آپ کے کورٹ رپورٹر صاحب چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ خوشبوئے سخن میں ریحانہ سعیدہ کی نظم جنت حوا بڑی تاثر انگیز تھی۔ سمیع جمال کراچی، ریاض حسین قمر منگلا کی غزلیں بہت خوب صورت تھیں۔ ذوق آگہی میں سید عاقب علی کا انتخاب سب سے زیادہ پسند آیا۔ ریاض بٹ حسن ابدال اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی راولپنڈی کا انتخاب بھی بہت خوب تھا۔ اللہ تعالیٰ نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے اور پرچے کے تمام قارئین لکھاریوں اور عملہ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

سعدیہ خان ...... لطیف آباد، حیدر آباد۔ محترم ایڈیٹر نئے افق اور تمام اسٹاف کو السلام علیکم۔ شاید میں آپ لوگوں کو یاد نہ ہوں میں کبھی ڈیفنس کراچی کے ایڈریس سے خط لکھا کرتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی کبھار۔۔۔۔ اس وقت گفتگو کی محفل بڑی گرما گرم ہوا کرتی تھی سب کی نوک جھوک ہوا کرتی تھی مگر وہ تمام پرانے قاری نظر نہیں آتے۔ خواتین تو عالیہ انعام الٰہی کو چھوڑ کر گویا تمام کی تمام میری طرح یا تو گھر بسا کر گھر داری میں مصروف ہوگئی ہیں یا پھر نوکریوں وغیرہ میں۔ کوئی خیریت کی رسید بھی نہیں بھیجتا۔ ویسے اب پرچے کا معیار بھی ویسا نہیں رہا۔ اس وقت ابن صفی صاحب کے ناول نئے افق نیا رخ کا سنگھار ہوا کرتے تھے۔ اب درندہ جیسی جنسی کہانیاں شائع ہوتی ہیں سچی کہانیوں کا معیار بھی بس ایویں ہی ہے۔ آپ کو آپ کی عدالت اور میزان جیسے سلسلے دوبارہ شروع کرنا چاہیے۔ اکتوبر کے شمارے میں جگت سنگھ، قلندر ذات اور آتش زیر پا پسند آئیں مغرب سے انتخاب دونوں کہانیاں لاجواب تھیں۔ عاشق زاد گزارے لائق تھی۔ امید ہے میری تنقید آپ کو بری نہیں لگی ہوگی۔ بہترین خط پر انعام کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے اور گفتگو کے صفحات میں بھی اضافہ کیا جائے۔

اقراء

ترتیب: طاہر قریشی

مومن کی شانِ صبر و شکر

ترجمہ:۔ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''مومن بندے کا معاملہ بھی عجیب ہے ہر معاملے اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔'' (رواۃ مسلم)

اس دنیا میں دکھ اور رنج بھی ہے اور آرام و خوشی بھی، مٹھاس بھی اور تلخی بھی، خوشگواری بھی ہے اور ناخوشگواری بھی، مومن کا ایمان ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اسی کے حکم اور فیصلے سے ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا یہ حال ہونا چاہیے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آئے تو مایوسی کا شکار ہونے یا غلط طریقے سے اظہار غم کرنے کے بجائے صبر سے کام لیں اور اس یقین کو دل میں تازہ رکھیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور وہی دکھوں سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب مومن خوشی و شادمانی کے دور سے گزر رہا ہو تو اسے اپنا کمال اور اپنی قوتِ بازو کا نتیجہ نہ سمجھے بلکہ یہ ذہن میں رکھے کہ یہ اللہ کا فضل و کرم ہے وہ کسی بھی وقت نعمت چھین بھی سکتا ہے اس لیے نعمت ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

ان اسلامی ہدایات کا منطقی نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلتا ہے کہ خوشی کی حالت میں بھی بندہ اللہ تعالیٰ سے وابستہ رہتا ہے اور دوسری طرف مصیبتوں اور ناکامیوں سے شکست نہیں کھاتا، مایوسی اور دل شکستگی سے اس کی عملی قوتوں پر برا اثر نہیں پڑتا۔

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اے ابن آدم! اگر تو نے ابتدا ہی سے صدمہ برداشت کیا اور میری رضا اور مجھ سے ثواب کی نیت کی تو میں راضی نہیں ہوں گا کہ جنت سے کم اور اس کے سوا کوئی ثواب تجھے دیا جائے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”جو بندہ کسی جانی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہوا اور وہ کسی سے اس کا اظہار نہ کرے اور نہ لوگوں سے شکایت کرے تو اللہ کا ذمہ ہے کہ وہ اسے بخش دے گا۔“

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم نزع کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ ”یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ بھی روتے ہیں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”اے ابن عوف! یہ رحمت کے آنسو ہیں۔“ اس کے بعد پھر آنسو جاری ہوگئے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”آنکھیں آنسو بہاتی ہیں، دل غمگین ہے اور ہم زبان سے کوئی بات نہیں کہتے مگر جس سے ہمارا رب راضی ہو۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”وہ شخص ہم میں سے نہیں جو رخساروں کو پیٹے، گریبان پھاڑے اور زمانۂ جاہلیت کی طرح پکار پکار کر روئے۔“

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ صدمہ اور غم ملنے پر صبر کرے۔ زبان پر شکوہ نہ لائے۔ فطرت انسانی میں جذبۂ رحم کی بنا پر آنسو نکل آئیں، یہ صبر کے منافی نہیں لیکن غم کی حالت میں اظہار غم کے ایسے طریقے جو مومن کو شرعی حدود سے باہر لے جائیں کسی بھی طرح جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صدمہ اور مصیبت سے، غم اور رنج سے محفوظ فرمائے اور اگر اس کی مشیت سے یہ غم و رنج پہنچ بھی جائیں تو ہمیں صبر و شکر پر ثابت قدم رکھ کر شرعی حدود سے تجاوز کرنے سے محفوظ فرمائے۔ (آمین)

بشکریہ: ”درس حدیث“ مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفیؒ
نائب مہتمم و استاد الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

قسط نمبر 2

آتش زیرپا

یعقوب بھٹی

وہ ظلم کی گرد سے اٹھنے والا ایک طوفان تھا، جس نے ظلم کا پنجہ مروڑ دیا، جس کے سبب وہ قانون کا بھی مجرم ٹھہرا۔

حالات کی بے رحم کروٹ اسے جرم و گناہ کی سفاک دنیا میں دھکیل کر لے گئی، اس کے سینے میں آتش فشاں دہکتے تھے اور پیروں میں انگارے سلگتے تھے جس کے سبب اسے ایک پل کو چین نہ تھا۔ مجرم اس کی سفاکی سے لرزتے تھے جرم کے بڑے بڑے چراغ اس نے چٹکی میں بجھادیئے تھے۔ قانون کے لمبے ہاتھ اس نے قانون کی ہی گردن میں باندھ دیئے تھے اس کا نام بڑے بڑوں کا پتا پانی کردیتا تھا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا اس سفاک شخص کے سینے میں ایک نرم و گداز دل دھڑکتا ہے، ایک نازک سی لڑکی اس کی کل کائنات ہے۔

پھر ایک دشمن جاں نے شب خون مارا اور اس کی کائنات اجاڑ دی۔

اس کی وحشت دو چند ہوگئی، وہ آتش زیرپا قاتل کی تلاش میں قریہ قریہ بھٹک رہا تھا۔

پھر ایک جوہر شناس نے اس کی وحشت کو لگام دے کر مثبت سمت میں موڑ دیا۔

سطر سطر ہنگامے، لفظ لفظ تجسس، نئے افق کی نئی سنسنی خیز سلسلے وار کہانی

کچھ ہی دیر میں وہ، چاچا رمضیٰ سے گھل مل چکی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی پانی کے جیسی جس برتن میں جاتی اسی کی صورت میں ڈھل جاتی تھی۔

وہ چاچا رمضیٰ اور میرے سارے قصبے سے غائبانہ طور پر پہلے ہی واقف تھی۔ چاچا رمضیٰ کی دوسری شادی نامی دکھتی رگ سے بھی واقف تھی۔ اس نے فوراً چھیڑ چھاڑ شروع کردی۔ چاچا رمضیٰ کو بھی ایک چلبلی، شہری لڑکی کی چھیڑ چھاڑ مزہ دے رہی تھی۔ وہ چاچا رمضیٰ کے ساتھ اگلی سیٹ پر تھی۔ جگہ تو وہاں میری بھی بنتی تھی مگر گاؤں کے ماحول کے سبب میں عقبی نشست پر براجمان تھا۔ رخ میں نے ممکن حد تک ان دونوں کی طرف گھمالیا تھا۔

میرا پسندیدہ ٹریک شروع ہوگیا تھا۔ ایک طرف نہر، کچے راستے کے ساتھ چلتا پانی کا کھالا اور دوسری طرف میجر صاحب کے باغات کا وسیع سلسلہ۔

کینوؤں کا موسم ابھی باقی تھا۔ فضا میں اعلیٰ نسل کے کینوؤں کی خوشبو رچی بسی تھی۔

کائنات نے بھی یہ جاں افزا خوشبو محسوس کرلی تھی۔ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”جانتے ہو اس پل میری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“

میں نے ان ستارہ آنکھوں میں خمار اترتے دیکھ لیا تھا۔ ”کیا......؟“ اس خمار کے سبب میرا لہجہ بھی بھاری ہوگیا تھا۔

”تمہارے شانے پر سر رکھ کر آنکھیں موند لوں اور یہ راستہ کبھی ختم نہ ہو۔“ اس نے بڑے جذب سے کہا۔ سب کچھ جیسے خمار بھری دھند میں چھپ گیا تھا۔ سامنے تھیں تو صرف دو ستارہ آنکھیں اور ان سے چھلکتا خمار...... شاید میری کیفیت اور ارادے کو اس نے محسوس کرلیا تھا۔ فوراً ہی وہ شوخ ہوئی۔ ”مسٹر! ہم

تانگے میں ہیں اور یہ آپ کا گاؤں ہے گاؤں۔"
دھند پل بھر میں غائب ہوگئی۔ اب چاچا رمضٰی بھی نظر آنے لگا تھا۔ جو انگریزی سے تو نابلد تھا مگر جذبوں کی زبان خوب سمجھتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ جمی تھی۔

"یاد دلانے کا شکریہ! ورنہ کچھ دیر میں پورا گاؤں میری بے حیائی کے چرچوں سے گونج رہا ہوتا۔" وہ جھینپ گئی۔

میں چاچا رمضٰی کی طرف متوجہ ہوا۔ "چاچا! آج کینو کھلا دے تو ہر کینو کے بدلے دو مچھلی کے دانے۔"
اس فیاضی پر چاچا رمضٰی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ "جیوندا رہ پتر!" اس نے پچھلی دفعہ کی مانند کنوؤں سے بھرا لفافہ اور کالا نمک نکال کر مجھے دے دیا۔

میں نے ایک کینو چھیل کر کائنات کو دیا۔
پہلی ڈلی منہ میں ڈالتے ہی اس نے کہا۔ "اتنے خوشبودار، رسیلے اور میٹھے کینو میں نے پہلی دفعہ چکھے ہیں۔"

"یہ ایکسپورٹ کوالٹی ہے۔ ہمارے ملک کے بہت کم لوگوں کے نصیب میں یہ آتے ہیں۔"
اس نے بات کو سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
کچھ دیر بعد ہم دونوں گھر میں تھے۔ نگہت اور ماں، کائنات کی آمد سے پہلے ہی آگاہ تھے۔ ماں نے یقیناً والد صاحب کو بھی بتا دیا تھا۔

گھر میں داخل ہونے سے پہلے کائنات کی ملی جلی سی کیفیت تھی۔ جہاں اشتیاق تھا وہاں قدرے جھجک بھی تھی۔

ماں اور بہن نے کائنات کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ ان دونوں کو کائنات حسب توقع بے حد پسند آئی تھی۔ اس پذیرائی پر کائنات کا چہرہ بھی شفق کی تصویر بن گیا تھا۔ نگہت اور ماں کی خوشی تو سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ خاص طور پر نگہت تو بے حد خوش تھی۔

کھانا کھا کر اور لسی پی کر میں نے مچھلی فارم کا رخ کیا۔ والد صاحب اس دفعہ بھی وہیں تھے۔ کائنات اپنے ساتھ نگہت، ماں اور والد صاحب کے لیے اچھی خاصی چیزیں لائی تھی۔ نگہت اور وہ کمرے میں گھسی ہوئی تھیں۔

والد صاحب مچھلی فارم پر ہی موجود تھے۔ پچھلے دنوں فارم کو پانی سپلائی کرنے والے ٹیوب ویل کا بور بیٹھ گیا تھا۔ اب اسی پر کام ہو رہا تھا۔ ہماری برادری کے دو، تین مسلح لڑکے بھی وہاں موجود تھے۔ بیگھے مل ابھی تو جھاگ کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ مگر ان کا کینہ مشہور تھا۔ اسی لیے احتیاط ضروری تھی۔

مجھے والد صاحب کے چہرے پر خوشی کی چمک پہلے سے نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے بانہوں میں بھر کر پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ "آ...... میرا سوہنا پتر!"
میں بھی ان سے لپٹ گیا۔ ان کا وسیع سینہ میرے لیے آج بھی بستر تھا۔ والد صاحب، مجھ سے بھی اونچے تھے۔ میں نے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"سنا ہے، تیرے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے؟" لہجے میں خفیف سی شرارت تھی۔
"جی...... وہ...... کالج کی ایک دوست ہے۔" ہکلاہٹ خود بخود میرے اندر اتر آئی تھی۔ "اسے گا...... وں...... دیکھنے کا شوق تھا۔"
"اوئے بس!" انہوں نے محبت سے میری کمر پر گھونسہ مارا۔ میں مزید ان سے لپٹ گیا۔
"تو، اس بچی کے حوالے سے سنجیدہ تو ہے نا؟" انہوں نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی۔
انہوں نے زندگی کا گرم و سرد دیکھا تھا۔ نوجوانی کی

لہر سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ اس لیے یہ سوال بہت اہم تھا۔
"جی......" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ والد صاحب کے دوستانہ انداز نے بھی کچھ حوصلہ دیا۔ "اسی لیے تو گھر لایا ہوں۔"
"اوئے، گھوڑی کی طرح عورت کی بھی اگاڑی، پچھاڑی دیکھتے ہیں...... اس کے خاندان کے بارے میں بھی کچھ جانتا ہے؟" انہوں نے مجھے خود سے علیحدہ کیا۔
"پڑھے، لکھے اور شریف خاندان کی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "سندھ کے وڈیرے ہیں۔"
"گاؤں میں گزارا کر لے گی؟"
میں نے ڈاکٹر بن کر گاؤں میں ہی رہنا تھا۔ اس لیے والد صاحب نے پوچھا تھا۔ میرے اور کائنات کے درمیان ایسا کچھ طے نہیں ہوا تھا مگر والد صاحب کے سامنے میں نے بھرم رکھا۔ "جی۔ عورتوں کا علاج کرے گی۔ شادی کے بعد گاؤں ہی میں۔" میرا انداز بے ربط سا تھا۔
والد صاحب خوش ہو گئے۔ "پھر تو چنگی کڑی ہے۔ نصیب والی بھی ہے۔ پہلی دفعہ آئی ہے اور آج ہی مچھلی کا سودا بھی بہت اچھا ہو گیا ہے۔ یہ بیعانہ ہے۔" والد صاحب نے سبز پرانے نوٹوں کی گڈی دکھائی۔
خوشی کی لہر نے مجھے بھی بھگو دیا۔ اب نگہت کی شادی روایتی دھوم دھام سے ہو سکتی تھی۔ ہم باپ، بیٹا ایک دفعہ پھر گلے لگ گئے۔
والد صاحب ٹیوب ویل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں اپنی برادری کے لڑکوں سے جا ملا۔ اس دوران نگہت کا منگیتر صابر بھی وہاں آ گیا۔
بیگھے ملوں کا ذکر چل نکلا۔ سامنے ہی وہ اژدھا نما زہریلے پانی کا پائپ تھا، مگر اب اس اژدھا کا زہر نکالا جا چکا تھا۔
شوکے نامی ایک لڑکے نے بیگھے ملوں کو سلواتیں سناتے ہوئے کہا۔ "اب میجر صاحب نے ڈنڈا دیا ہے تو اپنی اوقات میں آئے ہیں۔ خود کو بڑا پھنے خان سمجھتے تھے۔ اب بڑے میاں، بیٹے کو تو چھڑوا کر دکھائے۔ چنگڑوں کی کڑی کے اغوا میں پکی بات ہے۔ اسے جیل ہو جائے گی۔"
میں نے دلچسپی لی۔ "لڑکی برآمد ہو گئی ہے کیا؟"
"نہیں، بھرا جی! دوسرے لڑکے نے کہا۔ "جب تک پولیس میاں ذوالفقار کو چن کتھا گزاری رات وے والا چھتر نہیں دکھاتی کڑی کہاں برآمد ہوگی۔ اس کے دونوں چاچے کے پتر بھی ابھی نہیں پکڑے گئے۔ پتا نہیں کڑی زندہ بھی ہے یا......" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
میرے حلق میں کڑواہٹ دوڑ گئی۔ میجر صاحب نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے میاں ذوالفقار کو گرفتار تو کروا دیا تھا مگر بیگھے ملوں کے بھی تو تعلقات تھے۔ یقیناً میاں ذوالفقار تھانے میں وی آئی پی کی حیثیت سے رہ رہا تھا۔ کمزور ایف آئی آر کا نتیجہ جلد یا بدیر اس کی رہائی کی صورت میں نکلنا تھا۔
صابر نے کہا۔ "لڑکی نسرین کا منگیتر ہیرا باؤلا سا ہو رہا ہے۔ یا تو وہ بیگھے ملوں میں سے کسی کی جان لے لے گا یا پھر انہی کے ہاتھوں مارا جائے گا۔"
شوکے نے میری پیٹھ تھپکتے ہوئے توصیفی انداز میں کہا۔ "باؤ کمال! تو نے بھی کمال دکھایا ہے۔ چند دنوں میں ہی اس لعنتی فیکٹری کو سرکاری تالے لگوا دیئے۔" اس نے دور نظر آنے والی فیکٹری کی

طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جب فیکٹری کو تالے لگے اور بیگھے ملوں کو جرمانہ بھی بھرنا پڑا تو ان کے چہرے ایسے ہو رہے تھے جیسے......'' اس نے ایک ناقابل بیان جملہ کہا۔ جس کے سبب بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میری ہنسی سب سے بلند اور نمایاں تھی۔

کچھ دیر بعد صابر، میں اور والد صاحب گھر آ گئے۔ صابر کو دیکھتے ہی نگہت کمرے میں کہیں جا چھپی تھی۔ صابر اور والد صاحب بھی کائنات سے مل کر بہت خوش ہوئے۔

رات کا کھانا اکٹھے کھایا گیا۔ اس وقت میں آنے والی گھڑیوں سے قطعی بے خبر تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ آج آخری دفعہ میں نے ماں اور باپ کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ ماں کے ہاتھ کا بنا ساگ آخری دفعہ کھایا ہے۔ یہ پل یہ لمحے آئندہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ ماں کے شفیق ہاتھ آخری دفعہ میرے سامنے مکھن اور شکر رکھ رہے ہیں۔

رات کو میں، کائنات اور نگہت بہت دیر تک جاگ کر باتیں اور ہنسی مذاق کرتے رہے۔ نگہت کو ہم نے صابر کے حوالے سے بہت تنگ کیا۔ اس کی شادی کچھ ہی دنوں کی بات تھی۔ اس کے چہرے پر دوڑتے شفق رنگ بہت بھلے لگ رہے تھے۔

میں نہیں جانتا تھا کہ ایک خوفناک اژدھا ہماری خوشیوں کو نگلنے کے لیے حرکت میں آ چکا ہے۔ بہت جلد بہت جلد میرے شب و روز ایک نئے اور خونی انداز میں بدلنے والے ہیں۔

مستقبل کا ڈاکٹر کمال، حال کا ''کمالا پتر'' بہت جلد ''کمالے جٹ'' کے نام سے معروف ہونے والا ہے۔ جس کا ہر قدم دشمنوں کی گردنوں پر ہوگا۔

ہاں، میں آنے والی گھڑیوں سے بے خبر تھا۔ قطعی بے خبر اور حال میں مست۔

میں اور کائنات واپس لوٹ آئے۔

مجھے پچیس فروری کی وہ شام آج بھی یاد ہے۔ جو بظاہر تو عام شاموں جیسی تھی مگر میرے لیے قیامت لانے والی تھی۔

کچھ دیر پہلے ایک معمولی سی بات پر میری اور جعفر ایرانی کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ بات ہاتھاپائی تک پہنچتے پہنچتے رہ گئی تھی۔

کائنات، مجھے کھینچ کر باہر لے گئی تھی۔

اسی وقت میں نے اپنے کلاس فیلو نادر مگسی کو بڑی تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں بھدا سا موبائل فون تھا۔ ان دنوں میں موبائل فون بہت خاص ہوتے تھے اور سارے کالج میں نادر مگسی واحد طالب علم تھا جس کے پاس موبائل فون تھا۔ جس کی وہ بڑے فخر سے نمائش کرتا تھا۔

نادر مگسی سے میری اچھی بنتی تھی۔ کسی فوری رابطے کی غرض سے میں نے والد صاحب اور صابر کو اسی کا نمبر دے رکھا تھا۔

میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔

نادر مگسی نے فون میری طرف بڑھایا۔ ''تمہارے لیے کال ہے۔'' اس نے مجھ سے نگاہیں چرائیں۔

میں نے موبائل فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے صابر کی ہانپتی ہوئی متوحش آواز ریڈیائی شور کے ساتھ سنائی دی۔

''کمال...... تم فوراً گاؤں آ جاؤ!''

''کیوں؟ کیا ہوا؟'' اندیشے مجھے لرزانے لگے۔

''تو آ جا......'' صابر کی آواز کانپ اٹھی۔ ''چاچا اور میجر صاحب ہمارے درمیان نہیں رہے۔''

مجھے محسوس ہوا جیسے یہ الفاظ نہیں طاقتور بم تھا۔ جس نے میرے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔

صابر مزید کہہ رہا تھا۔ ''بیگھے ملوں نے مچھلی فارم میں زہر ڈال دیا تھا...... اس کے بعد۔''

مزید کچھ سننے کا مجھ میں یارا نہیں تھا۔

ایک سرخ سی دھند تھی جو میرے حواس پر چھانے لگی تھی۔

کھٹ پٹ کی آوازیں مجھے حال میں واپس لے آئیں میں پوری طرح سے چوکنا ہو گیا میرے ہاتھ میں دبا پستول کسی کی بھی جان لینے کیلئے مکمل طور سے تیار تھا۔

سردی کے باوجود میرا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں یوں جل رہی تھیں، جیسے کسی نے ان میں صحرائی ریت بھر دی ہو۔ یادِ ماضی میرے لیے یوں ہی عذاب ناک ہوتا تھا۔

میرے کسی منفی ردعمل سے بچنے کی غرض سے حکم کے غلام نے دبی آواز میں کہا۔ ''یہ میں ہوں۔''

میرے تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ساتھ ہی مجھے احساس ہوا کہ بھوک کا آسیب میرے معدے میں پنجے گاڑ چکا ہے۔ جانے کس وقت سے میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔

لکڑی کے تختے ہٹائے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی تاریکی میں پنسل ٹارچ کی روشنی ننھا سا دائرہ چمک رہا تھا۔ باہر ایک اور سرد رات اتر آئی تھی۔

حکم کے غلام نے پسینے کی بو سے مہکتا ایک گٹھر سا میری طرف پھینکا۔ ''یہ کپڑے پہن لو۔'' پنسل ٹارچ کی مدد سے میں نے وہ ڈھیلا ڈھالا سا قبائلی لباس پہن لیا جس کی لمبائی میرے سائز سے کم تھی۔ مگر کام چل گیا تھا۔

اس لباس کے ساتھ ایک پگڑی بھی تھی جس نے میرا نصف سے زیادہ چہرہ چھپا لیا تھا۔ پسٹل میں نے نیفے میں اڑس لیا تھا۔

چند لمحوں بعد میں حکم کے غلام کے ساتھ کھڑکی سے کود کر اس نیم تاریک کمرے میں تھا جہاں سے ہم لکڑی والے گودام میں داخل ہوئے تھے۔

اندازہ ہوتا تھا کہ مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کیا جا رہا ہے۔ ''کھانے کے لیے کچھ مل سکتا ہے؟'' میں نے قدرے دبی آواز میں کہا۔

''یہ فرمائش اپنے میزبان سے کرنا۔'' حکم کے غلام نے روکھے اور کسی قدر ناراض سے انداز میں کہا۔ میری مدد کرنا یقیناً اس کے لیے ناپسندیدہ فعل تھا۔ مگر میرے کسی نامعلوم مہربان کے حکم سے وہ مجبور تھا۔

مجھے نیم تاریک کمرے میں چھوڑ کر غالباً وہ سن گن لینے کے لیے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اس کی واپسی ہوئی۔ ''میرے ساتھ آؤ'' اس نے ہیجان زدہ آواز میں کہا۔ ''میرے ساتھ قدم ملا کر چلنا اور خبردار کسی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔ تم میرے بھتیجے ہو اور میں نوکری دلانے کی غرض سے تمہیں چھوٹے ملک شہباز کے پاس لے جا رہا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ فی الحال میں نے اپنے میزبان کے حوالے سے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ یقینی طور پر گل ریز نے ہی ڈوریاں ہلائی تھیں۔

حکم کا غلام مجھے اس رہائشی یونٹ سے باہر لے آیا۔ جہاں تاریکی اور سرد ہوا نے ہمارا استقبال کیا تھا۔

کھلے میں آتے ہی میرے اعصاب تن گئے تھے۔ میری تمام تر حسیات انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی

تھیں۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں پسٹل میرے ہاتھ میں آسکتا تھا اور آخری چند گولیوں کا میں مناسب استعمال کرسکتا تھا۔

غالباً یہ ملازمین کے رہائشی یونٹ تھے۔ جہاں سے نکلتے ہی مناسب فاصلے پر گیس لیمپ نظر آنے لگے تھے اور قبائلی لباس میں ہتھیار بند محافظ بھی نظر آرہے تھے۔ قرب وجوار میں مچی ہلچل سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ میری تلاش کے لیے سرچ آپریشن جاری ہے۔

ہم کئی محافظوں کے قریب سے گزرے۔ کسی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ چند ایک نے حکم کے غلام سے علیک سلیک بھی کی۔ مجھ پر محض انہوں نے سرسری سی نظر ڈالی تھی۔

ہمارا رخ حویلی کی مرکزی عمارت کی طرف تھا پھر رخ قدرے تبدیل ہوا۔ مرکزی عمارت سے متصل یہ جدید عمارت تھی اور لگتا تھا حال ہی میں تعمیر کی گئی ہے۔

اس کے کھلے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے میری نظر قدیم حویلی کے مرکزی دروازے پر نمودار ہونے والے ایک درمیانی قامت کے بے حد سرخ وسفید فربہ اندام شخص پر پڑی۔ اس کے چہرے پر گھنی سیاہ مونچھیں جہاں بھلی لگ رہی تھیں وہیں اسے بارعب بھی بنارہی تھیں۔ اس کے کندھے پرایم۔ لـ16 جگمگارہی تھی۔

یہاں خاصی روشنی تھی۔ جس کے سبب تمام جزئیات نمایاں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھیں اس شخص سے چار ہوئیں۔ وہ ایک بے حد چوکس شخص کی نظریں تھیں۔ اس دوران ہم جدید عمارت میں داخل ہوچکے تھے۔

"یہ کون تھا؟"

میری طرح حکم کے غلام نے بھی اس بارعب شخص کو دیکھا تھا۔ "سالار خان!" اس کے لہجے میں ہراس اتر آیا۔ "حویلی کے محافظوں کا سردار ہے۔ اس حویلی سے بغض رکھنے والے اس کے سائے سے بھی بچ کر گزرتے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ مجھے پہلی دفعہ بجلی کے قمقمے نظر آئے۔ یقیناً یہ انتظام کسی جنریٹر کا مرہون منت تھا۔

یہاں بھی ہمارا واسطہ چند محافظوں سے پڑا تھا۔ مگر کسی نے کوئی توجہ نہیں دی۔ حکم کا غلام ضرور یہاں خصوصی اہمیت رکھتا تھا۔

وہ مجھے لکڑی کی جدید ریلنگ والی سیڑھیاں چڑھا کر دوسری منزل پر لے آیا۔ میرے سامنے ایک شاندار ٹیرس اور وسیع وعریض گلاس روم تھا۔ شیشے کی دیواروں کے پار سرخ دبیز پردوں نے اندرونی منظر چھپالیا تھا۔

میرے دل نے کہا...... میرا نیا میزبان اس حویلی میں خصوصی اہمیت ومرتبے کا مالک ہے۔

ٹیرس پر قدم رکھتے ہی حکم کا غلام مودب نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بے حد آہستگی کے ساتھ گلاس روم کا دروازہ کھولا اور جوتے اتار کر اندر داخل ہوا۔ میں بھی اس کے عقب میں تھا۔ البتہ میری خودسری جوتے اتارنے میں مانع رہی تھی۔

اس نیم گرم وسیع وعالیشان گلاس روم کے گلابی ایرانی قالین پر ہم دونوں پھٹے جوتوں کی مانند نظر آنے لگے تھے۔

اطراف میں سرخ آرام دہ صوفے پھیلے ہوئے تھے۔ درمیان میں شیشے کے ٹاپ والی میز...... جس پر انگور کی بیٹی تمام تر لوازمات کے ساتھ سجی تھی اور اس میز کے دوسری طرف ایک تخت نما نشست پر بیٹھا تیس بتیس سالہ بے حد خوبرو نوجوان مجھے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ترشی ہوئی بھوری مونچھیں اور بے حد چمکدار آنکھیں۔ اس کے پہلو میں ایک قیامت بھی تھی۔ سیاہ چمکدار کپڑے کا میکسی نما لبادہ جسے اس کے متناسب خدوخال والے جسم پر رکھ کر سلائی کیا گیا تھا گلابی رنگت، گال پر سیاہ تل اور آبشار کی مانند ڈائی کیے سنہرے بال، بلاشبہ وہ ہوش وحواس چھین لینے والے حسن وشباب کی مالک تھی۔

اس کی نظروں کا مرکز بھی میں تھا۔ ان نظروں میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ شرارت چمکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

خوبرو نوجوان کا اشارہ پاکر حکم کا غلام الٹے قدموں گلاس روم سے باہر نکل گیا۔

"خوش آمدید...... ڈاکٹر کمال المعروف "کمالا جٹ" نوجوان کی پراعتماد آواز ابھری۔ میرے اعصاب پتھر ہوچکے تھے۔ اس لیے میں چونکا تو نہیں، البتہ خفیف سا طویل سانس ضرور لیا۔ مجھے شناخت کرلیا گیا تھا۔

نوجوان تخت چھوڑ کر میرے قریب آیا۔ وہ مضبوط جسم کا طویل القامت تھا۔ "میں ذیشان خان ہوں۔ ناگوٹ، باگوٹ اور لیپٹائی کے سردار ملک طورا خان کا چھوٹا بھائی۔" اس کا اردو کا لہجہ بالکل صاف تھا۔

"موت کے چنگل سے سلامت نکال لینے کی مہربانی کی وجہ جان سکتا ہوں۔" میں نے اس کی چمکدار آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ "یہ بات شاید آپ کے بڑے بھائی کو بھی ناگوار گزرے۔"

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر طیش کی سرخی چمکی۔ مگر اگلے ہی پل معدوم ہوگئی، وہ ملائم لہجے میں بولا۔ "تمہاری مدد پر مجبور کرنے والی یہ حسین خاتون ہیں۔"

میں نے چونک کر اس قیامت کی طرف دیکھا جو خطرناک زاویے پر نیم دراز ہوچکی تھی۔ اس کے دراز لبوں پر بڑی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

اس قیامت پر ایک ریشہ خطمی ہونے والی نظر ڈال کر ذیشان نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ "یہ تمہاری بڑی "فین" ہے اور میں اس کا۔"

تم اس وقت آسیبی بونوں سے نبرد آزما تھے جب ہم دونوں طلوع آفتاب کا منظر دیکھنے کے لیے اسی گلابی روم میں موجود تھے۔ پردے ہٹے ہوئے تھے۔ مگر طلوع آفتاب کے دل موہ لینے والے منظر کی بجائے ہم نے ایک دلخراش منظر دیکھا۔ آسیبی بونے...... جو ایک بھی تین تنومند لڑاکوں پر بھاری پڑتا ہے، بیک وقت دو تم سے چمٹے تھے اور مجھے قوی یقین تھا کہ چند منٹوں بعد وہاں ایک ادھڑی ہوئی لاش پڑی ہوگی۔

مگر میں نے اپنی زندگی کے حیران کن مناظر میں سے ایک دیکھا۔" اس کے لہجے میں بڑی دلچسپی اور میرے لیے ستائش تھی۔ "میں نے تمہارے ہاتھوں مضروب ہونے والے ایک بونے کو جان کنی کے عالم میں تڑپتے اور دوسرے کو راہ فرار اختیار کرتے دیکھا۔

میرے لیے یہ بات دلچسپی کا عنصر لیے ہوئے تھی کہ مجھ پر حملہ آور ہونے والے بونے ایک خلقت کے لیے بہت بڑی چیز تھے۔

ذیشان خان نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس قاتلہ کی طرف رخ موڑا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک ازلی پیاس اس کے چہرے پر نظر آنے لگتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا وہ اس دلنواز پیکر پر

دل وجان سے فدا ہے۔ یہ حسین خاتون چند دن پہلے لاہور سے آئی ہیں...... خاصا فاصلہ ہونے کے باوجود انہوں نے تمہیں پہچان لیا اور تمہاری مدد کرنے کا مجھے حکم دیا۔"

میں نے بغور اس حسینہ کو دیکھا۔ اس کے نقوش کہیں لاشعور سے ابھرتے تھے اور واضح ہونے سے پہلے غائب ہوجاتے تھے مگر یہ بات یقینی تھی کہ اسے میں پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔

ذیشان خان کے انداز تخاطب پر یقیناً اس حسینہ کا اپنی قوت تسخیر پر اعتماد بڑھ گیا تھا۔ اس کا ثبوت اس کی گہری ہوتی مسکراہٹ تھی۔

میں اس مخمصے میں الجھ گیا تھا کہ وہ کون تھی؟ اور ذیشان خان کو کیوں میری مدد پر آمادہ کیا۔ بظاہر اس کا گل ریز سے بھی کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔

ذیشان خان کہہ رہا تھا۔ "میں نے فوراً واکی ٹاکی استعمال کیا اور اپنے ایک وفادار کو جو تمہارے قریب ترین تھا...... تمہاری مدد کے لیے کہا۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" پھر اس نے کلائی پر جگمگاتی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "تمہارے ساتھ پھر ملاقات ہوگی۔ فی الحال تم شیری کے مہمان ہو اور میزبانی اسی کے ذمے۔" اس کے بعد اس نے بڑی بے باکی سے میرے سامنے شیری نام کی اس لڑکی کا بوسہ لیا اور گلاس روم سے باہر نکل گیا۔ اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی شیری لپک کر میرے قریب آئی۔

"آ...... پ یہاں کیسے؟" اس کی نظریں تشویشی انداز میں میری حالت زار کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"میں آوارہ گرد ہوں...... کہیں بھی پایا جاسکتا ہوں، مگر تم کون ہو؟ اور میری مدد کیوں کی؟" گل ریز کا نام لینا میں نے فی الحال مناسب نہیں سمجھا۔

اس نے گہرا سانس لے کر بالوں کو جھٹکا۔ "یہ بھی بتادوں گی...... فی الحال تو آپ کو طبی امداد کی ضرورت ہے۔" میں کوشش کے باوجود اس کے انداز میں مصنوعی پن نہ ڈھونڈ سکا۔ اس کی فکر و پریشانی حقیقی محسوس ہوتی تھی اور یہی بات مجھے قیاس آرائیوں پر مجبور کررہی تھی وہ کون تھی؟ اور مجھے دیکھی...... دیکھی سی کیوں لگتی تھی۔

وہ حال ہی میں لاہور سے آئی تھی اور میں نے لاہور میں بڑا طوفانی وقت گزارا تھا اور یہی وقت تھا جب میں نے کمال احمد کو...... "کمالا جٹ" کے نام سے ہوا دی تھی۔

ایک لمحے سے بھی کم وقت میں ٹیکسالی کے کوٹھے، نامی گرامی بدمعاش، پھنے خان قسم کے پولیس آفیسر میرے سامنے سے گزر گئے۔ مگر وہ لڑکی مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔

لاہور یاد آیا تو دل سے ہوک سی اٹھی۔ مال روڈ کی گہما گہمی، پکوان، اندرون لاہور کی دھول، جو ماں کی چادر کی مانند ڈھانپ لیتی تھی، برسات کے دنوں میں راوی کو چھو کر آنے والی ہوا، جو پیشانی پر نم سے بوسے دیتی تھی اور جناح پارک کا وہ دور افتادہ پرسکون گوشہ...... جہاں میرے بڑھتے قدم روکنے کے لیے کائنات کسی کی پروا کیے بغیر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

یہ سب لمحے بھر میں دماغ کی اسکرین پر ابھر کر معدوم ہوگیا تھا، دل سے اٹھنے والی ہوک نے اس دفعہ بھی لبوں پر آنے کی بجائے سینے کی گہرائیوں میں دم توڑ دیا تھا۔

فی الحال میرے سامنے "میرے لاہور" سے آئی ایک لڑکی تھی جو بے شک اجنبی تھی مگر میری مدد کرنے پر تلی تھی۔ میں نے کہا۔ "ممکن ہے طبی امداد سے پہلے میں بھوک سے مرجاؤں۔" اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر گلاس روم سے متصل ایک اور کمرے میں لے گئی یہاں تین اور لڑکیاں موجود تھیں اور زنانہ استعمال کی اشیاء ہر طرف بکھری ہوئی تھیں۔ ان اشیاء میں گھنگھرو بھی تھے۔

شیری سمیت وہ لڑکیاں طوائفیں تھیں۔ اچانک ہی میرے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔ آج کل میں اس حویلی میں رقص و موسیقی کی بہت بڑی محفل برپا ہونے والی تھی۔ یہ لڑکیاں یقیناً اسی مقصد کے لیے لاہور سے بلوائی گئی تھیں۔ ان کا تعلق بازار حسن سے تھا۔

بازار حسن کا کوئی ایسا معروف کوٹھا نہیں تھا جس کی سیڑھیاں میری قدم آشنا نہ ہوں مگر مجھے یقین تھا...... میں نے شیری کو پہلے کہیں نہیں دیکھا۔

یہ دیکھ کر میں ٹھنڈا سانس لینے پر مجبور ہوگیا کہ باقی تینوں لڑکیاں نا صرف مجھ سے غائبانہ آشنائی رکھتی تھیں بلکہ شیری انہیں یہ بھی بتا چکی تھی کہ کمالا جٹ جس کی "دھوم" پاکستان کے پنجاب کے ساتھ ساتھ انڈیا کے پنجاب میں بھی مچی ہے، وہ ہمارے درمیان ہے۔

لڑکیوں کی خوف آمیز دلچسپی کا تمام تر مرکز میں تھا اور اپنی منفی شہرت سے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی مجھے بہت الجھن ہو رہی تھی۔

چاروں لڑکیوں نے مل کر میرے سامنے انواع اقسام کے کھانے چن دیئے۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ اس کے بعد میرے تمام تر اصرار کے باوجود میری مرہم پٹی بھی کی۔

میرے جسم پر ریچھ کے پنجوں کے گھاؤ تھے۔ جن میں اچھی خاصی جلن ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک لڑکی شبانہ نے نرسنگ کورس کیا تھا، جسے وقت کا ظالم اور بے رحم ہاتھ مجبوری کے ڈنڈے سے دھکیلتا ہوا کوٹھے پر لے آیا تھا۔ اس نے بڑی ادا سے کہا۔

"جٹ جی! لگتا ہے کسی کتے، شتے کے ساتھ آپ کی لڑائی ہوئی ہے۔"

شیری نے اس کی بات کاٹی...... "اری...... کتوں سے نہیں...... وہ جو چینی پتا نہیں جاپانی بڈھا ہے نا اس کے باڈی گارڈز چمونوں نے انہیں کاٹا ہے...... ہاں یاد آیا......" شیری نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "ذیشان بتا رہا تھا کہ انہوں نے ایک ریچھ کو بھی مار ڈالا ہے۔ ضرور یہ لمبی لکیروں جیسے زخم اسی کے پنجوں کے ہوں۔"

"ہائے......" شبانہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "جٹ جی! آپ موئے ریچھ سے بھی بھڑ گئے؟" دوسری لڑکیاں بھی حیران و پریشان نظر آنے لگی تھیں۔

"نہیں...... وہ خود مجھ سے بھڑا تھا۔" میں نے اسی کے انداز میں کہا۔

"آپ تو خود ڈاکٹر بھی ہیں، کوئی انجکشن لکھ دیں۔ منگوا لیتے ہیں۔ ورنہ انفیکشن ہوجائے گا۔" شبانہ متفکر نظر آنے لگی تھی۔

"کچھ نہیں ہوتا...... میں ایسے کئی انفیکشن بھگتا چکا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور یہ حقیقت بھی تھی۔ میرے وجود میں جو طوفان کروٹیں لیتے تھے وہ ہر زخم کو جلا کر رکھ دیتے تھے۔

لڑکیاں بڑے اچنبھے سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ریچھ کے ساتھ لڑائی اور اسے زیر بھی کرلینا...... ان کے لیے بڑی ناقابل یقین بات تھی۔ مگر یہ کارنامہ انجام دینے والا ان کے سامنے تھا۔ میں نے ذیشان خان کا ایک نفیس سا کرتا، شلوار زیب تن کیا ہی تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ماضی

قریب کا ایک جانا پہچانا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ ساتھ ہی اس اسرار سے بھی پردہ اٹھ گیا کہ شیری کون تھی۔ وہ لاہور بازار حسن کی مشہور و معروف نائیکہ لیلیٰ وارثی تھی۔ شیری یقیناً اس کی بیٹی تھی' دونوں کے نقوش میں واضح مشابہت تھی۔

میرا لیلیٰ وارثی کے پاس خاصا آنا' جانا تھا۔ ٹیکسالی کے "خاندانی" کوٹھے کے علاوہ ڈیفنس میں بھی اس کا کوٹھی خانہ تھا' جہاں صرف خاص لوگوں کو رسائی حاصل تھی اور میں اس کے لیے خاص الخاص تھا۔

عام نائیکاؤں کے برعکس وہ خاصی دبلی تھی۔ اس کا جسم ابھی بھی کمان کی مانند تنا تھا اور جسم پر سلیقے کا لباس تھا۔ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی مگر لگتی تیس کی تھی' اگر میں یہ نہ جانتا کہ اس کی کوئی بہن نہیں ہے تو شیری کو اس کی چھوٹی بہن ہی سمجھتا۔

مجھے دیکھ کر لیلیٰ وارثی ہکا بکا رہ گئی تھی۔ اس کے عقب میں ایک سرو کی مانند لمبی اور نوخیز لڑکی تھی۔ جس کی عمر بمشکل پندرہ سال رہی ہوگی۔ ساڑھے پانچ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کے باوجود اس نوخیزی میں بھی وہ بڑی شاداب تھی۔ بھرا بھرا جسم کسی رس بھری کی مانند محسوس ہوتا تھا۔ وہ نوخیز لڑکی بڑی بے زار بے زار سی نظر آئی تھی۔

لیلیٰ وارثی لپک کر میرے قریب آئی اور بے دھڑک بغل گیر ہوگئی۔ "یقین نہیں آ رہا...... یہ آپ ہیں جٹ جی!" وہ مجھے ہمیشہ ایسے ہی مخاطب کرتی تھی۔ "آپ یہاں کیسے؟ جب سے آپ نے ہمارے کوٹھے سے منہ موڑا ہے میں تو آپ کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھی۔" اس نے مجھ سے جدا ہوتے ہوئے شکوہ کیا۔

"تم سے دوبارہ ملنا نصیب میں لکھا تھا' دیکھو تقدیر گھیر کر کہاں لے آئی ہے۔"

"ہم سے بھاگ کر آپ جا ہی کہاں سکتے ہیں۔"

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ نوخیز لڑکی کسی کی طرف توجہ دیئے بغیر فرشی بستر پر اوجھل ہوگئی تھی۔ "لگتا ہے ذیشان خان کے مہمان بن کر آئے ہیں آپ؟"

میں نے شیری کی طرف دیکھا۔ "نہیں...... میں تو شیری کا مہمان ہوں۔"

لیلیٰ وارثی نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا۔

"و...... وہ...... وہ باجی!" شیری نے قدرے ہکلا کر طوائفوں کی روایت کی مانند ماں کو باجی کہہ کر مخاطب کیا اور پھر سنبھالا لے کر پوری تفصیل بتا دی۔

ایک لمحے کے لیے لگا کہ ماں کو بیٹی کا یہ اقدام پسند نہیں آیا مگر وہ بڑی گھاگ عورت تھی' جس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ فوراً ہی اس نے اپنے تاثرات سنبھالے۔ اس کے چہرے پر نرم پھوار سی برسنے لگی۔

"یہ تو اچھا کیا لڑکی! کمال صاحب کے بھی ہم پر کئی احسانات ہیں۔ کم از کم آج ایک تو اتر گیا۔" اور یہ حقیقت تھی۔ میں نے ایک تیس مار خان کے فلمساز سے اسے پچاس لاکھ روپے نہ صرف واپس دلائے تھے بلکہ اسے لیلیٰ وارثی کے سامنے فرش پر ناک سے سات لکیریں بھی نکلوائی تھیں۔

میں نے کہا۔ "شیری کو کبھی میں نے دیکھا نہیں...... یہ نا صرف مجھے جانتی ہے بلکہ میری ہمدرد بھی ہے۔ یہ بات میرے لیے حیرانگی کا باعث ہے۔"

شیری کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ لیلیٰ وارثی نے شوخی سے کہا۔ "میں بتاتی ہوں۔"

وہ مجھے لے کر نیچے کارپٹ پر بیٹھ گئی۔ "نازو! ہیٹر لے آ......" اس نے قدرے تحکمانہ انداز میں ایک قدرے سانولی مگر دلفریب نقوش کی مالک لڑکی سے کہا۔

کچھ دیر میں ہمارے درمیان الیکٹرک ہیٹر خوشگوار حرارت پھیلا رہا تھا۔ کاجو سے بھری پلیٹ بھی آ گئی تھی۔

لیلیٰ وارثی پھسکڑا مار کر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ایک لڑکی نے نفیس سی چادر اس کے کندھوں پر پھیلا دی۔ لڑکیاں فرشی نشست پر ہمارے گرد بیٹھ گئیں۔

اس نے ایک شوخ سی نظر بیٹی پر ڈالی اور گویا ہوئی۔ "جن دنوں آپ کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا...... یہ ان دنوں پڑھ رہی تھی اور میں نے اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھا تھا۔ یہ ڈیفنس والی کوٹھی پر ہوتی تھی اور چھپ چھپ کر آپ کو دیکھتی تھی۔"

میں نے شیری کی طرف دیکھا۔ ایک طوائف زادی کے چہرے پر جھینپی جھینپی سی شرم اچھی لگی۔

لیلیٰ وارثی کہہ رہی تھی۔ "اسے آپ اور آپ کی کہانی سے بڑی دلچسپی تھی۔ مجھ سے کرید کرید کر آپ کے بارے میں پوچھتی تھی...... کبھی کبھی تو مجھے لگتا تھا یہ نگوڑی مرتی ہے آپ پر......"

"باجی......" شیری نے ٹھنک کر کہا۔ اس کے چہرے پر آئے رنگ واقعی کسی گڑبڑ کی چغلی کھا رہے تھے۔ ایسی ہر پیش قدمی میرے وجود میں سناٹے اتار دیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔ میں نے شیری کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ ریشمی تھان کھل گیا تھا۔ میری ذرا سی حوصلہ افزائی یا ایک "خاص نظر" اسے پورا کھول دیتی۔ میں نے بے تاثر چہرے کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔ بہرحال وہ' میری محسنہ تھی۔

لیلیٰ وارثی نے مزید کہا۔ "اسے' میں نے آپ جیسے کسی قدردان کے لیے چھپا کر رکھا تھا مگر آپ ہمارا راستہ بھول گئے' اور یہ ذیشان خان کی ہوگئی۔"

شیری نے واک آؤٹ کر جانا مناسب سمجھا۔

رات قدرے گہری ہونے پر میں دوبارہ سے پرشکوہ روم میں ذیشان خان کے ساتھ تھا۔ شیری بھی اس کے قریب تھی۔

میں دانستہ شیری کی طرف دیکھنے سے اجتناب برت رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کی چمک اب واضح ہو چکی تھی۔

رقص و موسیقی کا پروگرام آج رات طے ہوا تھا۔ مگر کسی خاص مہمان کی آمد میں تاخیر کے سبب یہ اگلی رات ہونا تھا۔

شیری نے غیر ملکی برانڈ کی شراب نفیس پیمانوں میں انڈیلی' ایک جام اس نے میری طرف بڑھایا۔

"نہیں...... میں نہیں پیتا۔"

"پہلے تو پیتے تھے آپ۔" وہ حیران ہوئی۔ "جب ہمارے ہاں آتے تھے۔"

"کوٹھے کے ساتھ اس خانہ خراب سے بھی منہ موڑ چکا ہوں۔"

اس نے بغور میری طرف دیکھا اور پھر وہی جام اپنے حلق میں انڈیل لیا۔ ذیشان خان نے بھی پہلے جام کے ساتھ یہی حشر کیا تھا۔

شیری نے اسے دوسرا بنا کر دیا۔ یہ تیز اثر شراب تھی' ذیشان خان کی چمکدار آنکھوں میں گلابی ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اس نے دوسرے جام سے ایک گھونٹ لیا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم ایک دلیر اور خوش قسمت شخص ہو۔ میں نے لاہور میں خاصا وقت گزارا ہے' تمہارے بارے میں خاصا سنا تھا' اور شیری نے بھی بہت کچھ بتایا ہے۔" اس نے شیری کی کمر میں ہاتھ

ڈالا۔ ''مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جتنا سنا تھا' تم اس سے بڑھ کر ہو۔''

میں کیا کہتا...... نقرئی طشتری سے ایک کاجو اٹھا کر میں نے منہ میں ڈال لیا۔ مجھے حرارت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ریچھ کے لگائے زخم اپنا اثر دکھا رہے تھے۔

''اس حویلی میں تم قیدی کی حیثیت سے لائے گئے تم نے نا صرف قید خانے سے رہائی حاصل کرلی بلکہ دو محافظوں کو بھی ہلاک کر دیا۔ تمہارا اگلا نشانہ میرے بھائی کا چہیتا اور خونخوار ریچھ ''دابُو'' بنا۔ وہ بہت خاص ریچھ تھا۔ کتوں کے ساتھ ہونے والا کوئی مقابلہ وہ نہیں ہارا تھا۔ اور تنہا حویلی کی شمالی فصیل کا محافظ تھا۔ تم نے محض ایک خنجر کی مدد سے اسے ہلاک کر دیا۔ اسی ملے میں تمہارا ٹاکرا ان آسیبی بونوں سے ہوا...... تم انہیں بھی پچھاڑنے میں کامیاب رہے...... یہ تمہاری دلیری بھی اور خوش قسمتی ہے کہ شیری تمہاری پرستار ہے۔'' اس نے شیری کا بوسہ لیا۔ شیری کی آنکھوں سے بھی نشہ چھلکنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''قطعہ کلامی کی معافی چاہتا ہوں...... یہ آسیبی بونے کیا چیز ہیں؟ میں ان کے حوالے سے دلچسپی لینے پر مجبور ہوں اب تک تو یہی سنا ہے کہ وہ کوئی ناقابل تسخیر اور خوفناک قسم کی شے ہیں۔ مناسب سمجھیں تو ان کے بارے میں کچھ بتائیں۔''

ذیشان خان نے شیری کے ملائم بالوں میں انگلیاں چلائیں اور گویا ہوا۔ ''ہماری بستیوں کے شمال میں ایک خطرناک درہ عبور کرتے ہی ''لجلال'' نام کی بے حد دشوار گزار وادی ہے' نامعلوم وقتوں سے بونوں کا قبیلہ وہاں آباد ہے۔ نہ جانے یہ کہاں سے آئے تھے ان کی زبان' رہن سہن' رسم و رواج اور مذہب سب کچھ منفی ہے۔

دانستہ' نادانستہ جو بھی ان سے ٹکرایا تباہ ہوا' رفتہ رفتہ ان کی شہرت پھیلی...... ہم قبائلی لوگ ڈرنا تو سیکھے نہیں مگر چند ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے ان کی شہرت کو افسانوی رنگ دے دیا۔ مثلاً ان پر حملہ کرنے کے لیے چھپے دولت زئی قبیلے کے چند نوجوانوں پر پوری چٹان آگری۔ ایک' دو اور بھی ایسے واقعات ہوئے۔

ہمارے لوگ اور کسی سے ڈریں یا نہ ڈریں' بھوت پریت وغیرہ سے بہت ڈرتے ہیں۔ لجلال کے درے کے پاس کئی افراد کو سیاہ لباس والی عورتیں ماتم کرتی نظر آئیں...... لوگوں نے بدروحوں کی چیخیں بھی سنیں' چھل پیریاں بھی دیکھی گئیں اور بیس' بیس فٹ لمبے بزرگ بھی جو بھولے' بھٹکے مسافروں اور بونوں کے قبیلے پر حملہ کرنے کی نیت سے نکلے قبائلی لشکر کے ہراول دستے کو واپس جانے کا کہتے تھے۔

یہ کہتے ہوئے ذیشان خان کے چہرے پر دبا دبا تمسخر تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ وہ ان لغو باتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ شیری یہ سنتے ہوئے البتہ ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

ذیشان خان کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے میں نے بھی خاموشی مناسب سمجھی۔

''اس کے بعد لوگ لجلال کی وادی کی طرف جاتے ہوئے ڈرنے لگے۔ اس کے علاوہ یہ بونے جنہیں مقامی زبان میں ''زوگالے'' بھی کہا جاتا ہے' بے حد خونخوار اور لڑائی بھڑائی میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں آدم خوری کی بھی اڑتی اڑتی کہانیاں سنی گئی ہیں۔

ہمارے لوگوں میں ان کے بارے میں جہاں خوف پایا جاتا ہے' وہیں غم و غصہ بھی موجود ہے۔

دولت زئی قبیلے کی ایک عورت اور اس کی تیس سے زائد بھیڑوں کی گمشدگی کا ذمہ دار انہیں سمجھا جاتا ہے۔ راہ گم کردہ لوگوں کی گمشدگی بھی انہی کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے۔ ویسے یہ بالکل الگ تھلگ اور لجلال تک ہی محدود رہنا پسند کرتے ہیں۔''

''پھر آپ کی حویلی میں ان کا کیا کام؟'' مجھے سوال کرنے کا موقع مل گیا۔ ''اور شیری نے تو انہیں کسی جاپانی یا چینی بوڑھے کا باڈی گارڈ قرار دیا ہے۔''

میں نے شیری کی طرف دیکھا۔

شیری نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو یہی دیکھا ہے۔''

اس کے بعد میری سوالیہ نظروں کا رخ ذیشان خان کی طرف ہو گیا۔ اس نے شیری کو دوبارہ جام بھرنے کا اشارہ کیا اور گویا ہوا۔ ''یہ ایک علیحدہ کہانی ہے۔'' پھر اس نے اچانک سوال کیا۔ ''باکی موشیوں کا نام سنا ہے تم نے؟''

اس نام کے حوالے سے میرے ذہن میں شناسائی کا کوئی حوالہ نہیں ابھرا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ شیری نے دوبارہ سے اس کا پیمانہ بھر دیا تھا۔

اس نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا اور بولا۔ ''دنیا کے امیر ترین پچاس افراد میں سے ایک...... چین کے علاقے تبت سے تعلق رکھنے والا باکی موشو...... جس کی شخصیت کا ایک اور حوالہ بھی ہے۔ وہ مارشل آرٹ کا بے مثال کھلاڑی ہے۔

باکی موشو گزشتہ آٹھ سال سے اس علاقے میں موجود ہے اور نہ جانے اس بوڑھے نے کون سا منتر پھونکا ہے' کہ یہ خونخوار زوگالے اس کے بے دام غلام بن گئے ہیں۔ مجھے زبردست دلچسپی محسوس ہوئی۔ باکی موشو جیسی شخصیت کی کئی سالوں سے اس علاقے میں موجودگی کا کوئی سبب تو ضرور رہا ہوگا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ خبر کرنل سلیم کے لیے بھی حیران کن ثابت ہوگی۔

میں نے ٹٹولنے کی غرض سے پوچھا۔ ''وہ ارب پتی اس بنجر علاقے میں کیا کر رہا ہے؟''

ذیشان خان کے شراب کی حدت سے تمتاتے چہرے پر دوبارہ تمسخر چمکنے لگا۔ ''وہ خبطی سمجھتا ہے کہ بدھ کا وہ ''عظیم معبد'' انہی پہاڑوں میں کہیں پوشیدہ ہے۔ جس کے ستون زمرد سے تراشے گئے ہیں۔ جس کا فرش' یاقوت سے بنا ہے اور ''مقدس بدھا'' کے جتنے بھی مجسمے وہاں موجود ہیں سبھی قیمتی پتھروں سے تراشے گئے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں وہ افسانوی معبد کی تلاش میں ہے جسے رائی کا پہاڑ لکھنے والے تاریخ دانوں نے ''ہیرے کا بدھا'' لکھا ہے۔'' ذیشان خان نے باقی ماندہ شراب ایک ہی دفعہ حلق میں انڈیل لی۔ وہ عادی شرابی لگتا تھا۔ ابھی تک اس کی زبان میں لکنت نہیں آئی تھی۔

میرے ذہن میں ہیرے کا بدھا گونج رہا تھا۔ میں نے بھی اس افسانوی معبد کی کہانیاں سنی تھیں۔ مگر مجھے بھی ایسے کسی معبد کی دنیا میں موجودگی کا یقین نہیں تھا۔

بے شک ان بنجر پہاڑوں میں بدھ مت کے آثار قدیمہ کثرت سے پائے جاتے تھے۔ مگر یہ معبد صرف تاریخی قصے کہانیوں میں ملتا ہے۔

باکی موشو کوئی خبطی ہی لگتا تھا' مگر میں یہ اطلاع کرنل سلیم کو دینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ عین ممکن تھا...... باکی موشو نے معبد والا شوشہ جان بوجھ کر چھوڑا ہو۔ اس کے پس پردہ مقاصد کوئی اور ہوں۔

بے شک وہ چین جیسے عظیم دوست ملک کا شہری

تھا، مگر اس کا تعلق تبت سے تھا۔ جہاں پھیلی شورش چین کے لیے پریشان کن تھی۔ یہ بھی ممکن تھا باکی موشو کا تعلق شورش پسندوں سے ہو اور وہ اس ویرانے میں بیٹھا چین کے مفادات کے خلاف کام کر رہا ہو۔

میں نے بھی ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''اس چکر میں وہ ارب پتی ضرور ''ککھ پتی'' ہوجائے گا۔''

ذیشان خان بھی مسکرایا اور کاجو پھانک کر خالی جام شیری کو تھما دیا۔ ''لگتا تو یہی ہے۔ ایک پوری پہاڑی کو مسطح کروا کر اس نے بہت بڑی حویلی تعمیر کروائی ہے۔ دنیا کی ہر جدید سہولت اس حویلی میں موجود ہے اور سب سے بڑھ کر زوگالے اس حویلی کے محافظ ہیں۔

اردگرد کے سرداروں سے بھی اس کے اچھے تعلقات ہیں۔ ماسوائے دولت زئیوں کے...... جو زوگالوں کی وجہ سے اسے بھی اچھا نہیں سمجھتے۔''

سرداروں اور ملکوں کو وہ قیمتی تحائف بھی دیتا رہتا ہے۔ آئے دن اس کی حویلی میں کوئی نہ کوئی تقریب ہوتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''یہاں بھی تو وہ غالباً رقص وسرور کی محفل میں شرکت کرنے کی غرض سے آیا ہے؟''

ذیشان خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مگر ایک اور وجہ بھی ہے۔'' اس کا انداز بڑا معنی خیز تھا۔ شیری کے ہونٹوں پر بھی معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

''کون سی؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

اس نے شیری سے دھیمے انداز میں کچھ پوچھا جس کا جواب شیری نے اثبات میں دیا۔

''باکی موشو کی سب سے بڑی بشری کمزوری اونچی لمبی، شاداب، نوخیز لڑکیاں ہیں۔ اور ملک طور خان اس کمزوری سے بخوبی واقف ہے۔ میرے خیال میں تم سمجھ گئے ہو گے۔'' اس کا انداز پھر معنی خیز ہوا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ تصور کے پردے پر وہ نوخیز لڑکی چمکی جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے شیری وغیرہ کے کمرے میں دیکھا تھا۔ جو ہر چیز سے بے زار نظر آ رہی تھی۔

میرے وجود میں وہ نفرت انگیز غصہ ابھرنے لگا جو ہر مظلوم کی مدد کرنے اور ظالم کا پنجہ مروڑنے پر آمادہ کرتا تھا۔

نہ جانے وہ معصوم کلی کون تھی؟ کس ماں باپ کے چمن کی تھی۔ اسے ایک ہوس پرست کے بستر کی زینت بنایا جانے والا تھا۔

وہ جو بھی تھی۔ اسے زبردستی لایا گیا تھا یا پھر زبردست مجبوری کی لاٹھی سے ہانک کر۔ خوشی سے تو وہ کسی صورت نہیں آ سکتی تھی۔ میں اس معصوم کا نام تک نہیں جانتا تھا۔ مگر ایک پل میں میرا اس سے وہی رشتہ قائم ہو گیا جو ہر ظلم کے شکار ہونے والے سے ہو جاتا تھا۔ میں بھی ظلم کا شکار ہوا تھا میں ہر مظلوم میں خود کو دیکھتا تھا۔ میں نے اسی وقت اس کی مدد کا تہیہ کر لیا۔

اچانک ذیشان خان نے میری آنکھوں میں اپنی چمکدار آنکھیں گاڑھی اور سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''تم اپنے دشمنوں کی فہرست میں تین بے حد خطرناک دشمنوں کا اضافہ کر چکے ہو۔''

میں نے کاجو چباتے ہوئے اطمینان سے کہا۔ ''میں صرف دوستوں کی پروا کرتا ہوں۔ دشمنوں کی نہیں۔'' میرے الفاظ کی گونج چند لمحے تک گلاس روم میں رہی تھی۔

ذیشان خان نے بڑی خاص نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''تمہاری دلیری وجرأت متاثر کن ہے مگر میرے یہ الفاظ یاد رکھنا ...... میرا بھائی طورا خان ...... جس کے دو بندے اور چھیتا ریچھ تم مار چکے ہو دشمنوں کی پرورش کرنے والا شخص ہے۔

نور جان المعروف سرخ بھیڑیا ...... انسان کے روپ میں واقعی کوئی بھیڑیا ہے جس پڑاؤ پر حملے کے دوران وہ تمہیں اٹھا لایا تھا۔ وہ جان چکا ہے کہ کس کا تھا۔''

میں چونکا مگر خاموش رہا۔

''پڑاؤ پر حملہ آور ہونے کی وجہ غالباً کوئی لڑکی تھی، جسے اس نے پہاڑی پر دیکھا تھا۔ وہ عورتوں کا بہت بڑا شکاری ہے۔ تم نے اس کے منہ سے نوالا چھینا ہے، تمہاری ''حالیہ کارکردگی'' نے اسے چونکا دیا ہے۔ چند دن پہلے اس نے چند سرکاری بندے پکڑے ہیں جو اس کی ٹوہ لیتے پھر رہے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید تم بھی انہی میں سے ہو۔''

اضطراب وبے چینی کی ایک تند لہر میرے اوپر سے گزر گئی تھی۔ بظاہر میں نارمل نظر آ رہا تھا آرمی کے چند جوانوں اور آفیسرز پر مشتمل ایک ایڈوانس پارٹی پہلی سے سرخ بھیڑیے کے شکار کے لیے سرگرم تھی۔ میرا جاں نثار دوست وجاہت عرف ہیرا بھی انہی کے ساتھ تھا۔

ذیشان خان، میری کیفیت سے بے خبر کہہ رہا تھا۔ ''تیسرا، سانپ کی مانند زہریلا اور بے حد سفاک شخص باکی موشو ہے جو زوگالو کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے اور تم ایک زوگالے کی جان لے چکے ہو۔

یہ تینوں دشمن تمہارے لیے اب تک کے ہر دشمن سے مختلف ثابت ہوں گے۔ میں اپنے الفاظ دہرا رہا ہوں ...... یہ الفاظ یاد رکھنا۔ اپنی ٹکر کے دشمنوں سے تمہارا واسطہ پہلی دفعہ پڑنے جا رہا ہے۔''

ذیشان خان کے الفاظ نے میرے وجود میں سنسنی دوڑا دی تھی، مگر اب یہ سنسنی مجھے مرغوب تھی۔ میں نے اسی انداز میں کہا۔ ''میں اپنے الفاظ دہرانا پسند تو نہیں کرتا، مگر آپ میرے محسن ہیں۔ اس کے لیے دوبارہ کہہ رہا ہوں، مجھے ان نئے دشمنوں کی کوئی پروا نہیں۔ سرخ بھیڑیے اور باکی موشو جیسے نہ جانے کتنے دشمن موت کی دھار میں بہا چکا ہوں۔'' دانستہ میں نے طورا خان کا نام نہیں لیا تھا۔

''میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ صرف مجھے رخصتی کی اجازت دے دیں۔ باقی میں سب کچھ خود دیکھ لوں گا۔''

ذیشان خان کا تمتماتا چہرہ سرخ تر ہو گیا۔ ''ہوش کے ناخن لو، میرے پورشن سے نکلتے ہی تم مارے جاؤ گے، حویلی میں کڑا پہرہ ہے۔ سبھی کو یقین کی حد تک شبہ ہے کہ تم حویلی میں ہی چھپے ہوئے ہو۔ شیری سے میرا وعدہ ہے کہ مناسب موقع ملتے ہی تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے گا۔'' اس نے مخمور نظروں سے شیری کی طرف دیکھا۔

اس کی نظر بچا کر شیری نے مجھے، اس کی بات مان لینے کا اشارہ کیا۔

اختلاف کے باوجود میں خاموش رہا۔ مجھے، گل ریز کی فکر ہو رہی تھی۔ سرخ بھیڑیا جان گیا تھا کہ وہی میرا میزبان ہے، گل ریز تک یہ خبر پہنچنا بے حد ضروری تھا۔

ذیشان خان کے پاس بظاہر میں محفوظ تھا۔ مگر کسی بھی وقت کوئی گھر کا بھیدی لنکا ڈھا سکتا تھا۔ ایسی صورت میں یہ محفوظ پناہ گاہ میرے لیے چوہے دان بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے کچھ ہی

عرصے میں دنیا دیکھ لی تھی۔ میرا وجدان کہہ رہا ذیشان خان ایک بے حد گہرا شخص ہے۔ اس کی گہرائی ناپنا بہت مشکل ہے۔ محض ایک چہیتی طوائف کی خاطر اس نے اپنے بڑے بھائی اور اس کے خاص دوستوں کے مجرم کو پناہ دی تھی میرے حلق سے نہیں اتر رہا تھا۔

بہر حال چند گولیوں کے ساتھ پسٹل اور میرا خون آشنا خنجر میری تقویت کے لیے موجود تھے۔

ذیشان خان نے شیری کو اپنی آغوش میں کھینچا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''راز داری کے خیال سے تمہیں شیری وغیرہ کے کمرے ہی میں رات گزارنا ہوگی۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ یہ تمہارے شایانِ شان تو نہیں ہے مگر مجبوری ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ذیشان خان کی بڑھتی خرمستیوں کے سبب وہاں سے نکل جانا ہی بہتر تھا۔

میں طوائفوں والے کمرے میں آیا تو وہاں صرف لیلیٰ وارثی اور وہی نوخیز لڑکی موجود تھی باقی لڑکیاں غالباً شیری کی طرح شبینہ ڈیوٹی پر گئی تھیں۔

لیلیٰ وارثی اور وہ لڑکی ایک ہی بستر میں تھیں۔ آہٹ پا کر لیلیٰ وارثی نے نیم وا نظروں سے میری طرف دیکھا۔ لڑکی بدستور کمبل میں اوجھل رہی۔

میں نے لیلیٰ وارثی کے قریب کا ایک بستر سنبھالا۔ اس نے میری طرف رخ کر لیا۔ اس کی آنکھیں اب پوری کھل گئی تھیں۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''آپ یہاں کیسے پھنس گئے جٹ جی؟''

''کچھ دوستوں کے ساتھ شکار پر نکلا تھا۔ ڈاکوؤں نے ہمارے پڑاؤ پر حملہ کر دیا اور کچھ نہیں ملا تو مجھے ہی باندھ کر لے آئے۔'' میں نے اختصار اً بتایا۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''ہائے اللہ کس میں اتنی جرات و طاقت آ گئی کہ آپ کو باندھ سکے۔'' میں دھیرے سے مسکرایا تو جبڑے میں خفیف سا درد جاگ اٹھا۔ یہ درد سرخ بھیڑیے کے زوردار گھونسے کا نتیجہ تھا اور ابھی سلامت تھا۔ خواہش تو تھی کہ درد ختم ہونے سے پہلے بدلہ اتار دوں مگر فی الحال ایسی کسی محاذ آرائی کے امکان نظر نہیں آ رہے تھے۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے موضوع بدل کر بستر میں روپوش نوخیز لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ لیلیٰ وارثی کو میں اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اس لیے میرا انداز سرسری سا تھا۔ اس کے باوجود وہ کائیاں عورت پل بھر میں محتاط ہو گئی۔ اس نے لڑکی پر کمبل درست کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس ملک طورا کی امانت ہے۔ تھوڑی اڑی کر رہی ہے۔ اس نے سمجھانے، بجھانے کے لیے میرے حوالے کی ہے۔ ابھی اس کی ''نتھ'' نہیں اتری۔

میں نے گہرا سانس لیا۔ اس کمبخت نے سمجھا تھا کہ میں شاید اس لڑکی پر رال ٹپکا رہا ہوں۔ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ وہ معصوم ابھی ہوس کے بستر پر چلی نہیں گئی تھی۔

میں نے اپنی ''نیت'' واضح کرنے کی غرض سے کہا۔

''یہ تو ابھی بچی ہے کون ظالم اس کے درپے ہے؟''

''طورا خان کا کوئی چینی دوست ہے۔ طورا خان اسے یہ لڑکی ''تحفے'' میں دے رہا ہے۔'' اس نے میری طرف سے مطمئن ہو کر غیر محسوس طریقے سے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ وہ مجھے بھی بخوبی جانتی تھی، میرا ہاتھ روکنا بھی اس کے بس میں نہیں تھا اور طورا خان اپنی امانت میں ہونے والی خیانت کی وجہ سے اس کی گردن بھی اتار سکتا تھا۔

میرے جسم و جاں میں الاؤ دہکنے لگا تھا۔ میری بدلتی کیفیت سے بے خبر لیلیٰ وارثی اپنا فلسفہ جھاڑ رہی تھی۔

''جٹ جی! کچھ مرد ایسے ہوتے ہیں جوں جوں عمر آگے بڑھتی ہے، کم عمر سے کم عمر لڑکی مانگنے لگتے ہیں۔ پتا نہیں کس حکیم جالینوس کی ناجائز اولاد نے یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ کم عمر لڑکی، مرد کے گزرے دس سال واپس لوٹا دیتی ہے۔''

وہ چینی بھی اسی قبیلے کا ہے، سولہ سولہ سال کی دو لمبی، تڑنگی روسی لڑکیاں پہلے سے اس کے ساتھ ہیں۔ پھر بھی اس کی ہوس کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہے مجھے تو اس بچاری پر ترس آ رہا ہے۔'' اس نے مدھم خراٹے لیتی لڑکی پر ایک ترحم آمیز نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اسے بچانے کی کوئی کوشش کرو!'' میں نے اپنی کیفیت پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنے دونوں کانوں کو باری باری ہاتھ لگایا۔ ''نا بابا نا! مجھے اپنی اور بچیوں کی جانیں یہاں سے سلامت لے کر جانا ہے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' پھر اس نے اچانک میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے حد خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔ ''کہیں...... آ...... آپ تو ایسا سوچ نہیں رہے؟ اڑتی اڑتی کہانیاں سنی ہیں کہ آپ...... آ۔......'' وہ تذبذب کا شکار ہو کر چپ کر گئی۔ اسے مناسب الفاظ نہیں سوجھ رہے تھے۔

میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ خدائی فوجدار قسم کی کوئی چیز بن گئے ہیں۔ ہر ظالم کا پنجہ مروڑنے کے لیے آپ کے ہاتھ آگے کو پھیل جاتے ہیں۔

میں نے اسے مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔

''کہانیاں زیادہ تر بے پر کی ہی اڑائی جاتی ہیں۔ میں تو خود مصیبت کا مارا ہوں۔ اس بچاری کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

وہ مطمئن نہیں ہوئی اور خوفزدہ سی آواز میں بولی۔ ''یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ مار دینا اور مر جانا ان کے لیے محض کھیل ہے۔''

میری پیشانی پر پڑتی سلوٹ دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔ ''میں آپ کو ڈرانے کی کوشش نہیں کر رہی میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں تو بہتر ہے۔''

''تمہارا بغیر نکاحی داماد کہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا میرے لیے فی الحال مناسب نہیں ہے۔''

وہ بے مزہ ہونے کی بجائے قدرے شوخ ہوئی۔ ''ہمارے کوٹھے سے آپ کا تعلق جڑا رہتا تو بغیر نکاحی داماد آپ ہوتے۔'' پھر اس کی نگاہوں کا زاویہ بدلا اور ساتھ ہی موضوع بھی یکدم تبدیل ہو گیا۔ ''جٹ جی اک بات پوچھوں؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ آپ کو ایکدم کیا ہو گیا تھا۔ میرا مطلب ہے عورت بازی سے آپ نے رخ موڑ لیا۔ میں خاصی باخبر عورت ہوں۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسی۔ ''لاہور کے کسی کوٹھے پر آپ کبھی نظر نہیں آئے۔ ٹیکسالی کے کنجروں سے مار پیٹ بھی چھوڑ دی۔ کسی بدمعاش سے بھی متھا نہیں لگایا۔ حرام خور تاجروں اور ذخیرہ اندوزوں سے بھتا لینا بھی ختم کر دیا۔ شیری بتا رہی تھی کہ آپ اب شراب بھی نہیں پیتے۔ یہ سب تبدیلی اچانک کیسے آ گئی؟ کہیں کوئی عشق مشک تو نہیں ہو گیا آپ کو؟'' اس نے ذومعنی انداز میں خیال آرائی کی۔

آہ...... یہ الفاظ نہیں تھے لوہے کے ناخن تھے

جنہوں نے پل بھر میں میرے سارے زخموں پر آئے کھرنڈ کو کھرچ دیا تھا۔ جہاں سے بڑی تیزی کے ساتھ خون رسنے لگا تھا۔

بظاہر میری حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا البتہ وہ ستارہ آنکھوں والی لڑکی چھم سے آنکھوں میں اتر آئی تھی جو جناح گارڈن میں اردگرد کے لوگوں کی پروا کیے بغیر مجھ سے لپٹ گئی تھی اس کی آنکھوں سے آنسو شفاف موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔ جو ہچکیوں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

''یہ تم کس راہ پر چل نکلے ہو کمال! لوٹ آؤ' لوٹ آؤ' میری خاطر کمال' واپس آجاؤ۔ میرے لیے آج بھی تم وہی کمال ہو جو میڈیکل کالج میں ہوتے تھے۔''

مجھے بانہوں میں جکڑے وہ بڑے والہانہ انداز میں میرے سینے کے ساتھ اپنا چہرہ رگڑ رہی تھی اور اردگرد موجود لوگ بڑے اچنبھے سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ایک لمحے سے بھی کم وقت میں وہ منظر میرے ذہن کی اسکرین پر ابھر کر غائب ہو گیا تھا۔ تمام تر کوشش کے باوجود میری آنکھوں میں سرخی اتر آئی تھی۔ میں نے بمشکل کہا ''ایسا کچھ نہیں' بس گناہ کی زندگی سے دل اکتا گیا ہے۔''

وہ گھاگ عورت سمجھ گئی کہ یہ موضوع میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے' اس نے فوراً پینترا بدلا۔ ''آپ آرام کریں تو بہتر ہے۔ میں گرم دودھ دیتی ہوں' آپ کو۔'' اس نے اپنا بستر چھوڑا۔

میں نے بھی کمبل میں اوجھل ہو جانا بہتر جانا۔ لیلیٰ وارثی کا تھمایا دودھ کا گلاس میں نے زہر کی مانند حلق سے اتارا اور دوبارہ کمبل تان لیا۔ ماضی قریب پھر میرے سامنے کھل رہا تھا۔

☆☆☆

مجھے معلوم نہیں' میں کیسے اپنے گاؤں پہنچا تھا۔ وحشت کی سرخ چادر نے مجھے مکمل طور سے ڈھانپ رکھا تھا۔ میری آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہیں ٹپکا تھا۔ البتہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آنکھوں میں صحرا کی گرم ریت بھر گئی ہو۔

پورے گاؤں کو خوف وہراس کی نادیدہ چادر نے لپیٹ رکھا تھا۔ پولیس کی بھاری نفری علاقے میں پہنچ چکی تھی۔

گھر تک پہنچتے پہنچتے چاچا رمضیٰ' مجھے سارے دلخراش واقعات سنا چکا تھا۔

بیگھے ملوں کی خاموشی طوفان سے پہلے والی خاموشی ثابت ہوئی تھی۔ ایک رات انہوں نے ہمارے مچھلی فارم پر پہرہ دینے والے برادری کے چند نوجوانوں پر بلا بول دیا۔ ان نوجوانوں میں صابر کا چھوٹا بھائی بھی تھا۔

بیگھے مل تعداد میں زیادہ اور جدید ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ پہرہ دینے والے چاروں نوجوانوں پر انہوں نے قابو پا کر شدید تشدد کیا اور زہر سے بھرا ڈرم مچھلی فارم کے تالاب میں ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ بھنگڑے ڈالتے وہاں سے فرار ہو گئے۔

اس کے فوراً بعد ہماری برادری کے لوگوں کا بیگھے ملوں سے تصادم ہوا۔ وہ پہلے سے تیار تھے۔ دونوں اطراف سے خاصے لوگ زخمی ہوئے۔ جن میں ہماری برادری کے افراد زیادہ تھے۔ صبح سویرے میرے والد صاحب اور میجر صاحب ڈی' پی' او کے پاس جا رہے تھے کہ پہلے سے گھات میں بیٹھے میاں ذوالفقار کے چاچا کے بیٹے میاں افتخار اور میاں امجد نے اپنے تین وفادار اشتہاریوں کے ساتھ ان کی گاڑی پر اندھا دھند

فائرنگ کر دی۔

جدید ہتھیاروں سے ہونے والی اس شدید ترین فائرنگ کے سبب گاڑی اپنے سواروں سمیت چھلنی ہو گئی۔ میرے والد اور میجر صاحب کے علاوہ ڈرائیور بھی موقع پر جاں بحق ہو گیا تھا۔ اسی کیس میں میاں ذوالفقار اور میاں امجد' چنگڑوں کی لڑکی کے اغوا کیس میں پہلے ہی پولیس کو مطلوب تھے اسی کیس میں میاں ذوالفقار جیل یاترا پر تھا۔ اس کا چالان عدالت میں پیش کیا جا چکا تھا۔

ماسٹر خیر دین اور مولوی انعام جو آپس میں گہرے دوست تھے اور فجر کی نماز کے بعد طویل چہل قدمی کے لیے نکلتے تھے اس سنگین واقعے کے چشم دید گواہ تھے۔

پہلے ہونے والے تصادم کی وجہ سے پولیس کی نفری علاقے میں پہنچ نہ پائی تھی کہ یہ واردات ہو گئی۔ میجر صاحب کا قتل کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پوری سرکاری مشینری حرکت میں آچکی تھی۔ پولیس کی بھاری نفری خون ریز تصادم کے خطرے کے پیش نظر بے حد سرعت کے ساتھ علاقے میں پہنچ چکی تھی۔

بیگھے مل اپنے بلوں میں جا چھپے تھے۔ گرفتاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

میں گھر پہنچا تو ماں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ نگہت نے دیواروں سے سر ٹکرا کر خود کو زخمی کر لیا تھا۔ عورتیں اسے سنبھالنے میں لگی تھیں۔

برادری کے مردوں نے مجھے گھیر لیا۔ ہر آنکھ میں آنسو تھے۔ مگر میری آنکھوں میں صرف آگ تھی اور وجود میں آتش فشاں دہک اٹھے تھے۔ میرے سامنے باپ کا گولیوں سے چھلنی جسم تھا اور اس کے قاتلوں کے چہرے۔

خدا جانے میں کیسے اپنے حواس قائم رکھے ہوئے تھا۔ میری برداشت اپنی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا ابھی رائفل پکڑ کر بیگھے ملوں کی حویلی میں گھس جاؤں اور سامنے آنے والے ہر ذی روح کو موت کے گھاٹ اتار دوں یا پھر خود ان کی گولیوں کا نشانہ بن جاؤں۔

مگر یہ محض مجنونانہ خیالات تھے بیگھے مل اپنے بلوں میں چھپے پڑے تھے۔ تصادم روکنے کے بہانے پولیس بھی ان کی حفاظت ہی کر رہی تھی اور وہ خود بھی کچھ کم نہیں تھے۔

ہاں...... اس وقت کوئی نادیدہ ہستی میرے وجود میں چلا چلا کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ میرے شب وروز یکسر تبدیل ہونے والے ہیں۔ قلم' کتاب کی جگہ میرے ہاتھوں میں آتشیں ہتھیار ہوں گے خوشبو میں بسا رہنے والا کمال اب بارود کے دھواں میں چھپا رہے گا۔ وہ ہاتھ جو زخم سینا سیکھ رہے ہیں اب جان لیوا زخم لگایا کریں گے۔

باپ کی میت کے پاس کھڑا کمال یکسر ایک نئی دنیا کا باسی ہو گا...... ہاں اسی وقت یہ فیصلہ ہو گیا تھا۔ ہماری برادری کے چھوٹے بڑوں میں بے حد غم وغصہ پایا جا رہا تھا۔ ہر طرف خون کا بدلہ خون کی پکار تھی۔ جاں بحق ہونے والا ڈرائیور بھی ہماری برادری کا تھا۔

میجر صاحب کے بیٹے بھی پاکستان پہنچنے والے تھے۔ یقیناً آنے والا وقت بیگھے ملوں پر بھاری پڑنے والا تھا۔

شوکے نے مجھے ایک طرف لے جا کر رازداری سے کہا۔ ''بھرا جی! چار چھوکرے تیار ہیں۔ چاچے کو مٹی دینے سے پہلے بدلہ چکا دیتے ہیں۔'' اس کا انداز بے حد جوش بھرا تھا۔

پل بھر میں یہ جوش میرے سینے میں بھی منتقل

ہوگیا۔ ”ٹھیک ہے“ میں نے اسے گلے سے لگایا۔ میرا جسم دھیرے دھیرے لرزنے لگا تھا۔

شوکے نے اسی انداز میں کہا۔ ”باقی تو سارے حرامی چھپے ہیں، پولیسیئے بھی ہر طرف پھیلے ہیں۔ باقیوں کو تو بعد میں دیکھ لیں گے۔ فی الحال ایک بندہ کل گرا دیتے ہیں۔“

”کسے.....؟“

”میاں ذوالفقار کو.....“ شوکے نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”کل اس کی پیشی ہے، حرامی کو عدالت میں ہی بھون دیتے ہیں۔“

مجھے قدرے مایوسی کا احساس ہوا، اصل قاتل تو کہیں چھپے ہوئے تھے مگر بیگھے ملوں کو جواب دینا بھی تو ضروری تھا۔ میرا باپ مٹی میں چھپنے جا رہا تھا، بیگھے ملوں میں سے بھی تو کسی نہ کسی کو اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔

جو کہرام ہمارے گھر برپا تھا۔ وہی بیگھے ملوں کی حویلیوں میں بھی تو برپا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے گرین سگنل دے دیا۔ شاید آپ کو بتانا بھول گیا ہوں کہ شوکا ہماری برادری کا بے حد جوشیلا اور ہتھ چھوڑ نوجوان تھا اور میرے والد اور میجر صاحب کے ساتھ جاں بحق ہونے والا ڈرائیور اس کا بہنوئی تھا۔

شوکے نے مجھے رازداری برتنے کا کہا اور شام کو ملنے کا کہہ کر علیحدہ ہوگیا۔

میں اپنی ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور شدید صدمے کے زیراثر وہ غشی کی کیفیت میں تھی۔ ایک عورت انہیں پانی پلانے کی کوشش کررہی تھی۔

اسی وقت ماں جائی، ایک ولدوز چیخ کے ساتھ میرے سینے سے آ لگی۔ اس کی آہ و بکا آسمان کا سینہ شق کررہی تھی۔

اس وقت شاید زندگی میں آخری دفعہ میری آنکھوں میں آنسو چمکے تھے۔ مگر انہیں بہنے سے پہلے میں نے بری طرح سے مسل دیا تھا۔

نگہت کو بڑی مشکل سے مجھ سے علیحدہ کیا گیا۔ میرے ایک رشتے کے چاچا نے مجھے کہا کہ علاقے کا ایس، پی بنفس نفیس تھانے میں موجود ہے اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے چند بزرگوں کے ساتھ تھانے کی راہ لی۔ راستے ہی میں مچھلی فارم پڑتا تھا۔ میرے بوجھل قدموں کا رخ اس طرف ہوگیا۔

آہ..... یہ مچھلی فارم تو نہیں تھا۔ یہ تو ہماری آرزوؤں اور خوشیوں کا قبرستان تھا۔ ہزاروں مری ہوئی مچھلیاں الٹی ہوکر سطح آب پر تیر رہی تھیں اور کتوں کا ایک پورا قبیلہ اس بات سے بے خبر کہ یہ مری ہوئی مچھلیاں زہریلی ہیں ان پر ٹوٹا پڑا تھا۔

ہمیں دیکھ کر کتے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

میری آنکھوں کی جلن بڑھ گئی تھی۔ میں کچھ دیر وہاں حسرتوں کا ماتم کرتا رہا پھر تھانے چلا گیا۔ حوالات داخلی گیٹ کے قریب ہی تھی۔ مجھے حوالات میں بیگھے ملوں کے کئی نوکر چاکر نظر آئے جو کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے مگر کوئی ان کی فیملی کا بندہ نظر نہیں آیا۔

صرف مجھے اور احمد چاچا کو ایس، پی صاحب تک رسائی دی گئی۔ ایس، ایچ، او کے کمرے میں ایس، پی سراج رانجھا کے ساتھ ایس، ایچ، او رانا نوید بھی موجود تھا۔

ایس، پی اونچا لمبا اور بھاری بھرکم تھا جس کے کرخت چہرے پر نظر کی عینک تھی۔ رانا نوید درمیانی

قامت اور مضبوط جسم کا تھا۔ گول چہرہ اور بڑی بڑی سرمہ لگی آنکھیں۔ وہ ایک تشدد پسند پولیس والا تھا۔ میرے بزرگوں نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا کہ رانا نوید ڈھکے چھپے انداز میں بیگھے ملوں کی امداد کررہا ہے۔

دونوں پولیس افسران میرے ساتھ بڑی نرمی سے پیش آئے اور رسمی افسوس بھی کیا۔ اس کے بعد ایس، پی، گویا ہوا۔

”تم پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ میں امید کرتا ہوں کہ قانون کے ساتھ مکمل تعاون کرو گے۔“

میں خاموش رہا، البتہ سینے میں کچھ جلنے لگا تھا۔ ایس، پی نہیں جانتا تھا کہ میں قانون کے ساتھ کس طرح کا ”تعاون“ کرنے جا رہا تھا۔

اس تمہید کے بعد ایس، پی نے مزید کہا۔ ”تمہارے باپ اور میجر صاحب کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا اب قانون کی ذمہ داری ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری برادری کے کچھ نوجوان قانون کو ہاتھ میں لے چکے ہیں۔ نقصان دونوں طرف ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مزید خون خرابہ ہو۔“

”مگر بیگھے ملوں کی طرف سے کسی کی جان تو نہیں گئی۔“ میرا خون ابلنے لگا۔ ”میرے باپ کو تو بزدلوں نے گھات لگا کر مارا ہے۔“

”جان سے مارنے کی کوشش کرنا بھی معمولی جرم نہیں ہے۔“ رانا نوید نے قدرے کڑوے انداز میں کہا۔ ”تمہاری برادری کے لوگوں نے قانون کو ہاتھ میں لیا ہے۔ بیگھے ملوں کے ایک بندے کی حالت نازک ہے۔ اسکور برابر بھی ہوسکتا ہے۔“

”بندے تو ہمارے بھی زخمی ہیں۔“

ایک لمحے کے لیے محض ایک لمحے کے لیے رانا نوید کی گھنی مونچھوں میں چھپے باریک ہونٹوں پر بڑی کینہ توز مسکراہٹ چمکی۔ ”جارح تمہاری برادری کے لوگ تھے۔ بیگھے ملوں نے تو صرف اپنا دفاع کیا ہے پھر بھی ہماری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے۔ میں نے کراس پرچوں کی سفارش کی ہے۔“ اس نے مودبانہ سا اشارہ ایس پی کی طرف کیا۔ میرے سینے پر جلتی آگ پر کسی نے جیسے پٹرول چھڑک دیا۔

اور ہمارے مچھلی فارم کے تالاب میں زہر انڈیلنا تو بیگھے ملوں کی جانب سے خیر سگالی کا اظہار تھا نا!“ آگ پہلی دفعہ میری زبان تک پہنچی تھی۔

رانا نوید کی بڑی بڑی آنکھوں میں طیش کی سرخی در آئی۔ میرا لہجہ اس کے لیے یقیناً ناقابل برداشت تھا۔

”تالاب میں زہر ڈالنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم لوگ بیگھے ملوں پر چڑھ دوڑو اور ابھی تو تفتیش چلے گی واقعی یہ بیگھے ملوں کا کام تھا..... یا تمہاری برادری کی باہمی چپقلش؟“ اس نے خود پر کنٹرول رکھتے ہوئے بڑے معنی خیز انداز میں کہا۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا میری برداشت کی حد ختم ہونے والی ہے۔ میری کیفیت کو بھانپ کر احمد چاچا نے دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے گویا ہوئے۔ ”پہل بیگھے ملوں کی جانب سے ہوئی تھی۔ رانا صاحب! انہی کا جتھا مچھلی فارم پر حملہ آور ہوا تھا۔ ہمارے لڑکوں کو باندھ کر مارنے کے بعد انہوں نے مچھلی تالاب میں زہر ڈالا تھا۔ پھر ان کی آواز بھی رفتہ رفتہ بلند ہونے لگی۔ ”اس ظالمانہ جارحیت کے درجن بھر معزز گواہ ہیں، مناسب یہ ہے کہ آپ تفتیش صحیح رخ پر کریں۔ قتل ہمارے لوگ ہوئے ہیں، پہلے حملہ ہمارے بندوں اور مچھلی تالاب پر ہوا ہے۔ بے شک ہمارے کچھ جذباتی لوگوں نے قانون کو ہاتھ میں لیا ہے، کراس پرچوں میں اس

معاملے کو بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے آپ لوگ بھائی جمال اور میجر صاحب کے قاتلوں کو تو گرفتار کریں۔"

اس موقع پر ایس پی رانجھا نے مداخلت کی۔ "تم لوگ بے فکر رہو۔ اس سارے معاملے کو ہم میرٹ پر دیکھ رہے ہیں۔ بیگھے ملوں کی ہم نے گرفتاریاں بھی کی ہیں۔"

میں خود کو مداخلت سے باز نہیں رکھ سکا۔ "یہ سارے زرخرید ہیں۔ بے شک انہیں چھوڑ دیں۔ گرفتار کرنا ہے تو بڑے میاں اور دیگر نامزد ملزمان کو کریں۔"

ایس پی نے مجھے کڑے تیوروں سے گھورا۔ اپنے "صاحب" کی نظریں بدلتے ہی رانا نوید بھی بے قابو ہوگیا۔

"ہمیں قانون نہ پڑھا!" وہ پھنکارا۔ "ان کی طرف سے نامزد گرفتاریاں نہیں ہوئیں تو تم بھی "نامزد ملزم" ہونے کے باوجود ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھے ہو۔"

"کمال کس سلسلے میں نامزد ہوگیا ہے؟" احمد چاچا نے اچنبھے سے پوچھا۔

رانا نوید نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "بیگھے ملوں کے جن دو ڈیروں پر حملہ ہوا تھا، ان میں بیگھے ملوں نے تمہارے دیگر لڑکوں کے ساتھ اسے بھی نامزد کیا ہے۔"

مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں تھوڑی دیر اور یہاں بیٹھا رہا تو میرا وجود دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ احمد چاچا نے قدرے تلخ انداز میں کہا۔ "مگر یہ تو یہاں تھا نہیں ...... یہ بات آپ بھی جانتے ہیں۔"

رانا نوید نے عادتاً مونچھوں کا ایک کونا موڑا۔ "یہ تو گرفتاریوں کے بعد دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگا۔ ہم نے تو دونوں طرف سے قانونی تقاضے پورے کرنے ہیں۔"

"ہمیں تھانے بلانے کا مقصد بھی بیان کر دیں۔" ٹھنڈے مزاج کے احمد چاچا بھی بمشکل خود پر قابو رکھے ہوئے تھے۔

رانا نوید نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سامنے پڑی فائل میں سے ایک کاغذ نکال کر احمد چاچا کی طرف بڑھایا۔ "نماز جنازہ کے بعد ان لوگوں کو پیش کر دیں یہ صاحب کے سامنے آپ کے لیے ہمدردانہ مشورہ ہے۔ بصورت دیگر قانون اپنی تمام تر سختی کے ساتھ حرکت میں آ جائے گا۔"

میں نے احمد چاچا کے ہاتھ سے وہ کاغذ لے لیا۔ سرفہرست میرا نام تھا۔ پھر صابر اور شوکے وغیرہ کے نام تھے۔ دو تین آتش مزاج بزرگوں کے نام بھی تھے۔ یہ کل بیس افراد کی فہرست تھی۔

میں نے وہ فہرست رانا نوید کے سامنے رکھی۔ "اور جن افراد کو ہم نے نامزد کیا ہے؟"

جواب ایس پی کی طرف سے آیا۔ "ایسی ہی ایک لسٹ بڑے میاں کو بھی دے دی گئی ہے۔ انہیں بھی چوبیس گھنٹے کی مہلت دی گئی ہے۔"

لسٹ میں نے وہیں میز پر چھوڑ دی تھی۔ رانا نوید نے بڑی جلتی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ واپسی پر میرا دماغ کھولتی ہانڈی کی مانند ابل رہا تھا۔ میرے ساتھ جانے والے بزرگوں کا حال بھی مجھ سے مختلف نہیں تھا۔

مجھے معلوم ہوا کہ رانا نوید کا تبادلہ بھی اس تھانے میں بیگھے ملوں نے کروایا تھا۔ اس کے چاچا کی ایک بیٹی بیگھے ملوں میں بیاہی ہوئی تھی۔ ایک طرح سے وہ رشتے دار بھی تھے۔ اس کے علاوہ ایک پولیس اہلکار کو والد صاحب نے مچھلی کے چند دانے دینے سے بھی انکار کیا تھا۔ وہ اہلکار رانا نوید کا اردلی تھا۔ وہ

پرخاش بھی رانا نوید کے دل میں تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل میں رکھنے والا کینہ توز بندہ تھا۔

اسی پل میں نے ایک بہت بڑا فیصلہ کرلیا۔ میرا وجدان چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ میرے شب و روز یکسر تبدیل ہونے والے تھے۔

اسی شام مرے ہوئے باپ اور بے ہوش پڑی ماں کی چارپائیوں کے درمیان، ساری برادری کے سامنے میری زبردست خواہش کے پیش نظر روتی بلکتی نگہت کا نکاح صابر کے ساتھ کر دیا گیا۔ دیکھنے والے میرے اس فعل کو بڑی دوررس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک چاندنی رات تھی۔ ہر طرف چاندنی کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی راتیں مجھے بے خود کر دیتی تھیں۔ مگر آج میرے دل و زندگی میں گہری تاریکی اتری تھی۔ چاندنی رات کا فسوں مجھے زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

قصبے سے باہر ایک ریتلا اور خاصا اونچا ٹیلا تھا۔ جو آسیب زدہ مشہور تھا۔ رات کو اس طرف آتے ہوئے لوگ گھبراتے تھے۔

اس آسیب زدہ ٹیلے پر میں نیم دراز تھا۔ میرے قریب اے کے 47 رائفل پڑی ہوئی تھی۔ میری انگلیاں آج پہلی دفعہ اس کے لمس سے آشنا ہو رہی تھیں۔

میرے ساتھ شوکا، علی اور بابو تھے۔

رانا نوید کی فہرست میں میرے اور صابر کے بعد انہی تینوں کے نام تھے۔ ساری پلاننگ انہوں نے کرلی تھی۔

بابو ہتھیاروں کے معاملے میں زیادہ ماہر تھا۔ اس وقت وہ مجھے اے کے 47 کے استعمال کا طریقہ سمجھا رہا تھا۔ "بھراجی یہ بڑی قاتل شے ہے۔ بس اس کالے منہ والی بلا کا رخ دشمن کی طرف کر کے ٹریگر دبا دو۔ اٹھائیس گولیاں بارش کے قطروں کی طرح اس کے جسم پر برسنے لگیں گی۔ بندے زیادہ ہوں تو ٹریگر دبا کر اسے یوں گھماؤ" اس نے رائفل کو دائیں، بائیں گھماتے ہوئے کہا۔ "بس اسے یہاں سے مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے رائفل لی، رائفل کے فولادی لمس نے سینے میں جلتی آگ کو مزید فروزاں کر دیا۔ مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ ہاتھ میں طاقتور ہتھیار ہو اور جگر میں اسے بے دریغ استعمال کرنے کی طاقت تو بڑے سے بڑا اور طاقتور دشمن محض ایک مچھر کی طرح محسوس ہوتا ہے۔

میں رائفل کے استعمال کا بنیادی طریقہ جان گیا تھا۔ میں نے سیفٹی کیچ ہٹایا اور رائفل کی نال ایک درخت کی شاخوں کی طرف بلند کی اور بابو کی ہدایت کے مطابق مضبوطی سے تھام کر ٹریگر دبا دیا۔

ایک دھماکے سے گولی چلی اور پرسکون چاندنی رات کا سارا سکون درہم برہم ہوگیا۔ ہاتھ کے ساتھ ساتھ میرے کان بھی سنسنا اٹھے تھے۔

بابو نے دھیرے سے میری پیٹھ تھپکی۔ "کمال کر دیا بھراجی" اس نے توصیفی انداز میں کہا۔ "پہلی دفعہ اتنا فٹ فائر تو میں نے بھی نہیں کیا تھا۔"

علی نے قدرے متوحش انداز میں کہا۔ "پورا پنڈ پولیسیوں سے بھرا پڑا ہے۔ گولی کی آواز نے ان کے کان کھڑے کر دیئے ہوں گے۔ گشتے اس طرف چل نہ پڑیں۔"

"آنے دے...... بابو نے بے پروائی سے کہا۔ "آغاز ہی پولیس مقابلے سے ہو جائے گا۔"

اسی وقت ایک طویل قامت سایہ ٹیلے پر نظر آیا۔ بے اختیار میری رائفل کا رخ اس کی طرف ہوا۔

"خیال سجن جی خیال! یہ میں ہوں۔"

میں نے رائفل جھکائی۔ آنے والا وجاہت عرف ہیرا تھا۔ شوکے نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ شامل ہے۔ اسی کی منگیتر کے اغوا کے جرم میں تو میاں ذوالفقار جیل میں تھا۔

ہیرا چوڑے شانوں، مضبوط جسم اور لمبے قد کا خوبرو نوجوان تھا۔ چہرے پر خون کی سرخی، آنکھوں میں چمک، میں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت اٹھ کر اسے سینے سے لگایا۔ شاید "دردِ مشترک" کا رشتہ تھا۔ میری طرح وہ بھی تو بیگھے ملوں کے ظلم کا شکار ہوا تھا۔ اس کا درد شاید مجھ سے سوا تھا۔

اس کی غیرت و عزت کو نہ صرف اغوا کر لیا گیا تھا بلکہ اس کا ابھی تک کچھ پتا بھی نہیں تھا۔

خدا جانے وہ معصوم زندہ بھی تھی یا بیگھے ملوں کے ظلم و ستم برداشت نہ کرتے ہوئے یہ دنیا چھوڑ گئی تھی۔

وجاہت کے آنے کے بعد میاں ذوالفقار کو لڑھکانے کا پروگرام دوبارہ سے دہرایا گیا۔

پلان شوکی کا تھا۔ اس کا کچہری آنا جانا تھا۔ احاطہ عدالت میں پانی کی ایک ٹینکی تھی۔ جس پر لیٹ کر سب کی نظروں سے چھپا جا سکتا تھا۔

پلان تھا کہ ایک بندہ اس ٹینکی پر رائفل سمیت لیٹ جائے، وہاں سے وہ بخشی خانہ قریب تھا جہاں سے جیل سے لائے جانے والے حوالاتیوں کو لا کر رکھا جاتا تھا اور وہاں سے باری آنے پر نکال کر عدالت میں پیش کیا جاتا تھا۔

پلان کے مطابق جیسے ہی میاں ذوالفقار کو بخشی خانے کی طرف لایا جائے۔ ایک برسٹ اس کے سینے میں اتار دیا جائے۔

پلان تو قابلِ عمل تھا مگر دیگر بے گناہ افراد جو میاں ذوالفقار کے اطراف ہوں گے ان کا گولیوں کی زد میں آنے کا قوی امکان تھا۔

میرے اس اعتراض کے جواب میں شوکے نے کہا۔ "رسک تو لینا پڑے گا بھراجی! میرا تو دل تھا اس کمبخت کے سینے میں گولیاں آپ اتاریں مگر آپ کا ہاتھ کچا ہے۔" پھر اس نے بابو کے کندھے پر ہاتھ پھیلائے۔ "یہ کام یہ شہزادہ کرے گا۔ ہم اس کے لیے راستہ صاف کریں گے۔ بابو نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنی رضامندی ظاہر کی۔

اچانک ایک خودسری اور جذباتیت کی بلند و بالا لہر میرے اوپر سے گزری اور شرابور کر گئی۔ میں نے کہا۔

"گھات لگا کر بزدلوں کی طرح حملہ کرنے کے بعد ہمارے اور بیگھے ملوں کے درمیان کیا فرق رہ جائے گا۔ ہم اسے للکار کر اور اپنے ہاتھوں سے ذبح کریں گے۔"

جذباتیت کے زیرِ اثر میری آواز لرز رہی تھی۔

سب نے بڑے اچنبھے سے میری طرف دیکھا۔ پل بھر میں میرے سینے میں کروٹ لینے والی خودسری میرے ساتھیوں کے سینے میں بھی منتقل ہو گئی۔

وجاہت، مجھ سے آ لپٹا "اوئے جٹا! سینے وچ اگ لا دِتی اوئے" اس نے جذبات کے اظہار کے لیے بے اختیار مادری زبان استعمال کی تھی۔

چاروں جاں نثار میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ میں صرف ایک دفعہ کچہری گیا تھا۔ مٹے مٹے نقش کو شوکے کی رہنمائی نے مکمل کر دیا۔

میں نے چند منٹوں میں نیا پلان بنا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ میاں ذوالفقار کو خنجروں سے چیرنے کا کام میں نے اور وجاہت نے انجام دینا تھا۔ باقی جاں نثاروں نے ہمیں بیک اپ دینا تھا۔ میرے پلان نے سبھی میں ہیجان دوڑا دیا تھا وہ متفق ہو گئے۔

ہتھیاروں کے نام پر ہمارے پاس اے کے 47 ہی سب سے اہم تھی۔ اسی کے گرج دار برسٹوں نے خوف و ہراس پھیلا کر ہمارے بحفاظت کچہری سے نکلنے کی راہ ہموار کرنی تھی۔ باقی دو عدد درہ میڈ تمیں بور تھے۔

وجاہت نے اپنے لباس میں پوشیدہ ایک آب دار خنجر نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ آپ رکھ لو گھر میرے پاس دوسرا بھی ہے۔"

میں نے خنجر تھاما۔ میری اور وجاہت کی نظریں ملیں...... اس کی چمکدار آنکھوں میں بجلیاں چمک رہی تھیں۔

رات کے آخری پہر میں نے باپ کی نمازِ جنازہ پڑھی اور علامتی کندھا دیا۔ سپردِ خاک دن چڑھے ہونا تھا۔ جو میں کرنے جا رہا تھا...... اس کے بعد میں بھلا کہاں باپ کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کر سکتا تھا۔

ماں کی پیشانی چومی، اور نگہت کو پیار کر کے صابر کے ساتھ رخصت کر دیا۔ صابر منظر سے ہٹنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ میں نے زبردستی اسے بھیجا۔ نگہت رو رو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔

برادری کے بزرگ اندازہ لگا چکے تھے کہ میں کچھ خاص کرنے جا رہا ہوں۔ ایک، دو نے دبے انداز میں مجھے روکنے کی کوشش بھی کی تھی مگر میں خود بھی چاہتا تو خود کو نہیں روک سکتا تھا۔

بہرحال میرے ممکنہ فعل کی طرف سے تشویش کے سبب برادری کے لوگ چوکنا ضرور ہو گئے۔ اب وہ بیگھے ملوں کے کسی بھی ردِعمل کا بہتر طریقے سے سامنا کر سکتے تھے۔

صبح آٹھ بجے سے قبل ہی کچہری پہنچ گئے۔ کرائے پر لی گئی ایک پرانی سی گاڑی میں ہم لوگ آئے تھے۔ گاڑی کچہری کی اس بیرونی دیوار کے قریب پارک تھی۔ جسے ہم نے پھلانگ کر بھاگنا تھا۔ ان دونوں عدالتوں میں قتلِ عام کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لیے حفاظتی انتظام نہ ہونے کے برابر تھے۔

بابو ایک چھوٹے چاول کی ریڑھی کے گرد پڑی لکڑی کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے 47 اسی کے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ جس کے اوپر اس نے عام دیہاتیوں کی مانند ہلکی سی چادر ڈال لی تھی۔

اس نے مجھے اور وجاہت کو حرکت میں آتا دیکھ کر زبردستی ہوائی فائرنگ کرنی تھی۔ اس کے علاوہ ان پولیس اہلکاروں کی راہ بھی روکنی تھی جو گڑبڑ ہوتے ہی بخشی خانے کی طرف چارج کرتے۔

علی کے ذمے وہ دو رائفل بردار پولیس اہلکار تھے جو بخشی خانے پر تعینات تھے۔ وہ بھی پسٹل بدست بخشی خانے کے قریب ہی تھا۔ اس نے اس وقت حرکت میں آنا تھا جب وہ دونوں اہلکار ہماری طرف رائفلیں سیدھی کرنے کی کوشش کرتے۔

شوکا، اس دیوار کے قریب بنے عوامی باتھ روم کے قریب موجود تھا۔ جہاں سے ہم نے فرار ہونا تھا۔ اس کے ذمے ہمیں اس وقت تک بیک اپ رہنا تھا جب تک ہم چاروں دیوار کے قریب نہیں پہنچ جاتے۔

میں اور وجاہت گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے فائلیں کھولے اور ان میں سر کھپائے بیٹھے تھے۔ وہ کچی پگڈنڈی جو بخشی خانے کی طرف جاتی تھی اسی درخت کے پاس سے ہی گزرتی تھی۔ شوکے کے ذمے ایک اور بات بھی تھی۔ اس نے حوالاتیوں کو جیل سے لانے والی گاڑی کی آمد کی اطلاع بھی دینی تھی۔

ہر لحظے بعد میری نظر شوکے کی طرف اٹھتی تھی اور ساتھ ہی بابو اور علی کو بھی ٹٹول آتی تھی۔

انتظار کی گھڑیاں قیامت خیز ہوتی جارہی تھیں۔ لحظہ بھر بعد میری نظر شوکے کی طرف اٹھتی۔ وہ مسلسل سر کھجائے جارہا تھا۔ یہ مخصوص اشارہ تھا۔

ہیجان کی تند لہریں میرے وجود سے ٹکرانے لگیں۔ وجاہت کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں تھی۔ علی اور بابو بھی چوکنا ہوگئے تھے۔

قیدیوں کو لانے والی پولیس وین کچہری کے داخلی دروازے پر پہنچ گئی تھی۔

"چل میرے شیر تیار ہوجا!" اس وقت مجھے احساس ہوا کہ حیرت انگیز طور پر میری آواز بھی پرسکون تھی اور دل کی دھڑکن بھی۔

"میرے ساتھ خنجر بھی تیار ہے۔" وجاہت نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ اس کی آنکھوں کی چمک دوچند ہوگئی تھی۔

"میں سمجھتا ہوں دلیر اور جاں نثار ساتھی ساتھ ہو تو ہمت وحوصلہ دوچند ہوجاتا ہے۔ اس وقت میری یہی کیفیت تھی۔

ہماری نظریں اس پگڈنڈی پر جمی تھیں جہاں سے چل کر میاں ذوالفقار نے اپنے "مقتل" کی طرف آنا تھا۔

اچانک ہی میری تمام تر حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔ ایک چھوٹا سا ہجوم پگڈنڈی پر نمودار ہوا جو رفتہ رفتہ واضح ہونے لگا۔ سیاہ کوٹ، سیاہ وخاکی وردیاں، اور ایک بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار، میری رگوں میں خون ابلنے لگا۔ بے شک وہ میاں ذوالفقار تھا۔ گھنی مونچھوں کے نیچے پھیلی ہوئی خاندانی ناک سرخ گندمی رنگت، تنومند گردن جو اس پل بھی اکڑی ہوئی تھی۔ اور کانٹوں کی مانند سخت بال۔

اس کے ساتھ ایک وکیل تھا جو اس کی طرف جھکا رازونیاز کررہا تھا۔ میاں ذوالفقار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جو میرے تن بدن میں آگ لگا گئی۔

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی، جس کا سرا ایک پولیس اہلکار نے تھام رکھا تھا۔ ان کے پیچھے دیگر حوالاتی تھے اور دو رائفل بردار سپاہی سب سے آخر میں تھے۔ ان کی رائفلیں کندھوں سے لگی ہوئی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ ہڑبونگ میں وہ ہمیں نشانہ نہیں بنا سکیں گے۔ اس سے پہلے ہم اپنا کام انجام دے لیں گے۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوچکی تھیں۔ جیسے ہی میاں ذوالفقار درخت کے قریب پہنچا ہم دونوں بجلی کی مانند حرکت میں آئے۔

ہم دونوں کو خنجر بدست سامنے دیکھ کر میاں ذوالفقار کے چہرے پر موت کی زردی نے یلغار کی۔

وجاہت شیر کی مانند دہاڑا۔ "کلمہ پڑھ اوئے عزتوں کے قاتل! تیرا ٹائم پورا ہوگیا ہے۔" اسی وقت فضا فائرنگ کی زبردست آواز سے گونج اٹھی۔ بابو نے ہوائی فائرنگ شروع کردی تھی۔

اس کے ساتھ ہی ہم دونوں میاں ذوالفقار پر جھپٹے۔

اسی وقت میاں ذوالفقار کی ہتھکڑی تھامے پولیس اہلکار حیرت انگیز طور پر حرکت میں آیا اس کی دبلی پتلی ٹانگ وجاہت کے خنجر والے ہاتھ پر لگی اور خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ زوردار فائرنگ کے سبب ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی۔

وجاہت کے ہاتھ سے خنجر نکلتا دیکھ کر میاں ذوالفقار کے حواس جو پہلے خطا ہوچکے تھے لوٹ آئے اس کے زرد چہرے پر دوبارہ سرخی لوٹی اور ایک بڑک کے ساتھ وہ وجاہت پر جھپٹا۔ دبلے پتلے پولیس اہلکار نے اس کی ہتھکڑی چھوڑ دی اور میری طرف آیا۔

میرے وجود میں جو انگارے سلگ رہے تھے انہوں نے میرے وجود کو مہمیز دی میرے کندھے کی زوردار ٹکر نے سپاہی کو دور اچھال دیا۔

شدید ترین فائرنگ کے سبب ہر کسی کو اپنی جان کی پڑی تھی۔ ہتھکڑیوں میں جکڑے حوالاتی وہیں زمین پر لیٹ گئے تھے۔ ان کے عقب والے دونوں رائفل بردار سپاہی اپنی جان بچانے کے لیے انہیں چھوڑ کر کمرہ عدالت کے برآمدے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ جہاں سنگی ستونوں کی آڑ میسر تھی۔ میرے کندھے کی ضرب کھانے والا سپاہی زمین پر لیٹے حوالاتیوں پر جا گرا تھا۔

میں میاں ذوالفقار کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہتھکڑی کی ضرب وجاہت کے سر پر ماری تھی۔

وجاہت کا خون دیکھ کر میری آنکھوں کے سامنے خون رنگ چادر سی پھیل گئی۔ میں نے میاں ذوالفقار کو للکارا...... اس نے ٹھٹک کر میری طرف دیکھا۔ اسی وقت میرے ہاتھ میں دبا خنجر اس کی پسلیوں میں گج سے اتر گیا۔

سنسنی کے ساتھ طمانیت کی بھی ایک لہر تھی جو میرے ہاتھ سے شروع ہوکر پورے وجود میں پھیل گئی تھی۔ میاں ذوالفقار کے حلق سے نکلنے والی کرب انگیز چیخ نے میرے کانوں میں رس گھولا۔

اسی وقت فائرنگ تھم گئی۔ غالباً بابو کو میگزین تبدیل کرنے کی ضرورت پڑی تھی۔ اس کے پاس چار عدد فالتو میگزین تھے۔

اسی لمحاتی وقفے میں بخشی خانے کی طرف سے بھی دو سنگل شارٹ سنائی دیئے۔ لگتا تھا علی کو بھی مزاحمت کا سامنا ہوا ہے۔

یہ محض لمحوں کی بات تھی۔ خنجر ابھی تک میاں ذوالفقار کی پسلیوں میں تھا اور اس کا گرم خون میرے ہاتھ کو بھگو رہا تھا۔ میں نے خنجر کھینچا۔ پسلیوں کی کڑکڑاہٹ ابھری اور میاں ذوالفقار ذبح ہوئے بچھڑے کی مانند ڈکراتا ہوا زمین بوس ہوگیا۔

میں نے دیکھا کہ وجاہت کسی بلا کی مانند اچھل کر اس دبلے پتلے سپاہی سے لپٹ گیا تھا جو سنبھل کر دوبارہ میری طرف جھپٹ رہا تھا۔ خدا جانے اسے اپنے فرض نے جان پر کھیلنے کے لیے آمادہ کیا تھا...... یا بیگھے ملوں کے حق نمک نے۔ بہر حال جو بھی تھا اس کی دلیری قابل تحسین تھی۔

میں دوبارہ میاں ذوالفقار پر جھپٹا۔ وہ ایک ہاتھ سے زخمی پسلیاں دبائے ایڑھیاں رگڑ رہا تھا۔ اس نے میری صورت میں موت کا فرشتہ دیکھ لیا تھا۔ اپنے خون میں لت پت وہ چیخا تو اس کے حلق کا کوا تک مجھے نظر آیا۔

ایک دفعہ پھر فائرنگ شروع ہوگئی مگر یہ یکسر مختلف فائرنگ تھی۔ یہ فائرنگ مجھ پر ہوئی تھی۔ میرے قدموں کے قریب سے مٹی اڑی تھی۔

یہ فائرنگ کمرہ عدالت کے ستونوں کے پیچھے پناہ لینے والے رائفل بردار سپاہیوں کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ سنگل شارٹ تھے اور صاف طور پر میاں وجاہت کو بچا کر مارے گئے تھے۔ اس سبب میری بھی بچت ہوگئی تھی۔

میں نے خود کو زمین پر گرادیا۔ اچانک ہی دوبارہ بابو کی طرف سے زوردار فائرنگ شروع ہوگئی۔ اس کی حاضر دماغی نے میرے سینے میں اطمینان بھر دیا۔ اس

نے دیکھ لیا تھا کہ کہاں سے مجھ پر فائرنگ ہوئی ہے۔ اس نے عدالت کے برآمدے کے ستونوں پر برسٹ مارا تھا۔

مجھ پر فائرنگ کرنے والوں میں اس سیدھی فائرنگ نے کھلبلی مچادی۔ اب مزید یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس بات کو وجاہت نے بھی محسوس کیا تھا۔ اس نے نہ جانے کون سی ضرب گائی تھی کہ ''فرض شناس'' سپاہی اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے شرابی کی مانند جھوم رہا تھا۔

''نکل چلو یار! وجاہت نے ہیجانی انداز میں کہا اور اس دیوار کی طرف دوڑا جہاں سے ہم نے باہر نکلنا تھا۔ پلان کے مطابق باقی تینوں دوستوں کو ہمیں فالو کرنا تھا۔

میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ میاں ذوالفقار پر مزید وار کرنا اب ممکن نہیں تھا' مگر مجھے یقین تھا میری پہلی ضرب ہی اسے موت کی طرف دھکیل چکی تھی۔

میں نے آخری حربے کے طور پر دوڑتے ہوئے خنجر کو نوک سے پکڑا اور میاں ذوالفقار پر کھینچ مارا۔ حیرت انگیز طور پر میرا نشانہ درست لگا تھا۔ خنجر اس کے بازو کے اوپری حصے میں لگا تھا اور اس کی ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ خون کا ایک چھوٹا سا تالاب اس کے گرد بن چکا تھا۔

اس کی حالت دیکھنے کے درمیان میں نے ایک حیرت انگیز منظر بھی دیکھا۔ شرابی کی مانند جھومنے والا سپاہی ہمارے پیچھے بھاگا آرہا تھا۔

میں نے زیرلب اسے گالی دی۔ اس کی حماقت انگیز دلیری اسے موت کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میں یا میرے ساتھی اس کے بے گناہ خون سے ہاتھ رنگیں۔ میں نے علی کو دیکھا اس نے بخشی خانے کے محافظ سپاہیوں کو منہ کے بل زمین پر لٹا رکھا تھا۔ ایک سپاہی کی ٹانگ کے قریب خون پھیلا ہوا تھا۔ غالباً اس کی مزاحمت کا توڑ کرنے کے لیے علی نے اس کی ٹانگ میں گولی اتار دی تھی۔

بابو بھی فائرنگ کرتا ہوا قریب آ گیا تھا۔ ہمیں بیک اپ دینے والے شوکے نے عقب میں دوڑتے سپاہی پر فائر جھونک دیا۔

میں نے پریشانی کے عالم میں سر گھمایا اور یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ شوکے نے ''بچا'' کر فائر کیا تھا۔ سپاہی تڑپ کر عوامی باتھ رومز کے قریب خودرو جھاڑیوں میں جا گرا۔

''علی! پہلے تو نکل......!'' میں نے چلا کر کہا۔ اس کے کندھوں پر ان دو سرکاری رائفلوں کا بوجھ بھی تھا جو اس نے خاک نشین سپاہیوں سے چھینی تھی۔

پہلے علی کودا' گاڑی ڈرائیو کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔ اس کے بعد طویل برسٹ مار کر بابو اور پھر شوکا۔ سب سے آخر میں' میں دیوار پر چڑھا۔ میرے تینوں ساتھی گاڑی میں سوار ہو چکے تھے۔

اچانک ہی میری ٹانگ کو زوردار جھٹکا لگا اور میں واپس احاطہ عدالت میں جا گرا۔ مجھے ٹانگ سے پکڑ کر واپس کھینچنے والا وہی کم بخت سپاہی تھا۔ میرے نیچے گرتے ہی وہ جونک کی مانند مجھ سے لپٹ گیا تھا۔

اسی وقت میں نے بہت سے دوڑتے قدموں کی آواز سنی۔ بڑی بے دردی سے میں نے پہلے مدمقابل کی پسلیوں میں ضرب لگائی اور پھر اس کی آنکھوں میں انگلیاں ماریں۔ اس نے چیخ کر اپنی گرفت ڈھیلی کی۔ میں نے اسے دونوں پاؤں جوڑ کر دور اچھالا۔

میں سنبھل نہ پایا تھا کہ ایک قیامت خیز ضرب میرے سر پر لگی اور ایک غلیظ اور غیض و غضب سے بھری گالی میرے کانوں میں گونجی۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ایک اور طوفانی ضرب میرے پیٹ پر لگی اور میں زمین بوس ہو گیا۔ یہ وہ خاک نشین سپاہی تھا جن کے وزنی بوٹوں کی میں زد میں تھا۔

اگلی ضرب میں نے دونوں بازوؤں سے روکی اور خاکی پتلون والے کی ٹانگ کو سینے کے ساتھ لگا کر جھٹکا دیا۔ سپاہی ایک کراہ کے ساتھ میرے قریب گرا اور اس کے منہ سے گٹر بہہ نکلا۔

میں نے ایک موٹے سے سب انسپکٹر کو دیکھا۔ اپنے سرکاری اڑتیس بور سے اس نے چند فائر اس دیوار پر کیے جہاں سے میرے ساتھی کودے تھے۔ اب ان کے پاس مجھے چھوڑ کر فرار ہونے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں قریب پہنچ گئی تھیں۔ فضا زوردار فائرنگ سے گونج اٹھی تھی۔ مجھے بھیڑوں کی مانند خاکی وردی والوں نے ڈھانپ لیا تھا اور میرے جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں تھا جو ان کے غیض و غضب سے بچا ہوا تھا۔

میری آنکھوں کے آگے تاریکی چھا رہی تھی۔ مگر ایک عجیب سی خودسری تھی اور اسی خودسری کی دی ہوئی طاقت تھی کہ میرے لبوں سے ابھی تک آہ بھی نہیں نکلی تھی۔

بکھری ہوئی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ سر پر ایک اور ضرب لگی' کائنات میری نگاہوں کے سامنے الٹ پلٹ ہوئی اور پھر گہری تاریکی چھا گئی۔

❀......❀......❀
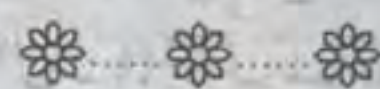
میں نیم تاریک حوالات کے ٹھنڈے فرش پر دراز تھا۔ جسم کا جوڑ جوڑ اور ہر عضو درد کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر میاں ذوالفقار کے فربہ جسم میں خنجر اتارتے ہوئے جو ارتعاش محسوس ہوا تھا۔ اس کا سرور اس درد سے سوا تھا کانوں میں ابھی بھی وہ موت کی خوف میں ڈوبی درد سے ڈکراتی اس کی چیخیں رس گھول رہی تھیں۔

مجھے یقین تھا کہ بگھے ملوں کی اونچی حویلیوں میں بھی کہرام برپا ہوگا۔ ایک جنازہ ''جتاں والی'' کے نیم پختہ گھر سے اٹھے گا تو دوسرا ظلم و جبر کی علامت حویلی سے۔

مجھے اپنے انجام کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔ شکر کا مقام تھا کہ میرے جاں نثار ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ حوالات کے سلاخ دار دروازے کے باہر ایک موٹا سا رائفل بردار سپاہی تعینات تھا جو مسلسل سگریٹ کے مٹھی بھر کر کش لگائے جا رہا تھا۔ جب بھی اس کی نگاہ میری طرف اٹھتی تھی' ایک آگ سی ان چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں نظر آتی تھی۔

میں اس آگ کی وجہ بخوبی جانتا تھا۔ ہماری کارروائی کے دوران اس کے ایک پیٹی بھائی نے ٹانگ پر گولی کھائی تھی۔ دوسرے کی میرے ہاتھوں خاصی درگت بنی تھی اور یہ بھی ممکن تھا بابو کی فائرنگ کا بھی کوئی نشانہ بن گیا ہو۔

یہ تھانے کا کوئی اندرونی حصہ تھا۔ بیرونی سرگرمی کی معمولی سی آواز بھی نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ بس' ایک سلاخ دار روشن دان سے وقت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ سورج ڈوب چلا ہے۔ میرے زندان میں ایک بیمار سی روشنی پھیلانے والا بلب پہلے سے روشن تھا۔

میرا پورا جسم پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔ ناک سے بہنے والا خون اوپری ہونٹ پر جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔

جبڑے بمشکل حرکت کر رہے تھے اور پسلیوں میں رہ رہ کر نوکیلی ٹیسیں ابھر رہی تھیں۔
میں نے بمشکل اٹھ کر ایک کونے میں دھرے بے حد غلیظ واٹر کولر سے گندے سے گلاس میں بساند انگیز پانی پیا تھا۔
مجھے احساس ہو رہا تھا کہ یہ خاموشی طوفان سے پہلے کی ہے مجھ پر بے حد کڑا وقت آنے والا ہے۔ مگر میں خائف بالکل نہیں تھا۔
آخر کار انتظار کی گھڑیاں اختتام پذیر ہوئیں۔ راہداری میں کئی وزنی قدموں کی گونج ابھری اور چار ہٹے کٹے پولیس اہلکار نمودار ہوئے۔
''باہر نکال اس ماں کے......'' ایک حوالدار نے گالی کے ساتھ کہا۔
گالی نے میرے وجود میں ابال پیدا کیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور میری نظریں اس حوالدار پر جم گئیں۔
''کیا گھورتا ہے......؟'' حوالدار نے طیش آمیز انداز میں آنکھیں نکالیں اور پھر گالی دی۔
شائستہ لہجے اور دھیمے انداز میں بات کرنیوالا کمال...... نہ جانے کہاں جا سویا تھا۔ وہ ''کمالا پتر'' جو گالی نکالنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اس نے جواباً ایک بھاری بھرکم گالی لڑھکا دی۔
حوالدار کا طیش کے مارے برا حال ہو گیا۔ چہرہ سرخ اور گردن کی رگیں پھول گئیں۔ ''کھول اوئے......'' اس نے پٹی بھائی کو بھی گالی دی۔ جو نجانے کہاں سے چابی نکال رہا تھا۔
میں سلاخ دار دروازے کے قریب چلا گیا۔ یہ غصہ گھر جا کر بیوی کو دکھانا مرد ہے تو اکیلا اندر آ جا...... تیری دم کاٹ کر تیرے منہ میں نہ دے دی تو کہنا۔''
میں نے دیکھ لیا تھا کہ بڑھے ہوئے پیٹ کے باوجود وہ مضبوط اور کسرتی جسم کا تھا۔ غالباً اسپورٹس ونگ سے تھا اور کبڈی کا کھلاڑی تھا۔
اسی وقت زندان کا دروازہ کھل گیا۔ پولیس اہلکار گالیاں بکتے ہوئے اندر گھسنے لگے تو حوالدار نے چیخ کر انہیں منع کیا۔ ''اوئے...... دو منٹ ٹھہر جاؤ...... میں ذرا اس ماں کے شیر کی......'' اس نے پھر بکواس کی...... ''پھر اسے اٹھا کر لے چلنا اس کی بہن کے سسرال۔''
ایک سنسنی خیز ڈرامے کے اشتیاق نے باقی اہلکاروں کو مغلوب کر لیا۔ انہیں یقین تھا کہ اس ڈرامے کا اختتام ان کی توقعات کے مطابق ہی نکلے گا۔ بھلا ایک چوٹوں سے نڈھال حوالاتی ہٹے کٹے حوالدار کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔
دوسرے اہلکار نے حوالدار کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ ''جا شیرا...... اس بہن کے...... کو کندھے پر لاد کر بھی تو نے ہی لانا ہے۔''
''اس کے بعد تو آ جانا......'' میں نے اسے بھی جوابی گالی سے نوازا۔
اس دوران حوالدار دروازے سے اندر آ گیا تھا۔ میں چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اندر آتے ہی وہ منہ سے گند اگلتا میری طرف جھپٹا۔
میں نے آج تک باقاعدہ مار کٹائی نہیں کی تھی۔ لڑائی، بھڑائی کے کسی قاعدے قانون سے آگاہ نہیں تھا۔ مگر وجود میں بھسم کر دینے والی جو آگ جل رہی تھی وہ طوفانوں سے بھی ٹکرا جانے پر آمادہ کرنے لگی تھی۔
میں نے کوشش کر کے دماغ کو حاضر رکھا اور تند بگولے کی مانند خود پر جھپٹنے والے حوالدار کے کندھے کی ضرب سے جھکائی دے کر خود کو بچانے کی کوشش کی۔ مگر مضروب ہونے کے سبب خاطر خواہ

پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ اچٹتا سا اس کا کندھا میرے سینے سے لگا اور میں لڑکھڑا کر گرا۔ البتہ گرتے ہی میں نے اس کے گھٹنے پر پاؤں سے ضرب لگائی۔
چنگھاڑ جیسی کراہ کے ساتھ وہ آگے کو جھکا۔ یہ ایک نادر موقع تھا۔ میں نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے ننگے پاؤں کی بھرپور ضرب اس کے چہرے پر لگائی وہ باقاعدہ پشت کے بل جا گرا۔ اس کے زمین پر گرنے سے باقاعدہ دھمک سی پیدا ہوئی تھی۔
تماشائیوں کے چہرے پر ہراس ابھرا۔
ہم دونوں بیک وقت ہی اٹھے تھے۔ چہرے پر لگنے والی ضرب کے سبب ناک سے خون جاری ہو گیا تھا اور طیش وخفت کے مارے اس کا چہرہ بگڑ سا گیا تھا۔
اٹھتے ہی اس نے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا وزنی گھونسہ میری پسلیوں پر لگا اور ایک لمحے کے لیے میری نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے خود کو ہوا میں بلند ہوتا محسوس کیا۔ حوالدار نے بڑی مہارت سے میری دونوں ٹانگوں کے درمیان ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھا لیا تھا اور اب پشت کے بل پٹخنے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھی تماشائیوں کی جانب سے اس کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی۔
یہ محض ساعتوں کا کھیل تھا۔ کوئی پل جاتا تھا کہ میں پشت کے بل کھردرے اور سخت فرش سے ٹکراتا اور ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو جاتا۔
حوالدار نے اپنی مکمل برتری کی ترنگ میں، مجھے ہوا میں ایک چکر دیا۔
''جی اوشیرا'' میرے کانوں میں اس کے ایک ساتھی کی پرجوش آواز ابھری اور میں نے آخری لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک آزمودہ داؤ لگایا یہ داؤ میں پہلے بھی کچہری میں اس سپاہی پر آزما چکا تھا جس نے مجھے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا تھا۔
میں نے اپنی انگلیاں بے رحمی سے اس کی آنکھوں میں ماریں۔ اس کے حلق سے تیز سسکاری برآمد ہوئی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ مجھے من چاہے انداز میں پٹخنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کے گٹر جیسے منہ پر دھرا ڈھکن دوبارہ کھل گیا تھا۔
میرے ''فاؤل پلے'' کے بعد اس کے ساتھی بھی گالیاں بکتے ہوئے اندر گھس آئے تھے اور ایک دفعہ پھر میں وردی والوں کی ضربات کی زد میں تھا۔ مگر یہ ضربیں مجھے تکلیف دینے کے ساتھ ساتھ میرے دل ودماغ میں خاکی سیاہ وردی سے نفرت بھی بھرتی جا رہی تھیں۔ آنے والے وقتوں میں جب یہ نفرت پوری نشوونما پا کر میرے وجود سے باہر نکلی تو اس نے اپنی حد سے تجاوز کرنے والے کئی وردی پوشوں کو خاکستر کر دیا تھا۔ میں پیٹ کے بل پڑا تھا۔ میرے ہاتھوں میں الٹی ہتھکڑی لگ چکی تھی اور غیض وغضب سے بھرپور ٹھوکریں میرے ضبط کا امتحان لے رہی تھیں۔
اس کارروائی میں وہ حوالدار بھی شامل تھا جس کی آنکھوں میں، میں نے انگلیاں ماری تھیں۔ اس کی ایک آنکھ کو معمولی نقصان ہوا تھا۔ دوسری البتہ بچ گئی تھی۔ وہ مضروب آنکھ پر ہاتھ رکھے میرے ہاتھوں کی جکڑی ہوئی انگلیوں پر ضربیں لگا رہا تھا۔
وجود میں بھڑکتی خودسری، نفرت وغصے کی آگ تکلیف کو چاٹے جا رہی تھی۔ میرے ہونٹ جیسے سل گئے تھے۔ اس دفعہ بھی معمولی سی بھی کراہ میرے ہونٹوں سے برآمد نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات ان تشدد پسند پولیس اہلکاروں کو وحشت میں مبتلا کر رہی تھی۔

مجھے مارنے والے ہانپ گئے ایک ہانپتی ہوئی آواز میری سنسناتی سماعت سے ٹکرائی۔ "بس کرواوئے! اس حرامی کو صبح ریمانڈ کے لیے بھی پیش کرنا ہے۔ کل دیکھیں گے اس کی "سیٹی" کب تک نہیں بجتی۔"

اس کے ساتھ ہی ضربات کا سلسلہ تھم گیا۔ میں نے بھی آنکھیں موند لیں۔

وہی آواز دوبارہ ابھری۔ "اوئے امام بخشا! تو ڈسپنسری نکل جا آنکھ جا کر چیک کروا لے۔"

امام بخش نامی اس حوالدار نے دوبارہ سے گالی دی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اس سے بھی بڑی گالی دی۔ بے شک میری آواز کمزور تھی مگر لہجے میں جان برقرار تھی۔

حوالدار آنکھ پر ہاتھ رکھے مجھ پر جھپٹا مگر ایک ساتھی نے درمیان ہی میں اسے تھام لیا۔ "یار! کل دیکھ لیں گے اس کی زبان کو بھی۔" اس کے لہجے میں زہر اور خطرناک عزائم بالکل واضح تھے۔ وہ بکتے جھکتے حوالدار کو زبردستی حوالات سے باہر لے گیا۔

دو اہلکاروں نے بے رحمی کے ساتھ مجھے گھسیٹ کر کھڑا کیا اور کندھوں سے تھام کر حوالات سے باہر لے آئے۔ میں بے حد کوشش کر کے اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تھا۔ پورا جسم شدید درد کی چادر میں لپٹا تھا۔ مگر دائیں طرف کی نچلی پسلیوں میں درد سوا تھا۔ رہ رہ کر ایک ٹیس اٹھتی تھی جو پورے وجود کے درد سے بھی زیادہ تکلیف کی حامل تھی۔ میں بمشکل ہی کراہ کو روک پاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی پسلی فریکچر ہو گئی ہے۔

ایک سرنگ جیسی راہداری کے اختتام پر تھانے کا صحن تھا۔ جہاں پکڑی گئی گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے ڈھانچے کھڑے تھے۔ ان میں سے کارآمد اشیا نکال کر پولیس اہلکار بیچ چکے تھے۔

صحن کے ایک طرف پولیس افسران کے کمرے تھے۔ مجھے تھام کر پولیس اہلکار ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں تین افسر موجود تھے۔ دو چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔ تیسرے کو میں بخوبی جانتا تھا۔ وہ رانا نوید تھا۔ اس کی سرخ آنکھو میں الاؤ جل رہے تھے۔ باقی دو افسران بھی مجھے خشمگیں نظروں سے گھور رہے تھے۔

یہ رانا نوید کا علاقہ نہیں تھا۔ اس لیے اس کی یہاں موجودگی بہت سے قیاسات کو جنم دے رہی تھی۔

میرے چہرے کے تازہ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ ایک بے حد سرخ و سفید سب انسپکٹر نے جس کے سینے پر لگے بیج پر جہانزیب لکھا ہوا تھا۔ اس بارے میں استفسار کیا۔

"سر! اس نے ہتھکڑی لگانے کے دوران امام بخش کی آنکھوں میں انگلیاں ماری تھیں۔ اس لیے ذرا اس کی "طبیعت" درست کرنا پڑی۔" مجھے بازو سے تھامنے والے ایک اہلکار نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

جہانزیب اٹھ کر میرے قریب آیا۔ وہ اونچا لمبا تھا۔ مجھ سے بمشکل ایک آدھ انچ ہی کم ہوگا۔ "یقین نہیں آرہا" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ "ایک سال بعد ڈاکٹر بن جانے والا ہوش مند نوجوان اس طرح کے ردعمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔" اس نے قدرے تاسف بھرے انداز میں کہا۔

بے اختیار میرے سینے کی گہرائیوں سے کرب میں ڈوبی آواز برآمد ہوئی۔ "جس کے باپ کو ناحق قتل کر دیا جائے، تیزاب کے ایک ڈرم سے جس کی خوشیوؤں اور امیدوں کی کھیتی جلا دی جائے اور اس کا قصور صرف یہ ہو کہ اس نے زہریلے پانی سے ماحول کو آلودہ کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھائی ہو تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ۔"

چند لمحوں تک میرے الفاظ کی بازگشت کمرے میں گونجتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ پولیس افسران کے چہروں پر جمی خشونت مدھم پڑ گئی...... ماسوائے رانا نوید کے۔

جہانزیب نامی سب انسپکٹر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا...... "بے شک تمہارے ساتھ ظلم ہوا ہے مگر تمہیں قانونی راستہ اپنانا چاہیے تھا۔ اپنے جذباتی پن کے سبب اپنی قبر تم خود ہی کھود چکے ہو۔" ان الفاظ نے مجھے ڈرانے کی بجائے میرے وجود میں شادیانے سے بجا دیئے تھے۔ ہاں...... ان الفاظ سے مجھے میاں ذوالفقار کے ہلاک ہو جانے کی "خوشبو" آئی تھی۔

میں نے کہا۔ "مجھے قانون نامی بے دست و پا دیوتا سے انصاف کی ذرا بھی امید نہیں۔ میں اس کے انصاف سے لبریز کئی فیصلے دیکھ چکا ہوں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ رانا نوید کو میرا اور جہانزیب کا مکالمہ ناگوار گزر رہا ہے۔ اس نے برا سا منہ بناتے ہوئے بے زار انداز میں کہا۔

"چھوڑ یار! ہم اس فیثا غورث کے بچے کا فلسفہ سننے کے لیے نہیں بیٹھے۔ کام کی بات پوچھ۔"

جہانزیب نامی وہ نوجوان آفیسر غالباً مقابلے کے امتحان کے بعد براہ راست سب انسپکٹر بنا تھا۔ اس لیے نمک کی کان میں رہ کر ابھی مکمل طور سے نمک نہیں بنا تھا۔ اسے رانا نوید کا انداز تخاطب پسند نہیں آیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری ابھری مگر وہ اپنے سینیئر آفیسر کے سامنے بول نہیں سکا۔ اس نے پھر مجھ پر نگاہیں جمائیں اور سرسراتے انداز میں کہا۔

"تمہارے دیگر ساتھی کہاں ہیں؟"

مجھے قطعی طور پر اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ بلکہ میرے ذہن سے تو اپنے ساتھی جیسے محو ہو گئے تھے۔

"میں نہیں جانتا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا اور یہ سچ بھی تھا۔

اس کے ساتھ ہی رانا نوید کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ اپنی اسٹک لے ساتھ وہ مجھ پر پل پڑا۔ میرے شانوں، سینے، گردن اور چہرے پر درجن بھر آتشیں لکیریں کھنچ گئیں۔ وہ کف اڑاتے ہوئے دہاڑا۔

"مجھے تیرے ساتھی چاہیں ہر قیمت پر۔"

"میں ان کے بارے میں جانتا بھی تو نہیں بتاتا۔"

رانا نوید کا چہرہ طیش کے مارے مسخ ہو گیا۔ اس کی اسٹک پھر حرکت میں آئی، اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے تیسرے آفیسر نے جو اس تھانے کا ایس ایچ او تھا، نے کہا۔ "رانا صاحب! ہاتھ ہولا رکھیں۔ ورنہ صبح ریمانڈ بھی نہیں ملنا اور ڈاکٹری معائنے کا حکم ہو گیا تو اور مشکل پیش آجائے گی۔"

رانا نوید نے بمشکل خود کو روکا۔ اس کا سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور سرخ آنکھیں انگاروں کا روپ دھار گئی تھیں۔ گلے کی پھولی رگوں کے ساتھ اس نے حیوانی سی آواز میں کہا۔

"میں دیکھتا ہوں تیری زبان کیسے نہیں کھلتی۔"

"ایک، دو ناقابل بیان جملوں کے بعد اس نے کہا۔ "تو نہ بول، جوتے سے نہیں بولے گا تو اپنے خاندان کے بڈھوں کی دھوتیاں اترنے کے بعد تو بولے گا۔" اس کا لہجہ اس کے سنگین عزائم کی خبر دے رہا تھا۔ "پھر نہیں بولے گا تو تیری عورتوں کا نمبر آئے گا۔" اس نے نئے پہلو سے میری قوت برداشت پر وار کیا۔

میں نے کہا۔ ”عورتیں تو رانا تیرے گھر بھی ہیں۔ بکھے ملوں کی نمک حلالی میں یہ دیکھ لینا کہ تیرا گھر چاند پر نہیں ہے۔“

یوں لگا جیسے رانا نوید کو ہارٹ اٹیک ہوجائے گا۔ ایس' ایچ' او نے مجھے لانے والے اہلکاروں کو اشارہ کیا۔ پل بھر میں ہی میں کمرے سے باہر تھا۔ آخری الفاظ جو میں نے سنے وہ ایس' ایچ' او کے تھے۔

”رانا صاحب! کل بندہ آپ ہی لے جائیں تو بہتر ہے۔“

❁......❁ ❁

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ میرا جسم تیز بخار میں پھنک رہا تھا۔ ٹھنڈے فرش پر میں پڑا تھا اور میرے جسم پر ایک بوسیدہ سا بدبودار کمبل لپٹا تھا۔

میں نے حوالات کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی۔ بمشکل سر اٹھایا تو مجھے جہانزیب کی صورت نظر آئی۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا' اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ جس نے ایک چھوٹا سا بیگ' پرانا سا کمبل اور ٹفن بکس اٹھا رکھا تھا۔

جہانزیب' اس آدمی کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔ داخلی دروازے پر کھڑا رائفل بردار سپاہی پوری طرح سے چوکس نظر آنے لگا تھا۔

”کیا حال ہے کمال؟“ اس نے قریب آ کر تاسف بھرے انداز میں رسمی سوال کیا۔

میرے ہونٹوں پر بے اختیار زخمی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”آپ کے سامنے ہے...... ہاں اگر میاں ذوالفقار کے کوچ کر جانے کی خبر سن لوں تو پھر بہت اچھا ہوں۔“

جہانزیب نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی حالت بہت سیریس ہے۔ اس کے جگر کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ ڈاکٹر ناامید ہیں۔ اگلے اڑتالیس گھنٹے اہم ہیں' وہ موت کی طرف چل پڑا ہے۔ بچ جانے کے چانسز بیس فیصد ہیں۔“

مجھے محسوس ہوا جیسے میرے زخموں پر کسی نے مرہم سا رکھ دیا ہو۔ میں نے طمانیت کے احساس کے ساتھ آنکھیں موند لیں۔

جہانزیب کی نرم آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ ”اٹھو اب کھانا کھالو۔“

میں نے آنکھیں کھولیں۔ ”یہ احسان آپ کیوں کر رہے ہیں؟“

”یہ احسان نہیں...... محض احساس انسانیت ہے مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا۔“ اس نے قدرے آزردہ سے انداز میں کہا تھا۔

بے شک یہ ”مار کے ساتھ پیار“ والی امریکہ سے مستعار لی ہوئی پالیسی ہوسکتی تھی مگر مجھے اس کے انداز سے سچی ہمدردی کی خوشبو آئی۔ میں اٹھ بیٹھا۔

کچھ دیر بعد میں بدبودار کمبل کو تہہ کر کے نیچے بچھا چکا تھا اور جہانزیب کا لایا کمبل اوڑھ لیا تھا۔ چکن سوپ' بوائل انڈے اور گاجر کا حلوہ حلق سے اترا تو توانائیاں لوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ جہانزیب میرے سامنے کھڑا مجھے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

دیگر چوٹوں کی تو مجھے پروا نہیں تھی۔ مگر پسلی کے درد نے بے حال کر رکھا تھا۔ شاید میری بے چینی جہانزیب نے میرے چہرے سے بھانپ لی۔ ”کیا کوئی چوٹ زیادہ تکلیف دے رہی ہے؟“ اس نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کھانے کے بعد اس کے ساتھ آئے فربہ اندام نے میری چوٹوں کا بغور

جائزہ لیا۔ وہ کوئی ڈسپنسر وغیرہ تھا۔

میری پسلیوں کا بغور معائنہ کرنے کے بعد اس نے کہا کہ بظاہر تو فریکچر کے کوئی آثار نہیں' بہتر طریقے سے تو ایکسرے کے بعد ہی پتا چل سکے گا۔

اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کی۔ یکے بعد دیگرے دو انجکشن لگائے اور چند گولیاں پانی کے ساتھ نگلوائیں۔ اس میں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت لگا تھا۔ جہانزیب مسلسل قریب رہا اور ایک' دو دفعہ اس نے ڈسپنسر کا ہاتھ بھی بٹایا۔

اس کے ہمدردانہ رویے نے میرے ذہن پر ان مٹ نقوش چھوڑے تھے۔ اس نے اپنا لباس منگوا کر میرے لیرو لیر کپڑے بھی تبدیل کروادیئے۔

پین کلر انجکشن نے میرے وجود کے سارے درد کو وقتی طور پر ختم کردیا تھا۔ میں نے خود کو کافی بہتر محسوس کرتے ہوئے جہانزیب سے کہا۔ ”آپ کی ہمدردی اور احسان کو میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔“

اس کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ ابھری۔ ”دوبارہ میڈیکل کالج جوائن کرنا تو یاد رکھنا ورنہ بھلا دینا۔“ یہ کہہ کر وہ حوالات سے باہر نکل گیا۔

میرے سینے کی گہرائیوں سے ایک دلدوز آہ نکلی...... کیا کہہ گیا تھا وہ نوجوان اور ہمدرد آفیسر! کتنی بڑی بات کی تھی اس نے۔

کیا یہ ممکن تھا کہ میں دوبارہ اپنا تعلیمی سلسلہ شروع کرسکوں؟ جن خون آشام دشمنیوں کی بنیاد پڑ چکی تھی...... کیا وہ مجھے پہلے جیسی زندگی گزارنے دے سکتی تھیں؟

کوئی وجدانی آواز مسلسل اس کی نفی کر رہی تھی۔ دوسرے لفظوں میں شرافت کی زندگی اب میرے لیے ناممکن ہوگئی تھی۔

جہانزیب ابھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ حوالات کا دروازہ بند ہوچکا تھا۔ میں دروازے کے قریب چلا گیا۔

جہانزیب کی استفہامیہ نگاہیں میری طرف اٹھی تھیں۔ میں نے کہا۔ ”اگر مناسب سمجھیں تو یہ بتادیں کہ کوئی پولیس اہلکار تو ہماری کارروائی کے دوران ہلاک نہیں ہوا؟“

اس دفعہ اس کے چہرے پر قدرے ناراضگی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایک کی ٹانگ اور ایک کے ہاتھ پر گولی لگی ہے۔“ قدرے توقف کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ ”اور دو اہلکاروں کی جناب نے آنکھیں نکالنے کی کوشش کی ہے۔“

❁......❁ ❁

قانون کے مطابق زیر حراست ملزم کو چوبیس گھنٹے میں عدالت میں پیش کرنا ضروری تھا۔ اگلے دن مجھے کچہری ہتھکڑیوں میں جکڑ کر لایا گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں محض ایک دن پہلے ہم' میاں ذوالفقار پر حملہ آور ہوئے تھے۔

مجھے درجنوں افراد کے سامنے ”زندہ گرفتار“ کیا گیا تھا۔ اس لیے فوراً ہی میری گرفتاری ڈالنا پولیس والوں کی مجبوری تھی۔ ورنہ زخمی ہونے والے پولیس اہلکاروں کا غصہ موقع پر ہی گولی مار کر اتارا جاسکتا تھا۔ یہ نا بھی ہوتا تو مہینوں تک کسی نجی ٹارچر سیل میں رکھنا تو عام سی بات تھی۔

چاچا احمد اور میری برادری کے چند دیگر افراد پہلے سے وہاں موجود تھے۔ میری ظاہری حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ مطمئن نظر آنے لگے تھے۔ انہوں نے میرے دفاع کے لیے وکیل بھی مقرر کردیا تھا۔

مجھے ریمانڈ حاصل کرنے کی غرض سے دفعہ تیس

کے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی مجسٹریٹ کے چہرے پر خشونت برسنے لگی۔ عین ممکن تھا اس نے بچشم خود ہماری کل کی کارروائی ملاحظہ کی ہو۔

مجھ پر بے حد سنگین دفعات لگائی گئی تھیں۔ جن میں قاتلانہ حملہ اور پولیس مقابلہ سرفہرست تھے۔ جو ناقابل ضمانت تھے۔

اپنے مفرور ساتھیوں کی گرفتاری اور ممنوعہ بور کے اسلحے کی برآمدگی کا کہہ کر سرکاری وکیل نے بڑے آرام سے میرا چار روزہ جسمانی ریمانڈ حاصل کرلیا۔ میرا وکیل مجھ پر شدید تشدد کا رونا روتا رہ گیا۔ مگر تمام تر حالات وواقعات میرے خلاف تھے۔ ہمارے ہاتھوں زخمی ہونے والے پولیس اہلکار اسپتال میں تھے اور میاں ذوالفقار زندگی وموت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔

سرکاری وکیل کی طرف سے ایک اور درخواست بھی پیش کی گئی۔ چونکہ سارے معاملے کو انسپکٹر رانا نوید دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے بھی اس کے سپرد کردیا جائے۔

کمرہ عدالت میں چاچا احمد میرے قریب آیا تو میں نے دھیرے سے کہا۔ ''چاچا فکر نہ کرنا۔ اس کتے کی کوئی خبر ہے؟''

چاچا احمد نے پرمسرت سرگوشی کی۔ ''ملتان لے گئے ہیں۔ بچنا مشکل ہے۔'' ان کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ ہمارے اقدام کو برادری میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔

''بیکھے ملوں کی طرف سے آپ لوگ ہوشیار رہنا۔''

چاچا احمد فکر مند نظر آنے لگا۔ ''انہیں تو دیکھ لیں گے پر رانا نوید بڑا تنگ کررہا ہے۔ روز چھاپے مار رہا ہے۔''

''اسے بھی دیکھ لیں گے۔'' میرے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ چاچا احمد نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ یکلخت ہی وہ مجھ سے مرعوب نظر آنے لگا تھا۔

مجھے رانا نوید کے حوالے کردیا گیا۔ پولیس وین مجھے اپنے قصبے کے تھانے میں لے آئی۔ حوالات میں پہلے سے بند بیکھے ملوں کے زرخریدوں کو معلوم ہوچکا تھا کہ میں نے میاں ذوالفقار کو چیر ڈالا ہے۔

تھانے کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے میرا شاندار استقبال کیا۔ شور تو روایتی تھا البتہ خیر مقدمی نعروں کی جگہ گالیاں اور پھولوں کی جگہ پلیٹیں اور گلاس انہوں نے مجھ پر نچھاور کیے۔

گالیوں کا البتہ میں نے بھی مقدور بھر جواب دیا تھا۔

اس تھانے میں صرف ایک ہی حوالات تھی۔ اس لیے مجھے ایک اور کمرے میں رکھا گیا۔ جہاں فوراً ہی میرا امتحان شروع ہوگیا۔ ہتھکڑی کیساتھ ایک زنجیر منسلک کرکے اسے کمرے کی چھت میں نصب ایک آہنی کڑے سے منسلک کردیا گیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ اٹھے ہوئے تھے اور پاؤں کے انگوٹھے بمشکل زمین کو چھو رہے تھے۔

یہ بڑی تکلیف دہ سزا تھی، چند ہی منٹوں میں پورا جسم پسینے سے بھیگ گیا اور کندھے شانوں کے قریب سے پھٹتے محسوس ہونے لگے۔

میرے قریب موجود اہلکار میری حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے زیر مونچھ مسکرایا۔ یہ بھاری بھر کم اہلکار رانا نوید کا وہی چہیتا تھا جسے والد صاحب نے مچھلی دینے سے انکار کیا تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ''سنا ہے تیرے تلا (تالاب) کی مچھی کتے بھی اب نہیں کھا رہے۔'' یہ الفاظ نہیں جیسے جلتا ہوا لاوا تھا جو میرے سارے وجود کو خاکستر کرگیا۔

''باپ تیرا مچھی پر جان دیتا تھا۔ اب بیٹھا ہوگا دوزخ میں مچھی بھونتا۔''

اچانک ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اس بدزبان کو بھرپور جواب دے سکتا ہوں۔ بے شک میرے ہاتھ بندھے تھے مگر پاؤں تو آزاد تھے۔ میں نے یکلخت سارا وزن بازوؤں پر ڈالا۔ کندھوں میں ناقابل برداشت درد کی نئی لہریں ابھریں اور میں نے جھولنے کے انداز میں دونوں پاؤں جوڑ کر اس کے منہ پر مارے۔ یہ اچانک اور بڑی شدید ضرب تھی۔ وہ اچھل کر دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ دوبارہ اٹھا تو منہ سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا اور سامنے والے دانتوں کی جگہ خلا نظر آرہا تھا۔

اس کی حالت دیکھ کر زخموں پر جیسے ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ میں نے ایک دفعہ پھر اچھل کر اس کی گردن دونوں ٹانگوں میں جکڑنا چاہی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ جھکائی دے کر وہ میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بدبخت نے پوری قوت سے میری ران میں دانت گاڑھ دیئے۔

چند منٹ بعد ایک دفعہ پھر پولیس اہلکاروں نے مجھے بھیڑیوں کی مانند گھیر رکھا تھا اور میرا زخم زخم جسم ان کی اندھی ضربوں کی زد میں تھا۔ پسلی کا درد دوبارہ سے جاگ اٹھا۔

نہ جانے کب میں، ان کی گالیوں کا جواب دیتے ہوئے ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔ دوبارہ ہوش آیا تو کمرے میں تاریکی تھی اور میں بدستور کمرے کے وسط میں نیم معلق تھا۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اور بازو تو لگتا تھا جسم کے ساتھ ہیں ہی نہیں۔

کچھ دیر بعد کمرے میں روشنی کردی گئی اور دو تین اہلکاروں کے ساتھ رانا نوید اندر گھس آیا۔ وہ چاروں مجھے بھوکے بھیڑیوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے خون کی پیاس بے حد واضح تھی۔

رانا نوید میرے قریب آیا۔ ایک اہلکار نے بڑھ کر میری ٹانگیں تھام لیں۔ میرے زخمی ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری۔ یہ احساس بڑا اطمانیت بھرا تھا کہ میرا ''خوف'' پولیس والوں کے دل میں جگہ بنا چکا ہے۔

رانا نوید نے خلاف توقع نرم انداز میں کہا۔ ''کیوں اپنی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اپنے سجنوں کا پتا بتا دے آرام سے یہاں چار دن نکال اور جوڈیشل (عدالتی تحویل) ہوتے ہی ضمانتیں کروالے...... ورنہ یہاں سے تیرا بے روح لاشہ ہی باہر جائے گا۔'' آخر میں وہ دھمکی دینے سے باز نہیں آیا تھا۔

''میرا جواب وہی ہے۔'' میں نے بمشکل کہا اور گلے میں شدید خراش کے سبب کھانسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ رانا نوید کے جبڑے بھینچ گئے۔ اس نے اہلکاروں کو خفیف سا اشارہ کیا۔ انہوں نے مکمل بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ تین منٹ بعد میرے پاؤں زمین سے تین فٹ اوپر اٹھ چکے تھے اور مزید ستم یہ کہ لکڑی کا ایک وزنی ٹکڑا میرے پاؤں سے بھی منسلک کردیا گیا تھا۔ اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کو دو طاقتور گھوڑے مخالف سمت میں کھینچ رہے ہوں۔

باہر نکلتے ہوئے رانا نوید نے کہا۔ ''دماغ ٹھکانے آجائے تو بتا دینا اور یہ ابھی ابتدا ہے۔''

میں دو گھنٹے تک ناقابل بیان اذیت کے شکنجے میں جکڑا رہا۔ پھر نیچے اتار کر صرف پاؤں میں ہتھکڑی لگادی گئی۔ پانی اور بے مزہ کھانا بھی دیا گیا۔

پولیس اہلکار تشدد کے بے حد ماہر ہوچکے تھے۔ ایک خاص حد سے زیادہ وہ مجھے نہیں لٹکا سکتے تھے۔

آخر چوتھے روز عدالت میں پیش کرنا بھی تو ضروری تھا۔ حد سے زیادہ تشدد کے سبب دوبارہ ریمانڈ لینا ناممکن ہوجاتا۔

اگلے دو روز رانا نوید نے ہر ممکن حربہ آزمالیا۔ مگر میری زبان کھلوانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ بے شک میں نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھی کہاں ہیں مگر رانا نوید ان کے کسی ممکنہ ٹھکانے کے بارے میں بھی معلوم نہیں کرسکا۔

ایک عجیب سی خودسری اور مضبوطی میرے وجود میں جگہ بناچکی تھی۔ جو میری زبان پر مضبوط تالے لگادیتی تھی۔

یہ تھانے میں میری تیسری رات تھی۔ صبح مجھے عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔ میں اس کمرے کے فرش پر لیٹا تھا۔ باہر ایک خوبصورت چاندنی رات تھی۔ پندرھویں کا چاند صاف آسمان پر روشن تھالی کی مانند نظر آرہا تھا۔ چاندنی سلاخ دار کھڑکی سے میرے بندی خانے میں اتری تو شاید میری حالت دیکھ کر سسک اٹھی۔

شاید چاندنی رات کا فسوں تھا کہ کچھ دور حوالات کے باہر کرسی پر بیٹھے پولیس اہلکار نے کان پر ہاتھ رکھا اور بھونڈی آواز میں تان کھینچی۔ ”چھٹی لے کے آجا بالماں، راتاں آ گیا چانیاں......

حوالاتیوں کی جانب سے داد و تحسین کے ڈونگرے برسے۔ افسران اپنی رہائش گاہوں میں تھے اور تھانہ محض چند اہلکاروں کے رحم و کرم پر تھا۔ اس لیے وہ اہلکار کھل کر تان لگا رہا تھا۔

میں بھی اپنی فرشی ہتھکڑی گھسیٹتے ہوئے کھڑکی میں آ گیا۔

حوالاتی تان لگانے والے اہلکار کو اکسا رہے تھے کہ اچانک ہی ایک گولی کی آواز نے چاندنی رات کا فسوں درہم برہم کردیا۔ گانے والا اہلکار اپنا کندھا تھامے فرش پر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی شدید ترین فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ قطعی یک طرفہ فائرنگ تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کسی گروہ نے تھانے پر حملہ کردیا ہے۔

اے کے 47 کی جانی پہچانی آواز سنتے ہی میرے تن مردہ میں جیسے نئی روح پھونک گئی۔ ساری توانائیاں لوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ لگتا تھا میرے جاں نثار ساتھیوں نے مجھے چھڑانے کے لیے حملہ کیا ہے۔

چاندنی رات میں سارا منظر بے حد واضح نظر آرہا تھا۔ زوردار چرچراہٹ کے ساتھ دھماکہ ہوا اور ایک وزنی جیپ تھانے کا بیرونی لکڑی کا سالخوردہ دروازہ توڑتے ہوئے اندر گھس آئی۔ اس سے کئی مسلح افراد نیچے کودے۔

اچانک ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ تھانے پر حملہ آور ہونے والے میرے ساتھی نہیں ہیں۔

ایک لمبا چوڑا نوجوان وحشت جس کے چہرے پر نمایاں تھی عقاب کی مانند میرے بندی خانے کی طرف جھپٹا۔ اس کے ہاتھوں میں اے کے47 نمایاں نظر آرہی تھی۔

اچانک ہی میری تمام تر حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں اور لہو سنسنانے لگا۔ وہ میاں امجد تھا۔ میرے باپ اور میجر صاحب کا قاتل اور اب فرشتہ اجل کی مانند مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔

(انشاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

نقل اصل

راحیلہ تاج

ڈاکٹروں نے اسے دوسری زندگی دی تھی۔ اس کے سینے میں کسی اور کا دل دھڑک رہا تھا، وہ دل اس کے دماغ کو عجیب و غریب خواہشات میں مبتلا کر رہا تھا، وہ ان تبدیلیوں پر حیران تھا مگر جب اسے حقیقت کا علم ہوا تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

مغرب سے درآمدہ، ایک ایسے شخص کی روداد جو ویمپائر بن چکا تھا

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ آپریشن کا وقت ہوگیا تھا۔ بالآخر اس نے سوچا کہ اب تو کافی دیر ہوگئی ہے۔ اسے اس وقت تک تکلیف کا احساس نہیں ہوا تھا۔ جب تک کہ پہلی مرتبہ اس کی شریانوں میں سن ہونے کے عمل کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھی نے کہا تھا۔

”قطعی ناممکن ہے کہ اس شخص کی عمر اڑتیس سال رہی ہو۔“ لیکن متواتر علاج اور بہتر ادویہ کے پیش نظر اسے خطرے سے صاف بچالیا گیا تھا۔ علاج کے پہلے مرحلے کے بعد دوسرے مرحلے کا آغاز ہوا تھا لیکن یہ مرحلہ قدرے اہم اور فیصلہ کن تھا۔ اس کے دہانے، نتھنے اور ہر ممکن العمل روزنوں میں بذریعہ آپریشن چھوٹی چھوٹی نلکیاں گزار کر اس کی زندگی برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تھی اور ان پر پیچ نلکیوں کو اس کے جگہ جگہ سے پچکے ہوئے کاسۂ سر کے ان سوراخوں سے بھی گزارا گیا تھا جو جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ مریض کے لاشعوری سطح پر یہ استخوانی کرچیاں ابھر ابھر کر ننھے ننھے شہتیروں کی مانند بہنے لگتی تھیں اور کبھی بالکل غرق ہوجاتیں اور کبھی دوبارہ ابھر کر سطح کو متزلزل کر کے رکھ دیتی تھیں لیکن واضح نہیں ہو پا رہی تھیں۔ لہٰذا اس کے سطح ذہن پر مختلف شبیہیں اور گوناگوں مبہم تصورات ابھر ابھر کر ڈوب رہے تھے۔

وقفے وقفے سے جب اس کے دماغ کا ریسیور صحیح خطوط پر کام کرنے لگتا تو وہ اپنے بستر کے گرد و پیش میں ہونے والی گفتگو کے کچھ حصے ضرور سن لیا کرتا تھا۔ بعض لفظ تو وہ بآسانی سن لیتا تھا اور بعض قطعی مبہم لیکن ابھی اس کے دماغ میں اتنی سکت ہرگز پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے ذہن کو ہر بات قبول کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑ دیتا۔ بعد ازاں وہ آپریشن تھیٹر کے تمام اصول اور طریقوں کو سطحی طور پر پہچاننے لگا تھا مگر سن کرنے والی دواؤں کا دباؤ اسے دوبارہ نحیف و ناتواں بنا دیتا تھا۔

اسپتال میں داخلے کے دن سے آج تک وہ آپریشن تھیٹر کی مشین سے منسلک رہا تھا۔ مشین کے حساس آلات اس کے بستر کے گرد سانپ کی طرح لپٹے ہوئے تھے اور اسے اس عالمگیر بلا کی مانند اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے جو اسے اپنی دسترس سے آزاد ہونے کی اجازت نہیں دے رہے تھے لیکن اس کے دماغ کی زود حسی میں شدت کے معنی تو یہ تھے کہ اس کی گرفت پہلے سے کم ہونی چاہیے۔ اس نے سوچا کہ اگر ایسا ممکن ہوا تو یہ ایک اچھی علامت ثابت ہوسکتی تھی۔

ایک نرس نے دیکھا کہ وہ بے دار ہوگیا ہے اور

قریب کھڑے ہوئے سرجن کی گفتگو سننے کے قابل ہے اولاً ڈاکٹر نے گفتگو میں ظرافت کا عنصر غالب رکھا تھا لیکن بعد ازاں ڈاکٹر نے سرجری کی ترقی کے بارے میں گفتگو کا رخ بدل دیا تھا۔ کسی خبر کو سننے کے سلسلے میں مریض کے لیے یہ ابتدائی کوشش تھی۔ پھر ڈاکٹر کو یقین ہوگیا کہ گفتگو مریض کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے کے لائق ہوگئی ہے۔

اگر کسگلے میں اپنے جسم کو جنبش دینے کی ذرا بھی سکت آ گئی ہوتی تو وہ اپنے شانوں کو ضرور اچکانا شروع کردیتا اور اس کا دماغ سوچنے لگتا کہ وہ یہاں کیوں اور کس لیے رہ رہا ہے؟ اسی طرح دن گزرنے لگے اس کے جسم سے تمام ٹیوبیں ایک ایک کر کے ہٹائی جانے لگی تھیں اور اب صرف برقی کنکشن باقی رہ گیا تھا جو اس کی قوت سماعت کو قائم رکھنے میں معاون تھا۔

پہلی بار جب اس کا شب خوابی کا لباس تبدیل کیا جا رہا تھا تو وہ پوری طرح بے دار تھا۔ اس نے اپنے سینے کو تشویش سے دیکھا۔ خلیے اندر سے سرخ تھے قرمزی ٹانگوں کی وجہ سے اس کے جسم پر جا بجا نشانات پڑ گئے تھے۔ اس گڑیا کی طرح جو رنگین چیتھڑوں سے بنائی جاتی ہے۔ مریض کے لیے یہ بات باعث تشویش تھی لیکن ڈاکٹر سومرز کے لیے عروج فن اور کمال کی معراج تھی۔

''اف' کتنا ستھرا کام ہوا ہے۔'' اس نے بستر کے کونے پر بیٹھتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔

''اس کا انحصار تو اپنی اپنی رائے پر ہے۔'' کسگلے بڑبڑایا۔

ڈاکٹر نے اس خشک رائے زنی کو آپریشن کے بعد بے دار ہونے والے ردعمل پر محمول کیا۔ تاہم ڈاکٹر کو یہ تو یقین تھا کہ مریض کے زخم تیزی سے مندمل ہو رہے ہیں۔ ایک اہم بات یہ عمل میں آئی تھی کہ اب مریض میں اتنا شعور ضرور پیدا ہوگیا تھا کہ اس میں کسی بھی بات کو رد کرنے کی علامت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد اس نے بستر پر بیٹھنا شروع کردیا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنے دکھتے ہوئے زخموں پر ہاتھ بھی رکھنے لگا تھا لیکن وہ اپنے خلیوں میں پوشیدہ اندرونی تہوں میں ایک ولولہ موجزن پاتا۔ کچھ دنوں بعد اس نے ڈاکٹر سومرز سے دریافت کیا تھا۔

''آخر اس شخص کو اسپتال تک کس نے پہنچایا تھا؟''

ڈاکٹر سومرز نے اپنے ہاتھ کاروباری انداز میں اپنے سفید کوٹ کی جیب میں ڈال لیے۔ ''تمہیں ان معاملات سے سروکار نہیں ہونا چاہیے ان لوگوں کے لیے مریض بالکل ناکارہ ہو چکا تھا اور اس کی موت اٹل تھی۔''

''میں پھر بھی یہ بات جاننا چاہوں گا۔''

ڈاکٹر نے گہری سانس لی اور معاملے کی وضاحت کرنے کے لیے توقف کیا۔ ''یہ مریض ایک حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اس کے جسم پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ کھوپڑی بری طرح مسخ ہو کر رہ گئی تھی اور چھاتی پر بھی گہرے زخم آئے تھے۔ دراصل یہ بات ناقابل یقین ہی تھی کہ ہم اس کے دل و دماغ قابل استعمال بنانے کے لائق ہو جائیں گے چونکہ دل کے قریب ہی گہرا زخم آیا تھا دو انچ بائیں طرف' دل کے عضلات ناکارہ ہوگئے تھے بہر حال یہ کیس ناگہانی ہمارے پاس آیا تھا۔''

''آخر تھا کون یہ شخص؟'' کسگلے نے پوچھا۔

''کسی کو علم نہیں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا اور کچھ سوچنے لگا۔

''میرا خیال تھا کہ تمہیں اس کام کے لیے اجازت لینی پڑے گی اور ضرور خانہ پری بھی لیکن اتنا بڑا اور اہم فیصلہ میں نے بڑی عجلت سے کر ڈالا تھا اور تمام مراحل آسانی سے طے پا گئے تھے۔''

''یہ ایک انتہائی موزوں استعارہ ہے تمام مراحل طے کر ڈالو۔'' کسگلے نے رائے زنی کی۔

دن ہفتوں میں تبدیل ہوگئے اور ہفتے مہینوں میں۔ پھر ایک دن اسے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

''اب تمہیں کیسا محسوس ہوتا ہے؟'' ہفتے میں دو مرتبہ اسپتال وزٹ کے دوران ڈاکٹر سومرز نے اس سے دریافت کیا۔

''کس حد تک افاقہ ہے۔'' مریض نے کہا۔

''اس کی توقع بھی تھی۔ یہ صورت حال مرض کو معمول پر لانے میں ممد و معاون ہے۔'' ڈاکٹر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی وجہ نہیں کہ اس مقام تک پہنچ نہیں سکو مگر ایسے معاملات میں کچھ وقت لگتا ہے خاص کر ایسے پیچیدہ مسائل میں۔''

''مجھے نیند بڑی دقت سے آتی ہے۔'' مریض نے شکایتاً بتایا۔

''کس حد تک؟''

''جس سے مجھے تکلیف پہنچتی ہے۔''

ڈاکٹر سومرز کو بڑا دکھ ہوا ''بڑی عجیب بات ہے۔''

''عجیب کیوں؟''

''چونکہ ایسے کیسز میں نیند کا نہ آنا مرض میں الجھنیں پیدا کر سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر خاموش ہوگیا۔

❖......❖......❖

''اب تمہاری نیند کا کیا حال ہے۔'' ڈاکٹر نے مریض سے آئندہ ملاقات پر دریافت کیا تھا۔

''کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوا ہے اب بھی خواب آور گولیوں کی ضرورت پڑتی ہے آپ سے عرض کرنا ہے کہ ایک بات بالکل انوکھی اور محیر العقل ہے۔''

''وہ کیا بھلا؟''

''وہ یہ کہ دن کے وقت سونے میں کوئی خاص وقت محسوس نہیں ہوتی۔ اب تو یہ روزمرہ کا معمول بن چکا ہے کہ رات کو سونے سے قبل خواب آور گولیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جبکہ دن کے وقت سکون سے نیند آتی ہے۔''

''ٹھیک ہے' اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ تم سونے سے قبل مقررہ مقدار میں گولیوں کا استعمال کر لیتے ہو لیکن ہر آدمی کو اس کے مزاج کے مطابق چوبیس گھنٹوں میں ایک گھنٹے کا فرق اوسطاً ضرور ہوتا ہے۔''

''جی ہاں میں جانتا ہوں کیونکہ اس سے وقت میں توازن قائم رکھنے میں آسانی ہوتی ہے خیر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا لیکن مجھے امید ہے کہ میں اگر دوبارہ کام میں لگ جاؤں تو شاید حالت معمول پر آ جائے۔''

''ان باتوں کے لیے جو معمولی نوعیت کی ہیں' تمہیں پریشان ہونے کی قطعی ضرورت نہیں شکل و شباہت اور موجودہ ہیئت سے تو تم رات کے چوکیدار لگتے ہو۔'' ڈاکٹر نے پر مذاق انداز میں ایک فقرہ چست کیا تھا۔ کسگلے نے اثبات مین گردن ہلا دی تھی لیکن ڈاکٹر کے برجستہ جملے پر

مسکرانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اس وقت مذاق کے موڈ میں قطعی نہیں تھا۔ اس میں ابھی اتنی استعداد پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ ڈاکٹر کی ان پر مزاح باتوں سے لطف اندوز ہو۔ ڈاکٹر نے رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور اس پر اپنا مشورہ تحریر کر دیا۔

''اور کوئی شکایت؟''

''میرا خیال ہے میری قوت بصارت میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے تکلیف بھی محسوس ہوتی ہے۔''

''خیال سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

مریض نے جواب دیا۔ ''یہ بیان کرنا ذرا دشوار ہے ہوتا یہ ہے کہ کبھی آنکھوں کے سامنے منظر دھندلا ہو جاتا ہے لیکن یہ بات محض وقتی ہوتی ہے لیکن نگاہوں کے سامنے جب منظر دھندلا ہو جاتا ہے تو آنکھوں کی بینائی یکسر ختم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔''

''کیا یہ وقتی تغیر کسی خاص حالت کے پیش نظر عمل میں آتا ہے؟''

''صرف صبح کے وقت۔''

ڈاکٹر سومرز کھڑا ہوگیا اور ڈیسک کی دوسری طرف چلا آیا۔ اس نے کسگلے کی آنکھوں کا معائنہ کیا اور پھر اس نے مریض کی جلد کا خوش اسلوبی سے معائنہ کیا آپ ذرا میری طرف دیکھیں۔''

آنکھوں میں ننھا سا دائرہ دھبے کی شکل میں نظر آتا ہے ممکن ہے یہ صورت حال تھکان کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہو میں چونکہ آنکھوں کا ماہر نہیں ہوں لہٰذا میں تمہارے معاملے کو اسپتال کے شعبہ امراض چشم کو ریفر کر دیتا ہوں۔''

کسگلے نے اپنا کاغذ اٹھایا اور متعلقہ شعبہ کی طرف چل دیا۔ ڈاکٹر نے اس کے معاملے کو اولیت دینے کی سفارش لکھی تھی کہ مریض کا فوری اور مناسب ٹیسٹ لیا جائے ماہرین کی رپورٹ کے مطابق مریض کے جسم میں کوئی نقص باقی نہیں تھا۔ لہٰذا انہوں نے نسخے میں صرف حیاتین الف کی گولیاں تجویز کر دی تھیں۔

پندرہ دن بعد آنکھوں کا مسئلہ مزید خراب ہوگیا اور یہ بڑھتی ہوئی خرابی اسے خوف زدہ کر رہی تھی۔ ان حقائق کے باوجود کہ اس کی آنکھوں میں انجماد خون ہو رہا ہے گو وہ ہر چیز صاف دیکھ سکتا تھا لیکن یہ وقتی تبدیلیاں اور آنکھوں میں خون کا سمٹ کر ایک مرکز پر جم جانا تشویش کا باعث تھا پھر اسے یہ معلوم تھا کہ اس محیر العقل واقعہ کی کوئی طبی ادارہ وضاحت نہیں کر سکتا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کا دماغ متاثر ہو رہا ہے۔ اپنے اس خبط کو روکنے کے لیے اس نے اپنے گھر میں آویزاں تمام آئینوں کو ہٹا دیا تھا۔ علاوہ ازیں کچھ اور بھی انوکھی باتیں وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔

ایک صبح، جب اس نے دیکھا کہ اس کے مسوڑے سوج گئے ہیں تو اس نے ٹوتھ پیسٹ کے لوندے کو بڑی خوش اسلوبی سے اپنے برش پر رکھ کر اپنے منہ میں ڈال لیا تھا کچھ دن بعد ان مسوڑوں میں سوزش ہونے لگی لیکن اس کی طرف اس نے دھیان نہیں دیا۔ کیونکہ برش کی سخت رگڑ سے تکلیف میں اضافہ ہوگیا تھا۔ اس نے ناقص انسٹرومنٹ کو باہر نکال دیا۔ اپنی انگلیوں سے ٹٹول کر زخم کے صحیح نشانات کا اندازہ لگایا اسے اوپر اور نیچے کے جبڑوں پر مرکزی تالو سے کچھ ہٹ کر زخم کے چار نشانات محسوس ہوئے جب اس نے انگلی کے سرے کو

مسوڑوں پر رکھا تو اسے سوجن کا اندازہ بخوبی ہوگیا۔ کچھ دیر تک اپنی اس حرکت پر اظہار افسوس کرتا رہا کہ کاش وہ آئینوں کو باہر نہ پھنکواتا اسے یقین تھا کہ اگر وہ آئینے میں دیکھتا تو اسے مسوڑوں کی سوجن اسے ضرور نظر آجاتی۔

وہ کسی دانت کے ماہر کے پاس جائے یا احوال لکھ کر دوا منگوالے کیونکہ موجودہ صورت حال کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اس کی گوشت کھانے کی خواہش شدید ہوگئی۔ یہ خواہش تشویشناک حد تک قابو سے باہر ہوگئی تھی کیونکہ وہ پیدائشی نازک مزاج واقع ہوا تھا کہ اپنی سابقہ زندگی میں گوشت کی محدود مقدار پکوا کر اس وقت کھاتا تھا کہ گوشت گل کر نا قابل شناخت ہو جاتا اپنی اس خواہش میں اضافے کو کسگلے نے ڈاکٹر سومرز سے پوشیدہ رکھا تھا۔

تقریباً نو بجے اطلاعی گھنٹی بجی تھی چونکہ اس وقت وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا اس لیے وہ جھلا گیا۔ اس کے سامنے زینوں پر ایک بڑے بالوں والا نوجوان کھڑا تھا۔ ''جی فرمائیے۔'' اس نے خفگی سے کہا۔

''میرا تعلق ایک مقامی اخبار سے ہے امید ہے کہ آپ اس طرح مخل ہونے پر برا نہ مانیں گے میں تو صرف آپ سے اس کہانی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں جو اس آدمی سے متعلق ہر کس و ناکس کے منہ پر ہے۔''

''کون سا آدمی؟ کیسا آدمی؟'' کسگلے بھنا گیا۔ تھکن نے اس کے لہجے میں جھلاہٹ پیدا کر دی تھی۔

''وہ آدمی جو آپ کے آپریشن کے وقت بطور ڈونر استعمال کیا گیا تھا۔''

''اس شخص سے آپ کو کیا لینا ہے؟''

''کیا میں اندر آسکتا ہوں؟'' رپورٹر نے عاجزی سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

''جی ہاں۔'' اور رپورٹر کسگلے کے ساتھ سامنے کے کمرے میں آگیا۔ کمرے کے پردے اب بھی قصداً کھنچے ہوئے تھے۔ رپورٹر ہاتھ سے ٹٹول کر نشست پر بیٹھ گیا۔ کسگلے اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ اب اس نے تاریک شیشوں والی عینک اپنی آنکھوں سے ہٹالی تھی۔

''اس آدمی کا کیا ہوا؟ کیا انہیں اس کے متعلق پتا چلا؟'' نوجوان رپورٹر نے پوچھا۔

''ان باتوں سے آخر آپ کا کیا مقصد ہے؟''

''کیا آپ نے نہیں سنا؟''

''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''مسٹر کسگلے آخر اس شخص کو کہاں اور کیسے تلاش کیا جائے؟''

''کہیں نہ کہیں تو مل ہی جائے گا۔''

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نامعلوم گروہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے۔''

''کیوں؟''

''ان کا اس شخص کے بارے میں خیال ہے کہ وہ ایک خون آشام بلا ہے۔''

''خوں آشام بلا یعنی ویمپائر۔'' کسگلے نڈھال سا کرسی پر گر گیا۔ اب اسے راتوں کو بھٹکنے کا جنون، سائے سے محرومی دانت، زہریلے دانت اور نوکدار دانت یہ تمام حلیہ اپنی ذات پر فٹ معلوم ہوتا تھا۔ پھر گوشت سے بڑھتی ہوئی رغبت اب اسے پتا چل گیا تھا کہ اسے صرف اور صرف خون کی تلاش تھی۔

آہ خون کی تلاش! اف میرے خدا یہ سب کیا ہو رہا ہے وہ بڑبڑایا۔

''آپ کو ان سب باتوں کا علم کیسے ہوا؟''

''ان میں سے ایک ہمدرد آدمی نے پولیس کو خبر کردی تھی اور بتایا تھا کہ یہ شخص کس طرح گھناؤنے جرائم کے لاتمناہی سلسلے کا ذمہ دار ہے اور کس طرح اس نے پولیس سے اپیل کی کہ اس خون آشام بلا کو نیست و نابود کردیا جائے اس شخص کو تلاش کرکے کسی وزنی چیز سے اس کا چہرہ اس قدر مسخ کردیا جائے کہ اس کی شناخت بھی ممکن نہ ہو اور پھر یہی ہوا تھا۔ اس خون آشام بلا کو گھیر کر اس کے دل کی جگہ میخ ٹھونک کر ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان لوگوں نے اس کی لاش بری طرح مسخ کردی تھی اور اسے شاہراہ کے کنارے ڈال دیا تھا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ کسی گاڑی کے نیچے آگیا ہے لیکن اس کے دل کو شدید نقصان نہیں پہنچ سکا تھا۔ ابھی وہ اس لائق تھا کہ اسے نکال کر دوسرے کسی ضرورت مند کے جسم میں لگا دیا جاتا۔''

کسگلے پریشان ہوگیا۔

''اس کا دل زیادہ خراب نہیں ہوا تھا۔ سرجن نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے دل پر ایک زخم بڑا گہرا تھا لیکن دل اس سے براہ راست متاثر نہ ہوسکا تھا۔''

کسگلے نے اپنے ہاتھوں کو سینے سے چمٹا لیا۔ اس کا بے گانہ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا کیا اس خبر کی وجہ سے؟ یا اس کے خون میں شامل ویمپائر اپنا حق جما رہا تھا۔ ''آپ کا لہجہ غمازی کررہا ہے کہ آپ مزید تفصیلات سے واقف ہیں۔'' وہ بڑبڑایا۔

''جی ہاں' وجہ یہ ہے کہ وہ آدمی پولیس اسٹیشن گیا۔ یہ بتانے کے لیے کہ ویمپائر کا خون آشام گروہ آپ لوگوں کی تلاش میں ہے۔

کسگلے کھڑا ہوگیا۔ ''مگر ایسا ہو نہیں رہا ہے۔''

''میں' آپ سے چند اور سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

کسگلے نے اپنا سر ہلا دیا۔ ''بہتر ہے کہ آپ یہاں سے رخصت ہوجائیں۔'' اس نے نیم برہمی سے کہا۔

''لیکن۔''

''لیکن کچھ نہیں۔'' کسگلے رپورٹر کو باہر جانے کا راستا دکھا رہا تھا۔ بادل نخواستہ پانچویں ریاست کے نمائندے نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔

کسگلے نے وہسکی کا گھونٹ حلق میں انڈیل لیا جب کہ ڈاکٹر نے اسے الکوحل کے استعمال سے قطعی پرہیز کرنے کی ہدایت دی تھیں۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کررہا تھا کیا وہ ڈاکٹر کو فون کردے۔ ''نہیں' نہیں...... ہرگز نہیں اس کہانی پر کون اعتبار کرے گا۔ ممکن ہے یہ مخصوص علامات اس کے ذہن کی اختراع ہوں ممکن ہے رپورٹر بھی دغا باز ہو ایسی صورت میں پولیس بھی کسگلے کو خبطی تصور کرے گی الکوحل اور یہ دقیق النفس قسم کے خیالات بیک وقت اس کے ذہن پر اثر انداز ہورہے تھے۔ وہ اونگھنے لگا اور لڑکھڑاتا ہوا بالاخانے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

❖......❖......❖

دوپہر کے وقت دروازے پر ہونے والے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی دروازے پر زور آزمائی کررہا ہو۔ وہ اپنی تاریک شیشوں والی عینک لینے کے لیے میز پر جھکا دروازے پر دو آدمی موجود تھے۔ ان میں سے ایک

تالا توڑنے کی کوشش میں مصروف تھا جبکہ دوسرا اس کے قریب کھڑا تھا تاکہ عمارت کے گرد و پیش پر نظر رکھ سکے یا کمرے میں داخل ہونے کا کوئی دوسرا راستا تلاش کرسکے۔

اب تو اسے فوری طور پر پولیس سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ کسگلے نے ڈریسنگ گاؤن پہنا اور رینگتا ہوا ہال میں رکھے فون تک گیا لیکن فون کا ریسیور ڈیڈ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں ناکارہ ٹیلی فون کا ریسیور لیے کھڑا رہا۔ اس کے چھاتی کے عضلات اس قدر کس گئے تھے کہ اس کا تعلق جسم کے دوسرے حصے سے منقطع ہوگیا تھا کیا ان عضلات میں تشویش کے باعث تحریک پیدا ہوگئی تھی؟ یا یہ دروازے پر اچانک حملے کا ردعمل ہے۔ وہ خواب گاہ کی سمت چل دیا۔ کچن سے گلاس گرنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی پھر پچھلا دروازہ ٹوٹ کر گرنے کی آواز آئی ٹوٹے ہوئے گلاس پر بھاری قدموں سے چلنے کی آوازیں آئیں بہت سے قدموں کی آوازیں۔

معاً چار آدمی دروازے پر نمودار ہوئے ایک آدمی کے ہاتھ میں لکڑی کی مضبوط میخ تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں ہتھوڑا تھا۔

''نہیں...... نہیں۔'' کسگلے ہسٹریائی انداز میں چلایا۔ اب وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''اسے پکڑ لو' ایک آدمی نے جو سب کا لیڈر دکھائی دیتا تھا تحکمانہ انداز میں کہا۔

''پھر کسگلے کی پیٹھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ تبھی وہ کسی کیڑے کی طرح فرش پر رینگنے لگا تین آدمیوں نے کس کر اس کی مشکیں باندھ دیں اور ایک آدمی نے غلیظ کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی پوری کوشش کی لیکن حریف کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

''اس بار اس کا کام ختم کرکے ہی دم لیں گے۔'' میخ بردار آدمی نے پرعزم انداز میں کہا۔ اس نے اپنی مضبوط ہتھیلی کسگلے کی چھاتی پر رکھ دی تھی اب وہ دل دھڑکنے کی آواز سن رہا تھا۔ اسے ایسا کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ''اس بار نشانہ خطا نہیں ہوگا۔'' اس نے بڑی احتیاط سے کسگلے کے دل کا نشانہ لیا اور وہ نوکیلی میخ پسلیوں کے درمیان داخل کردی۔

وہ درد کی شدت سے چیخ پڑا۔ آپریشن کے دوران چونکہ پسلی کی ہڈیاں کاٹ دی گئی تھیں لیکن سرجن نے اسے ماہرانہ انداز میں بن دیا تھا۔ کسگلے نے اپنے دھڑ کو ان کی گرفت سے چھڑانا چاہا لیکن پسلیاں اس فعل سے اور متاثر ہوئیں۔ ان میں شدید زخم آگئے تھے اب تو اس کا سر ہی حرکت کررہا تھا۔

''میرے ساتھی ہمیں بہت افسوس ہے۔'' ہتھوڑے والے نے اپنی دانست میں اظہار ہمدردی کیا۔ ''تم دراصل حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہوئے ہو۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں یہ سب ڈاکٹروں کی مداخلت کا نتیجہ ہے۔ انہیں تم کو اکیلا چھوڑ دینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا چونکہ انہیں خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کررہے ہیں۔ ان کی یہ نادانستہ غلطی کسی بڑے نقصان کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔''

''جلدی کرو' برٹ۔'' ایک دوسرے آدمی نے سرگوشی کی۔

''مجھے افسوس ہے اچھے ساتھی۔'' ان میں سے اہم ترین شخص نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم سمجھ گئے ہوں گے تم تو پہلے ہی مر چکے تھے تم کچھ کے کچھ بنا دیے گئے خاص کر جب کسی غیر کا دل تمہارے دل کی جگہ حرکت کرنے کے لیے لگا دیا گیا تھا۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہارے نظام جسم نے اجنبی دل کو قبول کرنے سے انکار نہیں کیا تھا۔''

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ کسگلے نے بھاری قدموں کی دھمک سنی اور پھر دروازہ یک لخت کھل گیا۔ ''جتنی تیزی سے بھاگ سکتے ہو بھاگ نکلو۔'' اس نے کسی کو چلاتے ہوئے سنا۔ ایک آدمی جو کسگلے کے منہ پر گھونسا رسید کرنے والا تھا زبردست دھکے سے فرش پر گر پڑا تھا۔

''پولیس۔'' اس نے سوچا خدا کا شکر ہے وہ خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا تھا لیکن نتیجہ اس کے تصور سے الٹ ثابت ہوا حملہ آور مغلوب ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے محسنوں کی طرف احسان مندی کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کے لباس پولیس والوں کی طرح ہرگز نہ تھے۔

پھر دو آدمی اسٹریچر اٹھائے وہاں پہنچے۔

''گھبرائیے نہیں۔'' کسی نے کہا۔

اسپتال...... اس نے سوچا ان لوگوں کا تعلق اسپتال سے ہوگا۔ اسے اسٹریچر پر ڈال دیا گیا اور دروازے سے ہال میں لایا گیا۔ مکان کے باہر ایک ایمبولینس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ دماغ کی ہیجانی صورت حال کے دوران اس نے یہ بھی سوال نہیں کیا کہ اس کے اردگرد لوگوں نے اسپتال کی یونیفارم کیوں نہیں پہن رکھی ہے۔ دن کی تیز روشنی کی وجہ سے اسے اپنی آنکھیں بند کرنا پڑی تھیں۔

اس نے تو یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ ایمبولینس جس کے ذریعے اسے لے جایا جانا تھا دقیانوسی ماڈل کی تھی۔

انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

''ڈاکٹر سے کہہ دینا کہ اس کے دل کو میرے جسم سے خارج کر دے۔'' جب گاڑی چلنے لگی تو وہ بڑبڑایا۔

ایک چہرہ اس پر جھکا اور کہنے لگا۔ ''میرے آقا گھبرائیے نہیں زیادہ عرصے تک آپ کو یہ پریشانی لاحق نہیں رہے گی۔'' ایک اور آواز نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''جلد ہی آپ محفوظ ہو جائیں گے۔''

''آقا' آخر آقا سے تمہارا کیا مطلب ہے۔ وہ جھنجلا گیا۔

''جناب عالی! ہم نے آپ کے لیے ایک عمدہ تابوت یہاں سے بہت دور ایسی جگہ جہاں پولیس' ڈاکٹر اور قانون نافذ کرنے والے کی افسر کی نظر نہ پڑ سکے چھپا دیا ہے۔ وہی تابوت آپ کی ابدی آرام گاہ ہوگا۔''

''تم پاگل ہو گئے ہو۔'' کسگلے نے چلانے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو اسٹریچر سے آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس میں پوری طرح ہلنے کی سکت کب باقی رہ گئی تھی لیکن اس اثنا میں اسے موقع مل گیا تھا کہ وہ اس آدمی کی گردن کو بغور دیکھنے لگا جس سے وہ بات کر رہا تھا۔ یہی موقع تھا کہ کسگلے اس آدمی کی گردن میں دو سوراخ دیکھ لیے جن کے دہانے پر خون کے چکتے جمے ہوئے تھے۔

❖

پرانا چاول

قمر السلام عثمانی

عموماً کہا جاتا ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ عقل بھی خبط ہو جاتی ہے مگر محاورے سے ہٹ کر عملی زندگی میں بلکہ ان لمحات میں جب موت ایک دوگام کے فاصلے پر کھڑی مسکراتی ہے۔ ایسے میں سالوں کا تجربہ بوڑھے سے بوڑھے ناتواں شخص کو جواں عزم بنا دیتا ہے۔

ایک پرانے چاول کا قصہ' جس کے کاندھے پر اپنے ساتھ دو زندگیوں کا بوجھ بھی آگیا تھا۔

مغرب سے درآمدہ ایک مختصر لیکن دل چسپ کہانی

دوپہر ہوتے ہوتے ریگستان کی فضا ایک دم تبدیل ہو گئی۔ وسیع عریض ریگستان جہنم کا منظر پیش کرنے لگا' دھوپ اتنی تیز اور چمکیلی تھی کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ٹینکر کے اگلے حصے میں بیٹھے ہوئے وہ دونوں یوں محسوس کر رہے تھے جیسے کسی دہکتے ہوئے تنور میں آ بیٹھے ہوں' پسینہ ان کے بُن مو سے پھوٹ رہا تھا اور جسم رطوبت کی وجہ سے بُری طرح چپ چپانے لگا تھا۔

''انجن کا کیا حال ہے؟'' نوجوان بل نے چارلی سے پوچھا۔

''بُرا حال ہے' بس ایک دو منٹ میں جواب دینے والا ہے۔'' چارلی نے جواب دیا۔ چارلی پکی عمر کا تجربہ کار اور جہاں دیدہ آدمی تھا۔ گرمی سے اس کی بُری حالت تھی مگر وہ خود پر حیرت ناک انداز میں قابو پائے ہوئے تھا۔ اس نے آستین سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ ہم ذرا دیر کے لیے رک جائیں اور ریڈی ایٹر میں پانی ڈال دیں' انجن سیز ہو گیا تو بُرا ہوگا۔''

''بہت عمدہ خیال ہے۔'' بل مسکراتے ہوئے بولا۔ ''انجن کے داغِ مفارقت دینے کے بعد اس جہنمی ریگستان میں پیدل چلنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے بارے میں کہہ نہیں سکتا مگر مجھے اس طرح کی موت بالکل پسند نہیں ہے۔'' ریگستان کی تپش اور حدت سے پریشان ہونے کے باوجود بل کے لہجے میں شگفتگی تھی۔

''تم کیا کوئی بھی عقل مند آدمی ایسی موت پسند نہیں کرے گا۔'' بوڑھے چارلی نے ایکسیلیٹر سے پیر ہٹایا' ٹینکر کی رفتار یکلخت کم ہو گئی۔

''سفر شروع کرنے سے پہلے تمہیں ریڈی ایٹر کو چیک کر لینا چاہیے تھا۔'' بل نے کہا۔

جواب میں چارلی غرا کر رہ گیا' اس نے اپنی طرف کا دروازہ پوری طرح کھول دیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا پھر بڑبڑانے کے انداز میں بولا۔

''آس پاس کوئی سائبان ضرور ہونا چاہیے تھا' کم از کم آدمی سائے میں کھڑا ہو کر کچھ دیر کے لیے تازہ دم تو ہو سکتا۔''

''سائبان......؟ بہت خوب۔'' بل آہستہ سے ہنس دیا۔ ''ہمارے آگے پچاسی میل تک سوائے اس قاتل ریگستان کے اور کچھ نہیں ہے پھر اس کے بعد پچاس میل تک ٹیڑھے میڑھے خونخوار کوہستانی راستے ہیں اور انہی راستوں پر تمہارے بوڑھے کھانستے

کھنکارتے ٹینکر کو چلنا ہے۔"

بھاری ٹینکر نے ایک جھٹکا لیا اور ریگستان کی نرم ریت نے اس کے ٹائروں کو جکڑ لیا۔

"تم اس علاقے کو پسند نہیں کرتے' کیوں؟" چارلی نے مڑ کر بل سے پوچھا۔

"پسند......؟ ارے میں تو مرتا ہوں اس علاقے پر' جب صحرائی دھوپ کھوپڑی کو بوسہ دیتی ہے تو کیا کہنے اس لطف کے' اور چہرے کا تو پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اپنی جگہ پر ہے بھی یا نہیں۔ رہے مناظر تو میں نے اتنے خوب صورت جھاڑ جھنکار کہیں اور نہیں دیکھے۔"

چارلی غور سے بل کا جائزہ لینے لگا' بل کا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کے چھدرے بال پسینے میں بھیگ کر کھوپڑی سے چپک گئے تھے' اس کے جسم سے پسینے اور گریس کی ملی جلی بو آرہی تھی۔ چارلی کچھ دیر تک اسے دیکھتا رہا پھر کود کر ٹینکر سے نیچے آ گیا۔ بل بھی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اتر آیا۔ دوسری صحرائی گاڑیوں کی مانند اس ٹینکر کا بونٹ بھی پہلے سے ہٹا ہوا تھا' بل نے ہپ پاکٹ سے ایک بڑا سا رومال نکالا اور ہاتھ پر لپیٹ کر ریڈی ایٹر کا ڈھکنا کھولنے لگا۔ ڈھکنا کھلتے ہی بھاپ اور زنگ آلود پانی کا ایک گرم گرم فوارہ ابل پڑا۔ چارلی ٹینکر کے کیب سے پانی کی تھیلی لے آیا اور جب ریڈی ایٹر سے بھاپ نکلنا بند ہو گئی تو اس نے ریڈی ایٹر کو پانی سے بھر دیا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا کر انجن بند کر دیا۔

"انجن بہت زیادہ گرم ہو گیا ہے بل۔" چارلی نے کہا۔ "ہمیں کچھ دیر یہاں رکنا پڑے گا ورنہ بقول تمہارے پیدل ہی جانا پڑے گا۔"

وہ دونوں ٹینکر کے سائے میں آ گئے تھے پھر چارلی دوبارہ ٹینکر کے کیبن کی طرف گیا اور پانی کی ایک دوسری تھیلی نکال لایا۔ اس نے تھیلی بل کی طرف بڑھا دی' بل نے تھیلی کا کارک ہٹایا اور منہ سے لگا لیا۔ پانی غٹ غٹ کی آواز کے ساتھ اس کے حلق سے اترنے لگا۔ پیاس بجھانے کے بعد اس نے تھیلی چارلی کو واپس دے دی۔ چارلی سر پیچھے کی طرف جھکا کر پانی پینے لگا۔ پانی اس کی دونوں باچھوں سے بہہ کر ٹھوڑی اور سینے کو بھگونے لگا۔ پانی پی کر اس نے رومال نکال کر چہرہ اور گردن کا پچھلا حصہ خشک کیا۔

"تم یہ سب کیسے برداشت کر لیتے ہو چارلی؟ یہ ریگستان' یہ گرمی' یہ ویران اور اجاڑ راستے ان کا تصور ہی ہولناک ہے۔" چارلی نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے بل کی طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔

"یہی میرا کام ہے' میں یہ کام تیرہ سال کی عمر سے کرتا آ رہا ہوں۔ لوگ مجھ پر بھروسہ کرتے ہیں' میں لوگوں کا سامان اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہنچاتا ہوں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں ان کا سامان ان تک ضرور پہنچاؤں گا۔"

"مگر یہی کام ملک کے کسی دوسرے حصے میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے' وہ جگہیں جہاں ہرے بھرے درخت ہوں' پانی ہو اور صاف ستھری کشادہ سڑکیں ہوں' تم یقیناً اپنے آپ سے نفرت کرتے ہو اور تم نے انتقاماً اس ریگستان کو منتخب کیا ہے۔"

چارلی نظر جھکا کر ریت کو گھورنے لگا پھر اس کی نظر ریتیلے راستے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی بہت دور ان پہاڑوں پر جا کر جم گئی جو تیز دھوپ میں لرزتے محسوس ہو رہے تھے' اس نے آہستگی سے کہا۔

"ریگستان سہل نہیں ہوتے بل! یہ دشوار کیوں ہوتے ہیں اس کی ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کا اپنا ایک اسرار ہے' ایک الجھاؤ ہے' میں تو اتنا جانتا

ہوں کہ یہ بہت مہربان اور شفیق ہوتے ہیں بالکل ایک عورت کی مانند جتنا جتنا پڑھو گے ان کے اسرار کھلتے چلے جائیں گے۔" وہ بل کی طرف مڑا۔ "اگر تم چاہو تو آ گیلا واپس آنے کے بعد مجھ سے الگ ہو سکتے ہو' یقین کرو کہ مجھے قطعی دکھ نہیں ہو گا۔"

بل نے کوئی جواب نہیں دیا' اس نے تھیلی اٹھائی اور پانی پینے لگا پھر چلو میں پانی بھر کر سر بھگونے لگا' اس نے تھیلی میں کارک لگا کر چارلی کے حوالے کیا اور ٹینکر سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا میکسویل آئل کمپنی کا یہ کھٹارا تمہیں مہنگا نہیں پڑا؟ یہ تیس ہزار میل پہلے ہی چل چکا ہے۔" اس نے چارلی کو مخاطب کیا۔

"یہ میرے لیے بالکل ٹھیک ہے۔"

"تم نے اس پر سے میکسویل آئل کمپنی کے نشانات بھی نہیں مٹائے' گویا تم مفت میں کمپنی کی پبلسٹی کر رہے ہو۔"

جواب میں چارلی نے تھیلی اٹھائی اور کارک ہٹا کر پانی پینے لگا۔ دو چار گھونٹ پانی پینے کے بعد اس نے تھیلی رکھ دی اب اس کی نظر دور افق پر جمی ہوئی تھی۔ اس سمت جدھر سے وہ آئے تھے' بہت دور غبار سا اٹھ رہا تھا اور وہ غبار لحظہ بہ لحظہ قریب آتا جا رہا تھا۔

"بہت تیز گاڑی چلا رہے ہیں' ان کی گاڑی الٹ بھی سکتی ہے۔" چارلی بڑبڑایا۔ بل بھی اسی سمت دیکھ رہا تھا' وہ چارلی کے قریب جاتے ہوئے بولا۔

"ریت پر اتنی تیز رفتاری احمقانہ حرکت ہے' میرا خیال ہے کہ وہ ہائی وے سے بھٹک گئے ہیں' وہ ہائی وے سے یقیناً چالیس میل ادھر نکل آئے ہیں۔"

"نہیں مشکل سے بیس یا پچیس میل۔" چارلی نے غبار کی سمت نظر جمائے ہوئے کہا۔

غبار چکراتا بل کھاتا تیزی سے قریب آتا جا رہا تھا پھر غبار کے درمیان انہیں سیاہ رنگ کی ایک پونٹیاک کار دکھائی دی۔ کار کی رفتار بہت تیز تھی' سامنے ٹینکر دیکھ کر ڈرائیور نے کار کو ذرا ہٹ کر ریت پر سے نکالنا چاہا بس یہی اس کی غلطی تھی کار کے پہیے ریت میں دھنس گئے اور وہ لہراتی ہوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر ریت کے ایک تودے سے جا ٹکرائی۔ ٹائر بڑے زور سے چرچرائے تھے اور کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز بلند ہوئی تھی۔

چارلی اور بل دوڑ کر کار کے قریب پہنچے' بل نے ہینڈل گھما کر کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اندر دیکھنے لگا' اندر ایک کمسن لڑکی سکڑی ہوئی گٹھری کی صورت میں پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پیر ڈوری سے بندھے ہوئے تھے اور منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا' لڑکی کی حالت بہت خراب تھی وہ ابھی حیران نگاہ سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے مزید حیران ہونا پڑا' اس کے سینے کی طرف ایک ریوالور کی نال اٹھی ہوئی تھی اور وہ ریوالور ایک دبلے پتلے شخص کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا' وہ شخص اگلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک فربہ شخص بیٹھا ہوا تھا۔

دبلا پتلا شخص' بل اور چارلی سے تنبیہ کے انداز میں بولا۔

"تم دونوں ذرا دور رہو تو بہتر ہے اور دیکھو ہیرو بننے کی بالکل کوشش نہ کرنا۔"

چارلی' بل کا بازو پکڑتے ہوئے چند فٹ پیچھے ہٹ گیا۔ دبلے پتلے شخص نے ریوالور کا رخ ان کی طرف کیے ہوئے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔

"لاری! لڑکی کا کیا حال ہے۔" فربہ شخص نے عقبی نشست کا جائزہ لیا اور بھاری آواز میں بولا۔

"ٹھیک ہے، بس ذرا سی ہوئی ہے۔"
"اچھا ٹھیک ہے، اب تم اتر کر ذرا گاڑی کا جائزہ لو، دیکھو کام چل سکتا ہے یا نہیں۔"
لاری نے باہر آکر گاڑی کا جائزہ لیا اور اعلان کیا کہ گاڑی استعمال کے قابل نہیں رہی۔ گاڑی واقعی استعمال کے قابل نہیں رہی تھی، اس کا ایکسل ٹوٹ گیا تھا اور بریک بھی بے کار ہو گئے تھے۔ وہ دبلے پتلے شخص کو مخاطب کر کے بولا۔
"یہ حادثہ ان دونوں کی وجہ سے ہوا، نہ ان کا ٹینکر راستے میں کھڑا ہوتا اور نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ کیا خیال ہے ٹونی انہیں جہنم رسید نہ کر دیا جائے؟" ٹونی جھنجلاہٹ میں ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔
"بکواس نہ کرو، تم اچھے ڈرائیور نہیں ہو، تم نے بیڑا غرق کر دیا۔" پھر اس نے چارلی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "اولڈ مین! سرحد یہاں سے کتنی دور ہو گی؟" چارلی کے چہرے کی رگیں کھنچ گئیں۔
"ساٹھ ستر میل کے قریب۔" اس نے کہا۔
"اور اگر ہم واپس ہائی وے کی طرف جائیں تو کتنا فاصلہ ہو گا۔" بل کچھ کہنے والا تھا مگر اس سے پہلے چارلی بول پڑا۔
"چالیس میل کے قریب، کچھ آگے پیچھے بھی ہو سکتا ہے۔"
ٹونی گاڑی سے نکل آیا اور ریوالور لہراتے ہوئے بل سے بولا۔
"تم ادھر آؤ ہیرو! ذرا اس لڑکی کو باہر نکالو۔"
بل کے جبڑے بھنچ گئے، وہ بڑی تیزی سے ٹونی کی طرف بڑھا مگر اس لمحے ٹونی کے ریوالور سے ایک دھماکا ہوا اور گولی بل کے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ بل کے بازو پر ایک سرخ خراش ابھر آئی اور وہ اپنی جگہ جیسے جم کر رہ گیا۔
"قلابازی دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے تمہیں لڑکی کو باہر نکالنے کے لیے کہا تھا۔" ٹونی ہنستے ہوئے بولا۔
بل کی آنکھیں مارے غصے اور اشتعال کے دہکنے لگی تھیں۔ اس نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھول کر وہ آہستگی اور نرمی سے لڑکی کے ہاتھ اور پاؤں کھولنے لگا پھر اس نے بڑی آہستگی سے لڑکی کو گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔
بل نے لڑکی کو کھڑا کیا تو وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہ ہو سکی اور بے سدھ سی ہو کر ریت پر گر گئی۔ اس کی کلائیوں پر نشان ابھر آئے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ چارلی تیزی سے آگے بڑھا اور آہستہ سے اس کے ہونٹوں پر سے ٹیپ ہٹا دیا۔ لڑکی کی پتلیوں میں حرکت ہوئی اور اس نے منہ کھول کر گہرا سانس لیا پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے گرد سے اٹے چہرے کو بھگونے لگے۔
چارلی نے ٹونی کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور کی پروا کیے بغیر لڑکی کو اٹھایا اور ٹینکر کے سائے میں لے جا کر لٹا دیا پھر کیبن سے پانی کی دو تھیلیاں نکال لایا۔ ان میں سے ایک تقریباً خالی ہو چکی تھی دوسری بھری ہوئی تھی۔ بوڑھے چارلی نے بڑی محبت سے تھیلی کا منہ لڑکی کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ لڑکی بیتابانہ پانی پینے لگی۔ پانی بہہ بہہ کر اس کی تھوڑی اور سینے کو بھگونے لگا۔
اچانک لاری نے اپنی جگہ سے جنبش کی، وہ تیزی سے چلتا ہوا چارلی کے قریب پہنچا اور دوسری تھیلی اٹھا کر منہ سے لگالی چند گھونٹ میں تھیلی خالی ہو گئی تو اس نے وہ تھیلی پھینک دی اور لڑکی کے ہونٹوں سے لگی

ہوئی تھیلی چھین کر پانی پینے لگا۔
"تم نے اس لڑکی کو پانی کب پلایا تھا؟" چارلی نے سرد لہجے میں ٹونی سے پوچھا، وہ انہی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا تھا۔
"سفر کے آغاز میں ہم نے اسے پانی پلا دیا تھا، اسے مزید پانی کی ضرورت نہیں ہے۔"
"بے وقوف آدمی! یہ اگلے پندرہ منٹ میں پیاس سے مر جاتی۔ گرمی نے اسے خشک کر کے رکھ دیا ہے۔" چارلی برہمی سے بولا۔ "لاؤ مجھے تھیلی واپس کرو۔" چارلی کے لہجے میں تحکم تھا یا درخواست، بہرحال ٹونی ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر اس نے لاری سے تھیلی چھین کر چارلی کے حوالے کر دی، چارلی نے دوبارہ تھیلی لڑکی کے ہونٹوں سے لگا دی۔ چند لمحے بعد اس نے تھیلی لڑکی کے ہونٹوں سے ہٹا لی اور شفقت سے بولا۔
"بس اتنا کافی ہے ورنہ تم بیمار پڑ جاؤ گی۔" وہ تھیلی کو ٹونی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لو تمہیں اس کی ضرورت ہے۔"
ٹونی نے تھیلی لے لی اور گھونٹ گھونٹ لے کر پانی پینے لگا۔ چارلی دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا اور تسلی آمیز کلمات کے ذریعے اس کا خوف دور کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ لڑکی کی خوف سے پھیلی ہوئی آنکھیں اعتدال پر آتی گئیں اور چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔
"تم اسے کہیں سے اغوا کر کے لائے ہو کیوں؟" چارلی نے ٹونی سے پوچھا۔
"ضرورت سے زیادہ زبان نہ ہلاؤ، سمجھے اولڈ مین۔" ٹونی ریوالور کو لہراتے ہوئے بولا۔
چارلی اس کی دھمکی کو نظر انداز کرتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔
"اور تم اسے لے کر سرحد پار کرنا چاہتے تھے، اس لڑکی کی عمر بامشکل نو سال ہو گی اور تم نے اس بری طرح اس کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے تھے۔ کیا تم اس سے خوف زدہ تھے؟" چارلی کا انداز استہزائیہ تھا۔
"میں کہتا ہوں خاموش رہو۔" ٹونی بگڑ کر بولا۔
چارلی رکا نہیں، کہتا رہا۔ "اور تم اس قدر بے وقوف ہو کہ تمہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کوئی شخص اس بلا کی گرمی میں مر بھی سکتا ہے۔"
"کیا فرق پڑتا ہے، یہ لڑکی یوں بھی زندہ نہیں رہے گی۔" اچانک موٹا لاری بول اٹھا۔
"لاری! تم بکواس بند نہیں کرو گے۔" ٹونی اپنے ساتھی پر برہم ہو گیا۔ چارلی سر ہلاتے ہوئے بولا۔
"تم نے سوچا کہ یہ لڑکی تمہارے لیے خطرہ بن سکتی ہے، یقیناً یہ تمہارے فرار کی نشاندہی کر دے گی اور موقع آنے پر شناخت بھی کر لے گی، اس لیے یہی بہتر ہے کہ اس ریگستان میں اس کے سر میں ایک گولی اتار دو اور چلتے بنو۔ کیوں میں صحیح سوچ رہا ہوں نا؟"
ایک لمحے کے لیے ٹونی کے چہرے کا رنگ بدل گیا مگر دوسرے ہی لمحے کسی خیال کے تحت اس کا چہرہ چمکنے لگا۔
"تم نے کہا تھا کہ اگر کچھ دیر اور لڑکی کو پانی نہ ملتا تو وہ مر جاتی۔"
"لڑکی کیا، ہر شخص کے ساتھ یہی صورت ہوتی۔"
"ہمیں فونیکس سے چلے ہوئے صرف چار گھنٹے ہوئے ہیں گویا تمہارے خیال میں گرمی اتنی جلدی اپنا اثر دکھانے لگتی ہے کہ آدمی پیاس سے مر جائے؟"
"اس ریگستان میں آدمی چار گھنٹے سے بھی کم عرصے میں جان دے دیتا ہے بشرطیکہ اسے پانی کا ایک قطرہ بھی نصیب نہ ہو۔" بل نے کہا اور پانی کی

تھیلی کے لیے ٹونی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
ٹونی نے فوراً ریوالور سیدھا کرلیا اور سخت لہجے میں بولا۔
"اپنا ہاتھ دور رکھو' تم تینوں اسے پہلے ہی کافی خالی کرچکے ہو۔ اب یہ ہمارے ساتھ سرحد تک جائے گی۔" یہ کہہ کر وہ لاری کی طرف مڑا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ "کیا اس چھکڑے کو چلا سکتے ہو؟" اس کا اشارہ ٹینکر کی طرف تھا۔
"بڑی آسانی کے ساتھ۔" لاری نے جواب دیا۔
"تو پھر کار کا سامان اس ٹینکر میں منتقل کردو' کار سے محروم ہونے کے باوجود ہم گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔ سرحد پار کرنے کے بعد اس کھٹارے کی اچھی قیمت مل جائے گی۔" وہ دوبارہ چارلی کی طرف مڑا۔
"ڈیڈی! یہ سڑک کس مقام پر سرحد سے جا ملتی ہے؟"
"سونوٹا کے مقام پر' تقریباً بیس میل مشرق کی طرف ہٹ کر۔"
"اور تم نے کہا تھا کہ سونوٹا تک کا فاصلہ ستر میل کے قریب ہے خیر وہاں سے قریب ترین آبادی کون سی ہے؟"
"آک چن! یہ ریڈ انڈینز کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے' اس کا مطلب ہے کہ تم ہمیں قتل کرکے ٹینکر اڑا لے جانا چاہتے ہو مگر میں تمہیں بتادوں کہ اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا' یہ ٹینکر کوئی خاص قیمت نہ دے سکے گا۔"
"انہیں ٹینکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے چارلی!" بل بولا۔
"یہ تو بس کسی طور پر یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں' تاوان کی رقم تو یہ پہلے ہی وصول کرچکے ہوں گے' کیوں میں صحیح کہہ رہا ہوں نا؟" وہ ٹونی کی طرف مڑا۔
"بالکل صحیح کہہ رہے ہو' ہمیں اس سودے میں پچاس ہزار ڈالر کا فائدہ ہوا ہے' ہمیں واقعی اس ٹینکر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' ہم تو بس یہاں سے نکل جانا چاہتے ہیں۔ اولڈ مین ہمیں اس راستے کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔" اس نے چارلی کو مخاطب کیا۔
"سرحد تک سوائے ریت اور ریت کے تودوں کے کچھ اور نہیں ہے' فاصلے کے ساتھ ساتھ حدت اور تپش بڑھتی جاتی ہے۔"
"اور وہ گاؤں' آک چن؟"
"وہ یہاں سے تیس میل کے فاصلے پر ہے' سڑک سے دائیں جانب' اب تم ہم پر ایک مہربانی کرو کہ ہمیں شوٹ کردو ہم اس گرمی میں تڑپ تڑپ کر مرنا نہیں چاہتے۔" بل کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھیل گئیں اور لڑکی کے جسم میں بھی ایک اضطراری حرکت پیدا ہوئی۔
ٹونی ان کے خوف سے بہت محظوظ ہوا' اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی' جیسے وہ ان کے متوقع انجام کو چشم تصور سے دیکھ رہا ہو' وہ ٹینکر کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔
"تم اس گرمی کو کتنی دیر تک سہہ سکتے ہو؟ میری مراد تم تینوں سے ہے' کیا تم لوگ یہاں سے صحیح سلامت نکل سکو گے؟"
"کوئی بھی شخص پانی کے بغیر چار پانچ میل سے آگے نہیں جاسکتا اور اس لڑکی کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ویسے اگلے دو گھنٹوں میں گدھ ہماری لاشوں پر منڈلانے لگیں گے اگر ہمیں پانی نصیب نہ ہوا۔"
چارلی نے جواب دیا' اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔
لاری دو سوٹ کیس لیے ہوئے آیا اور انہیں ٹینکر کے اگلے حصے میں رکھ دیا' اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی دبا ہوا تھا۔ چارلی کو یقین تھا کہ اس بریف کیس میں تاوان کی پچاس ہزار ڈالر رقم موجود ہوگی۔ لاری ٹونی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔
"ہے تو یہ چھکڑا مگر بالکل ہی بے مصرف نہیں ہے' ہم اس میں موجود تیل کو بیچ کر نئی کار خرید لیں گے۔"
بل نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر چارلی نے فوراً اس کا ہاتھ دبادیا۔
"تم کچھ کہنا چاہتے تھے ہیرو!" ٹونی مضحکہ اڑانے کے انداز میں بل سے مخاطب ہوا۔
"ریوالور ہاتھ میں لے کر بہت بہادر بن رہے ہو' ذرا ریوالور ایک طرف رکھ دو پھر دیکھوں کہ تم میں کتنا دم ہے۔"
"اوہ یہ بات ہے۔" ٹونی کی بھویں سکڑ گئیں' اس نے ریوالور لاری کے حوالے کردیا اور بل کے قریب جاکر اس کے چہرے پر ایک بھرپور طمانچہ جڑ دیا۔ بل اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ لاری للکارتا ہوا بولا۔
"خبردار! اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرنا۔ نہ بلاوجہ مجھے ایک گولی ضائع کرنی پڑے گی۔"
"شکر ہے خدا کا یہ تو بہت اچھی بات ہے' ہم پیاس سے مرنے سے بچ جائیں گے۔" بوڑھا چارلی مسرت سے چہکتے ہوئے بولا۔
"لاری گولی مت چلانا۔" ٹونی چیخ کر بولا۔ "اگر ان کے جسم میں کوئی سوراخ نمودار ہوا اور تفتیش ہوئی تو بلاوجہ مسئلہ بنے گا۔"
بل نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا' وہ بڑی مشکل سے غصے کے سبب اپنے کانپتے ہوئے جسم پر قابو پانے میں کامیاب ہوا تھا۔
"تو تم ہمیں شوٹ نہیں کرو گے' ہمیں پیاسا مرنے کے لیے چھوڑ جاؤ گے؟" چارلی حسرت و یاس کے عالم میں بولا۔ اس کے چہرے پر افسردگی دوڑ گئی تھی۔
"نہیں تم پیاسے نہیں مرو گے' جب پیاس لگے تو تصور میں ہمیں پانی پیتے ہوئے دیکھ لینا۔" ٹونی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے بولا۔ "اچھا گڈ بائی! پانی کی تھیلی کے لیے شکریہ۔"
ٹونی اور لاری ٹینکر میں جاکر بیٹھ گئے' اگلے لمحے ٹینکر کا انجن جاگا اور آہستہ آہستہ ٹینکر آگے بڑھنے لگا پھر لحہ بہ لحہ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی' لڑکی اٹھ کھڑی ہوگئی تھی وہ تینوں دور جاتے ہوئے ٹینکر پر نظریں جمائے کھڑے رہے۔
ٹینکر نظروں سے اوجھل ہوگیا تو بل چارلی کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔
"گولی کی موت نصیب میں نہیں تھی اب ہم گرمی اور پیاس سے مرنا پسند کریں گے۔" بل کے لہجے میں تلخی اور طنز تھا۔
"میں مرنا نہیں چاہتی۔" لڑکی نے پہلی بار زبان کھولی' اس کا چہرہ ابھی تک خوف و دہشت سے سفید پڑا ہوا تھا۔
"نہیں تم نہیں مرو گی' ہم میں سے کوئی بھی نہیں مرے گا۔" چارلی' لڑکی کا سر سہلاتے ہوئے محبت سے بولا۔ اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔
بل اسے عجیب سی نگاہ سے گھورنے لگا جیسے اسے چارلی کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔
"سب سے پہلے تو ہمیں کار کے سائے میں چلنا چاہیے پھر جب سورج ڈھل جائے گا تو ہم واپس ہائی وے کی طرف روانہ ہوں گے۔ وہاں کوئی نہ کوئی بندوست ہو ہی جائے گا۔"
"اور پانی؟ پانی کا کیا ہوگا؟" بل نے قدرے

حیرانی سے پوچھا۔
"پانی کا بھی بندوبست ہوجائے گا' تم ریت پر پڑی ہوئی خالی تھیلی اٹھالو' کار کے ریڈی ایٹر سے تین چار گیلن پانی آسانی سے نکالا جاسکتا ہے' جب ہم چلنے لگیں گے تو آگ جلادیں گے تاکہ کوئی ادھر سے گزرنے والا ہماری طرف متوجہ ہوسکے۔"
"آگ؟"
"ہاں کار کی ٹنکی میں اتنا پیٹرول تو ہوگا کہ وہ دیر تک کار کے ڈھانچے کو جلائے رکھے اگر کسی نے کار کو نہ بھی دیکھا تو کوئی حرج نہیں' ہم پانچ چھ گھنٹے میں ہائی وے پر پہنچ جائیں گے خواہ کتنے ہی آہستہ چلیں۔"

❁ ...... ❁ ...... ❁

دوسرے دن سہ پہر دو بجے کے قریب ریاستی پولیس کی ایک کار ٹینکر سے پچاس گز کے فاصلے پر رکی' ایک پولیس آفیسر بہت محتاط انداز میں کار سے اترا۔
دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بوڑھا چارلی بھی کار سے باہر آگیا۔ اس نے پولیس آفیسر کو ریوالور نکالتے دیکھ کر کہا۔
"مجھے امید نہیں کہ اس کی ضرورت پیش آئے۔"
"ہوسکتا ہے وہ زندہ ہوں' امکان کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔"
چارلی نے سفید و شفاف آسمان پر نگاہ جمادی' بلندی پر کچھ گدھ اڑ رہے تھے جن کا فاصلہ زمین سے کم ہوتا جارہا تھا۔
"نہیں' وہ زندہ نہیں ہیں' میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔" چارلی نے بڑے وثوق سے کہا۔
پولیس آفیسر خود کو سمیٹے سکیڑے ٹینکر کی طرف بڑھتا گیا' چارلی کی یقین دہانی کے باوجود اس کے ہاتھ میں ریوالور دبا رہا۔ ٹینکر کے قریب پہنچ کر اس نے دروازے کا ہینڈل پکڑا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی موٹے آدمی کی لاش لڑھک کر ریت پر آرہی' اس کی داہنی آنکھ میں ایک سوراخ تھا جس میں خون جم کر خشک ہوچکا تھا' ایک دوسری لاش اسٹیئرنگ وہیل پر ٹکی ہوئی تھی۔
"ایک گھونٹ پانی کے لیے جھگڑا ہوا ہوگا۔" پولیس آفیسر بڑبڑایا۔
"اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے انجن سیز ہوجانے کے بعد وہ خود بھی پیاس سے تڑپ کر مرگیا ہوگا۔" چارلی نے بڑے پرسکون انداز میں بات آگے بڑھائی۔
"پانی؟ کیا وہ محض پانی کے نہ ہونے کے باعث مرگئے؟" پولیس آفیسر ہنستا ہوا بولا۔ "جبکہ اس ٹینکر کے پچھلے حصے میں چھ سو گیلن پانی موجود ہے۔"
وہ ٹینکر کے عقبی حصے میں آیا اور موٹے پائپ کا والو گھمادیا۔ پانی کی موٹی دھار زوردار آواز کے ساتھ ریت پر گرنے لگی۔ پولیس آفیسر نے چلو میں پانی لے کر منہ دھویا' دو تین گھونٹ پانی پیا اور والو بند کردیا۔
"غلطی میری ہے۔" بوڑھے چارلی نے مدھم لہجے میں کہا۔ "اب میں پہلا کام یہ کروں گا کہ اس پر سے میکسویل آئل کمپنی کے الفاظ مٹوادوں گا' میں ان الفاظ کی جگہ نیلے اور سفید حروف میں واضح طور پر "ڈیوی اینڈ سن واٹر کنٹریکٹرز" لکھوادوں گا۔"

درندہ

خورشید پیرزادہ

انسانی اقدار اگر بدل جائیں تو معاشرہ ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں بظاہر انسان رہتے ہیں لیکن ان کی خصلتیں درندوں سے بھی بدتر ہوجاتی ہیں۔ درندے اس وقت ہی کسی جانور کا شکار کرتے ہیں جب بھوک ان کی ہر حس پر غالب آجاتی ہے' ورنہ عام حالت میں وہ کسی پر حملہ نہیں کرتے لیکن جب انسان درندہ بن جاتا ہے تو بلاوجہ اپنے جیسے انسان کو بھنبھوڑنا اس کی فطرت بن جاتی ہے۔ کسی کو قتل کرنے کے لیے وہ کوئی جواز تلاش نہیں کرتا۔ جیسا کہ آج ہمارے پورے ملک خصوصاً کراچی کی گلیوں میں ہو رہا ہے۔ وہاں روزآنہ تشدد زدہ بوری بند لاشیں ملتی ہیں۔ خودکش اور پلانٹڈ بم دھماکے ہوتے ہیں' جن میں درجنوں معصوم بچے' خواتین' بوڑھے اور جوان ہلاک ہوجاتے ہیں' نہ مارنے والے کو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیوں مار رہا ہے' نہ مرنے والے کو کہ اسے کیوں قتل کیا جارہا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ انسان درندہ بن چکا ہے۔ درندگی خون بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہی ہے۔

نئے افق کے قارئین کے لیے خورشید پیرزادہ کی دلچسپ تحریر

سطر سطر تجسس لفظ لفظ ہنگامے لئے ایک طویل ناول

شرفو' نشاء کے گھر کا پرانا ادھیڑ عمر ملازم تھا۔ اسے دیکھتے ہی نشاء نے اپنی عریانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔
"چھوٹی بی بی...... آہ ہ ہ۔" شرفو کراہ کر بولا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔
درندے نے شرفو کو کمرے میں پھینکا تھا جس کی آواز سے نشاء نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ شرفو کے پیچھے نقاب پوش درندہ اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے کھڑا تھا۔
"اب تم کیا چاہتے ہو؟" نشاء نے روتے ہوئے پوچھا۔
"جب تک وردا کو میرے حوالے نہیں کیا جاتا۔ تب تک کیوں نہ ایک آدھ کھیل اور کھیلا جائے۔" درندہ بولا۔
"اب تم کون سا کھیل کھیلنا چاہتے ہو۔ پلیز مجھے جانے دو۔" نشاء بری طرح رو رہی تھی۔
"واہ۔ کیا خوف ہے تمہاری آنکھوں میں۔ شاندار۔ سچ میں مزا آگیا۔ ایسا خوف کبھی کبھی ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اب تو اور بھی زیادہ مزا آئے گا۔"
"مجھے یہاں کیوں لائے ہو بھائی۔" شرفو نے پوچھا۔
"تم ڈرو مت۔ بلکہ فخر کرو کہ تم میرے فن کا حصہ بننے جارہے ہو۔"
شرفو کو بھلا اس کی باتیں کہاں سمجھ آتیں۔
"بہت سادہ سا کھیل ہے۔ یہ خنجر دیکھو۔" درندے نے ہاتھ میں پکڑے خنجر کو لہراتے ہوئے کہا۔
شرفو بڑی حیرانی سے سب سن رہا تھا۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہورہے تھے۔
"دیکھو تمہارے پاس تین آپشن ہیں۔ پہلا آپشن یہ ہے کہ یہ خنجر لو اپنے ہاتھ سے اپنا پیٹ چیر لو۔ اگر تم ایسا کرلو گے تو میں تمہاری چھوٹی بی بی کو جانے دوں گا۔"
شرفو نے نشاء کی طرف دیکھا۔ یہ سب سن کر اس کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

”دوسرا آپشن یہ ہے کہ تم یہ خنجر لو اور نشاء کا پیٹ چیر ڈالو۔ اس کا پیٹ چیرنے کے بعد تم یہاں سے جا سکتے ہو۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ پرامس۔“

شرفو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”نن...... نہیں۔“ وہ ہکلاتے ہوئے بولا تھا اور وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ درندے نے پیچھے سے اس کی گردن میں خنجر پیوست کر دیا تھا اور پھر بڑی بے رحمی سے خنجر کو نیچے کی جانب کھینچا اور شرفو کی پیٹھ چیر ڈالی۔ وہ تڑپ کر پلٹا اور لہرا کر بستر پر گر پڑا نقاب پوش نے شرفو کی ٹانگ پکڑی اور اسے نشاء کے اوپر سے کھینچ کر فرش پر پٹخ دیا۔

”تم قاتل ہو...... قاتل۔ صرف تمہاری وجہ سے دو معصوم انسانوں کا قتل ہوا ہے۔ ذریعہ میں بنا ہوں تو کیا ہوا...... ہوئے تو تمہاری ہی وجہ سے ہیں نا۔“ درندے نے یہ کہتے ہوئے نشاء کو بالوں سے پکڑا اور اسے گھسیٹ کر شرفو کی لاش کے اوپر پھینک دیا۔ ”اس کے ساتھ اب تم بھی مرو گی......“

درندے کے لہجے میں دنیا بھر کا زہر بھرا ہوا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سنگدلی کا آئینہ دار تھا۔ پھر کمرے میں درندگی کا وہ کھیل ہوا جسے دیکھ کر کسی کی بھی روح کانپ جائے۔ اس نے بڑی بے رحمی سے نشاء کو کاٹ ڈالا اور نشاء کو دم توڑتے زیادہ دیر نہیں لگی۔ مگر درندے کے خنجر کی پیاس ختم نہیں ہوئی۔ وہ نشاء کے مردہ جسم پر وار کرتا ہی جا رہا تھا۔

”میرا سارا کھیل خراب کر دیا تم نے اس کی سزا تو تم کو ملنی ہی تھی نا۔“ پھر وہ نہ کیا کیا بکتا رہا اور خنجر بار بار نشاء کے جسم میں پیوست ہوتا رہا۔

کمرے میں اس وقت جو منظر تھا اسے دیکھ کر کسی بڑے سے بڑے دل گردے کے مالک انسان کا بھی ہارٹ فیل ہو سکتا تھا۔ ایک ایسا منظر جس کی منظر کشی سے قلم قاصر تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

رفیق، بھولو کے ساتھ شہر کا چکر لگا رہا تھا۔

”سر وہ درندہ، بغیر کسی مطلب کے لوگوں کو کیوں مار رہا ہے۔ آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ بھولو نے پوچھا۔

”شاید وہ ایک نفسیاتی مریض ہے۔ پاگل ہو گیا ہے وہ۔ ایک بار مل جائے مجھے۔ سالے کی ساری نفسیات دھو ڈالوں گا۔“

اچانک ان کی جیپ کے آگے سے ایک بائیک نکلتی چلی گئی۔

”یہ کون گھوم رہا ہے بائیک پر۔ وہ بھی اتنی رات کو۔“ رفیق نے جیپ کی اسپیڈ بڑھا کر بائیک کا راستہ روکا اور سوار کو رکنے پر مجبور کیا۔

”یہ تو مراد ہے؟“ بھولو نے کہا۔

”کون مراد؟“ رفیق نے پوچھا۔

”میرے گھر کے پاس ہی رہتا ہے سر۔“

”تم اتنی رات کو کہاں گھوم رہے ہو۔ کسی کا خون کر کے تو نہیں آ رہے۔“ رفیق نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”میں اپنی ڈیوٹی سے آ رہا ہوں اب گھر جا رہا ہوں۔“ مراد نے جواب دیا۔

”کیا کام کرتے ہو؟“ رفیق نے پھر پوچھا۔

”پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسی میں کام کرتا ہوں۔“

”بہت خوب...... اس سیریل کلر کا ڈر نہیں ہے تمہیں؟“

”میرا دو بار سامنا ہو چکا ہے اس سے۔ اب اس سے ڈر نہیں لگتا۔ دوبارہ مجھے ملا تو بچے گا نہیں وہ اس بار۔“ درندے کا تصور کر کے مراد کو اپنی وہ تکلیف یاد آنے لگی جس کی وجہ سے اسے ایک ہفتہ اسپتال میں گزارنا پڑا تھا۔

”ہاں، میں نے فائل میں کیس پڑھا ہے۔ تو تم نے ہی اسے زخمی کیا تھا؟ ہے نا......“ رفیق نے کہا۔

”ہاں۔ پیٹ چیر دیا تھا میں نے اس کا۔“

”پھر تو اس کے پیٹ پر آپریشن یا پیٹ کی سلائی کا نشان ضرور ہونا چاہئے۔ اس طرف تو میرا خیال ہی نہیں گیا۔ یہ بہت اہم سراغ ہے۔“ رفیق نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کیا اب میں جا سکتا ہوں۔“ مراد نے پوچھا۔

”ہاں بالکل، ویسے کیا راستے میں تم نے کسی کو گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ کوئی آوارہ گرد وغیرہ۔“ رفیق نے کسی خیال کے تحت مراد سے استفسار کیا۔

”میں نے ایک مزار کے سامنے بلیک اسکارپیو کھڑی دیکھی تھی۔ مزار کے اندر سے ایک آدمی نکلا اور کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ میں اس کی شکل تو نہیں دیکھ پایا مگر یہ کچھ عجیب سا لگا۔“ مراد نے کہا۔

”کون سے مزار کی بات کر رہے ہو تم۔“ رفیق بولا۔

”بہت پرانا مزار ہے۔ اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔ میں بھی وہاں کبھی گیا نہیں۔“

”وہ جو بس اسٹینڈ کے سامنے ہے۔ کہیں تم اس کی بات تو نہیں کر رہے۔“ رفیق نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں...... ہاں...... وہی مزار۔“

”وہ مزار نہیں کھنڈر ہے میرے بھائی۔ مطلب یہ کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ بھولو جلدی چلو۔“ رفیق نے تیزی دکھاتے ہوئے کہا۔

”کیا میں بھی چل سکتا ہوں آپ کے ساتھ۔“ مراد بولا۔

”آ جاؤ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔“ رفیق نے اسے آنے سے منع نہیں کیا۔

مراد نے بائیک وہیں سڑک کے ایک طرف جھاڑیوں میں کھڑی کر دی اور خود جیپ میں بیٹھ گیا۔ رفیق پوری اسپیڈ سے جیپ سڑک پر دوڑانے لگا۔

رفیق کچھ ہی دیر میں مراد اور بھولو کے ساتھ اس پرانے کھنڈر پہنچ گیا جسے مراد کوئی مزار سمجھ رہا تھا۔ اس نے کھنڈر کے سامنے جیپ پارک کی اور پستول نکال لیا اور کھنڈر کے اندر داخل ہو گیا۔ کھنڈر میں کئی ٹوٹے ہوئے کمرے تھے جن کی دیواریں تو کسی قدر سلامت تھیں مگر چھتیں امتدادِ زمانہ کا شکار ہو کر کب کی ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔ رفیق نے ایک ایک کر کے ہر کمرے کا جائزہ لیا۔

ایک ٹوٹے ہوئے کمرے میں کچھ دیکھ کر رفیق نے بھولو کو آواز دی۔ ”بھولو ذرا ٹارچ دینا مجھے۔“

بھولو نے فوراً ٹارچ رفیق کے ہاتھ میں تھما دی اور جب رفیق نے ٹارچ کی روشنی اندر پڑے ڈھیر پر ڈالی تو تینوں کے ہوش اڑ گئے۔

”اوہ میرے خدا۔“ تینوں کے منہ سے نکلا۔

رفیق نے وقت گنوائے بغیر شہلا کو فون ملایا۔ رات کے ساڑھے تین بج رہے تھے اور شہلا گہری نیند میں تھی۔

”اس وقت کس کا فون ہو سکتا ہے۔“ شہلا نے بڑبڑاتے ہوئے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”اس وقت آپ کو ڈسٹرب کرنے کے لیے سوری میڈم۔“ رفیق نے کہا۔

”کیا بات ہے رفیق؟“ شہلا نے پوچھا۔

”آپ فوراً یہاں آ جائیں۔ دو تشدد زدہ لاشیں ملی ہیں۔“ رفیق نے سب بتاتے ہوئے شہلا کو لوکیشن سمجھائی۔

شہلا فوراً جیسے تیسے تیار ہو کر چار سپاہیوں کو لے کر اس کھنڈر کی طرف روانہ ہو گئی۔ کچھ ہی دیر میں شہلا ان کے پاس تھی۔

جب شہلا نے اپنی آنکھوں سے وہ منظر دیکھا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسے ایسے منظر کی توقع نہیں تھی۔

قاتل نے نشاء کا سر کاٹ کر شرفو کی گردن پر اور شرفو کا سر کاٹ کر نشاء کی گردن پر رکھ دیا تھا۔ دونوں لاشوں کو اس نے دیوار کے سہارے کھڑا کر رکھا تھا۔ اور دیوار پر ایک پیغام لکھا گیا تھا۔

"دو گنہگار۔ نشاء اور شرفو۔ آپ کے سامنے ہیں۔ یہ دونوں میرے فن کا منہ بولتا شاہکار ہیں۔"

"اف میرے خدا! یہ کم بخت تو انسانیت سے کوسوں دور لگتا ہے۔" شہلا نے کہا۔

"میڈم جب میں اسے پکڑوں گا تو اسے تھانے نہیں لاؤں گا۔ بلکہ ایسے ہی تڑپا تڑپا کر اس کا انکاؤنٹر کروں گا۔" رفیق کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ درندہ اسے مل جائے تو وہ اس کی بوٹیاں نوچ لے۔ یہی کیفیت مراد کی بھی ہو رہی تھی۔ جبکہ بھولو بیچارہ تو اتنی دیر سے اپنے حواس درست کرنے میں ہی مصروف تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ پھر کبھی میرے سامنے ایسی غیر قانونی بات مت کرنا۔ ہمیں جو بھی کرنا ہے قانون کے دائرے میں رہ کر کرنا ہے۔ ورنہ ہم میں اور اس درندے میں فرق ہی کیا رہ جائے گا۔" رفیق کی بات سن کر شہلا نے بھڑکتے ہوئے کہا۔

"کون سا قانون میڈم اسی قانون کا سہارا لے کر اس جیسے کتنے ہی مجرم عدالتوں سے باآسانی چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ سیاستدان کا لڑکا جسے میں نے ریپ کیس میں اندر کیا تھا آج بھی آزاد گھوم رہا ہے اور جس لڑکی کا ریپ ہوا تھا اس کے ساتھ کیا ہوا۔ جانتی ہیں آپ۔ اس بیچاری نے خودکشی کر لی تھی۔ کیا انصاف دے پائے ہم اس بیچاری کو۔ اس لڑکے کو میں جیل میں ڈالنے کی بجائے گولی مار دیتا تو بیچاری کو کچھ تو انصاف مل جاتا۔" رفیق مسلسل جذبات میں بہہ رہا تھا۔

"میں کہتی ہوں شٹ اپ...... اگر سب تمہاری طرح سوچنے لگیں گے تو لاء اینڈ آرڈر کی دھجیاں اڑ جائیں گی۔ اپنے آپ پر کنٹرول کرنا سیکھو۔ اور دوبارہ ایسی بات مت کرنا۔"

"نہیں کروں گا۔ مگر آپ خود سوچیں۔ کیا ایسا گھناؤنا کام کوئی انسان کر سکتا ہے۔ وہ تو انسان ہے ہی نہیں میڈم۔ جبکہ قانون اور عدالتیں انسانوں کے لیے بنائی جاتی ہیں۔ جانوروں پر کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا میڈم۔ جانور ہے وہ جانور، وہ بھی پاگل جانور اور پاگل جانور کو ہمیشہ گولی ہی ماری جاتی ہے۔ سیدھی سر میں...... تاکہ وہ مزید کسی اور کو نہ کاٹ کھائے۔" شہلا کی وارننگ کے باوجود رفیق کا غصہ ابل ابل کر باہر آ رہا تھا۔

"تم جذباتی ہو رہے ہو۔ بعد میں بات کریں گے۔" شہلا نے بات ختم کرنا درست سمجھا۔ "دونوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دو۔"

"کیا تم نے اس بلیک اسکارپیو کا نمبر نوٹ کیا تھا۔" رفیق نے مراد سے پوچھا۔

"نہیں۔ کیونکہ مجھے توقع نہیں تھی کہ یہاں ایسا کچھ ہوا ہوگا۔" مراد نے کہا۔

"شہر میں جس جس کے نام بلیک اسکارپیو ہے ان کا پتا کرو...... یہ بہت اہم سراغ ہے ہمارے لیے۔" شہلا نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"جی میڈم۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔"

"ٹارچ دو مجھے۔" شہلا بولی۔

رفیق نے ٹارچ شہلا کو پکڑا دی۔

شہلا نے بہت باریکی سے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا۔ "خون اس نے کہیں اور کیے ہیں اور لاشیں یہاں لا کر سجا دی ہیں۔ اس نے تو نشاء کے بدلے میں وردا کا

مطالبہ کیا تھا اور ابھی اس کی دی ہوئی ڈیڈ لائن بھی ختم نہیں ہوئی۔ آخر یہ چاہتا کیا ہے۔"

"وہ پاگل ہو گیا ہے میڈم اور کسی پاگل کو سمجھایا نہیں جا سکتا۔" رفیق نے کہا۔

"چلو فی الحال ان لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو اور ہاں خیال رکھنا کہ ابھی یہ خبر میڈیا کو نہ ہونے پائے۔ پورے شہر میں سنسنی پھیل جائے گی۔ لوگ ویسے ہی بہت ڈرے ہوئے۔" شہلا نے کسی خیال کے تحت رفیق سے کہا۔

"میں خیال رکھوں گا میڈم۔"

"ایک کام اور کرو۔ تمام پولیس کنٹرول رومز کو اس بلیک اسکارپیو کے بارے میں الرٹ کر دو۔"

"میں نے پہلے ہی کر دیا ہے میڈم۔ اب خود بھی راؤنڈ پر نکل رہا ہوں۔"

"گڈ۔ کیپ اٹ اپ۔" شہلا نے کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پولیس ڈپارٹمنٹ نے تو یہ خبر چھپالی۔ مگر صبح سویرے ہر چینل پر ایک ویڈیو دکھائی جا رہی تھی۔ یہ ویڈیو سیریل کلر نے بنائی تھی۔ کیمرہ لاشوں پر فوکس تھا اور بیک گراؤنڈ میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

"وردا...... دیکھو میں نے کتنے خوبصورت قتل کیے ہیں۔ میں ایک فنکار ہوں۔ تم مجھ سے ڈرو مت اور مجھے ایک موقع دو۔ میں سچ کہتا ہوں کہ تمہیں میرے ہاتھوں مر کر فخر محسوس ہوگا۔ بہت خوبصورت موت دوں گا تم کو۔ اتنی خوبصورت جتنی تم خود ہو۔ میں فنکار ہوں اور جانتا ہوں کہ خوبصورت لوگ ہی خوبصورت چیز کے حقدار ہوتے ہیں چاہے وہ موت ہی کیوں نہ ہو۔ اس دن بھی تم بلاوجہ مجھ سے ڈر کر بھاگ گئیں۔ تم بہت خوبصورت ہو وردا۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی پورے شہر میں نہیں ہے۔ صرف میں۔ ہاں صرف میں ہی ہوں جو تمہارے حسن کو خراج تحسین پیش کر سکتا ہوں۔ ان دونوں کا خون بھی میں نے تمہاری ہی وجہ سے کیا ہے۔ جب تک تم مجھے نہیں مل جاتیں تب تک ایسے شہ پارے شہریوں کو دیکھنے کے لیے ملتے رہیں گے۔ سب کی بھلائی اسی میں ہے کہ تم میرے پاس آ جاؤ اور ایک خوبصورت اور حسین موت کو قبول کر لو۔ یہ مت سوچنا کہ اگر تم میرے پاس نہیں آؤ گی تو بچ جاؤ گی...... تم کو مرنا تو ہے ہی...... تم بھاگ سکتی ہو لیکن چھپ نہیں سکتیں۔ تمہیں تو میں ایک خوبصورت موت دے کر ہی رہوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں نے آج تک تم جیسی حسین لڑکی کو نہیں مارا...... کیا تم میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتیں۔ ہا...... ہا...... ہا۔"

ٹی وی پر بار بار یہ ویڈیو دکھائی جا رہی تھی۔

"یہ میڈیا والے بھی صرف اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اور مجرموں کا کام آسان کر دیتے ہیں۔ بار بار یہ ویڈیو دکھانے کا مقصد کیا ہے۔ سنسنی پھیلانے میں یہ اس درندے کا پورا پورا ساتھ دے رہے ہیں اور وہ جو خوف و دہشت کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔" رفیق نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں بیٹا۔ نکل گئی ساری ہوا۔ اب تم سوچ رہے ہو گے کہ تم معطل ہی اچھے تھے۔ ہیں نا رفیق مغل۔" چوہان نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

"جتنے دن یہ کیس آپ کے پاس رہا۔ اتنے دن میرے پاس ہوتا تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔ ویسے رات کو آپ کہاں تھے۔ ڈی ایس پی صاحبہ تو موقعہ واردات پر پہنچ گئی تھیں۔ مگر آپ نہیں پہنچے آخر کہاں مصروف تھے آپ......؟"

"میں کہیں بھی تھا اس سے تمہیں کیا۔ اپنے کام سے کام رکھو۔ ہونہہ......" چوہان ہونٹ سکوڑ کر وہاں

سے چلا گیا۔

"مجھے تو اس چوہان پر بھی شک ہے۔ کوئی انکوائری ٹھیک سے نہیں کی اس نے۔ ڈی ایس پی صاحبہ بھی کہہ رہی تھیں کہ ان پر پولیس ڈپارٹمنٹ کی گولی چلائی گئی تھی۔ اس چوہان پر بھی نظر رکھنی پڑے گی۔" رفیق بڑبڑانے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

جب وردا نے ٹی وی پر خبریں دیکھیں تو اس کے پاؤں تلے جیسے زمین ہی نکل گئی۔ خبریں سن کر اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ درندے کے ایک ایک لفظ نے اس کی روح تک کو کانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"بیٹا تم کچھ دنوں کے لیے کہیں مت جاؤ۔ بس یہیں گھر پر ہی رہو۔" وردا کی امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا تمہاری امی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ جب تک یہ وحشی درندہ پکڑا نہیں جاتا تم گھر میں رہو۔ روز آفس آنے جانے میں تمہاری جان کو خطرہ لاحق رہے گا۔" اس کے والد نے بھی سمجھایا۔

صبح کی روشنی پھیلنے کے بعد راجو سپاہیوں کو ہوشیار رہنے کا کہہ کر جیپ میں ہی سو گیا تھا۔ چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی جو تھی اور تھوڑی نیند پوری کرنا بھی اس کی فطری مجبوری تھی۔ مگر ساڑھے نو بجے وہ بالکل تیار تھا وردا کے ساتھ آفس جانے کے لیے۔ وہ اس کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن جب دس بج گئے تو اس نے گھر کی بیل بجائی۔ وردا کے ابو نے دروازہ کھولا۔

"کیا وردا جی آج آفس نہیں جائیں گی۔" راجو نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا آج وہ آفس نہیں جائے گی۔ میں اپنی بیٹی کو کھونا نہیں چاہتا۔" وردا کے والد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کیا بات ہے۔ آپ پریشان کیوں لگ رہے ہیں۔" راجو نے وجہ پوچھی۔

"کیا تمہیں کچھ نہیں پتہ......؟ اوہ ہاں تم تو باہر بیٹھے رہتے ہو۔ آؤ ٹی وی پر نیوز دیکھو۔ سب سمجھ جاؤ گے۔"

راجو اندر آ گیا۔ وردا سامنے والے صوفے پر اپنی امی کے کندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ جب راجو نے نیوز دیکھی تو اس کے بھی ہوش اڑ گئے۔ کھنڈر کا پورا منظر دکھایا جا رہا تھا لیکن جب درندے نے وردا کے بارے میں بولنا شروع کیا تو راجو کے جیسے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔

"یہ کمینہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔" راجو تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

راجو کا یہ ردعمل دیکھ کر وردا اور اس کے ماں باپ حیران رہ گئے۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ کو کچھ نہیں ہوگا وردا جی۔" راجو نے وردا کی طرف دیکھتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔

اچانک ہی وردا کو اپنا رات والا خواب یاد آیا جس میں اس نے راجو کو اپنے لیے مرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ راجو سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر بول نہیں پائی۔ شاید وہ اپنے ماں باپ کی موجودگی کی وجہ سے خاموش رہی۔ مگر اس نے ایک بار بہت ہی پیار بھری نظر سے راجو کی طرف دیکھا اور گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

راجو نے وردا کی آنکھیں پڑھنے کی کوشش تو کی مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔

"کیا تھا ان جھیل سی آنکھوں میں جو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ اُف...... میں نے نظروں کی زبان کیوں نہیں سیکھی۔" راجو سوچ میں پڑ گیا۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں سونے جا رہی ہوں۔ رات بھر ٹھیک سے سو بھی نہیں پائی۔" وردا نے کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

راجو گھر سے باہر آ گیا اور سپاہیوں کو مزید چوکس رہنے کی ہدایات دیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

رفیق تھانے سے نکل ہی رہا تھا کہ سامنے سے شہلا آتی ہوئی دکھائی دی۔

"کیا ہو رہا ہے مغل صاحب۔ کوئی نئی بات؟"

"اس کریک درندے نے اپنے کرتوت کی ویڈیو ریلیز کر دی ہے میڈیا میں اور میڈیا والے پاگلوں کی طرح اسے دکھائے جا رہے ہیں۔ جیسے ان کے پاس دکھانے کے لیے اور کچھ ہے ہی نہیں۔"

"یہی تو ہمارے میڈیا کا المیہ ہے کہ وہ تصویر کا صرف ایک رُخ دکھاتا ہے۔ دوسرا رُخ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ اس وقت کہاں جا رہے تھے تم؟" شہلا نے کہا۔

"میڈم وردا کو تصویریں دکھانے جا رہا ہوں۔"

"گڈ...... اس کی حفاظت کے انتظامات بھی چیک کر لینا۔ اگر مزید نفری کی ضرورت محسوس کرو تو مل جائے گی۔"

"او کے میڈم۔ میں دیکھ لوں گا۔"

"گڈ لک۔" کہہ کر شہلا اپنے کیبن کی طرف چلی گئی اور رفیق اپنی جیپ میں بیٹھ میں وردا کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو جیپ میں خاموش بیٹھا تھا مگر اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان سا مچا ہوا تھا۔

راجو سوچوں میں گم تھا کہ اس نے وردا کے کمرے کی کھڑکی کا پردہ سرکتا ہوا دیکھا۔ کیونکہ اس کی تو نظر ہی وردا کی کھڑکی پر رہتی تھی۔ اس نے جیسے ہی وردا کی جھلک دیکھی فوراً جیپ سے باہر آ گیا۔ وردا نے پھر ایک محبت بھری نظر راجو پر ڈالی۔ راجو تو بس وردا کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اسے لگا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔

اسی وقت ایک جیپ آ کر وردا کے گھر کے باہر رکی اور اس میں سے رفیق نمودار ہوا۔

"رفیق۔" وردا نے کہا اور پردہ گرا دیا۔

راجو کے دل پر تو جیسے سانپ لوٹ گئے۔ راجو نے وردا کی پیار بھری نظروں کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا اگر یہ جیپ بیچ میں دخل اندازی نہ کرتی تو اس بار وہ سمجھ ہی جاتا کہ وردا کی آنکھیں اس سے کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔

"تو تم ہو ریاض حسین؟"

"جی ہاں۔"

"میں انسپکٹر رفیق مغل۔" رفیق نے اپنا تعارف کروایا۔

"گڈ مارننگ سر۔ سوری میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔ بھولو نے بتایا تھا کہ درندے والا کیس اب آپ ہینڈل کر رہے ہیں۔"

"اٹس او کے۔ سب ٹھیک ہے نا۔"

"یس سر۔ سب ٹھیک ہے۔" راجو نے جواب دیا۔

"وہ درندہ ہاتھ دھو کر وردا کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ تمہیں بہت زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ میں یہاں تمہارے ساتھ دو گن مین بھی لگا رہا ہوں۔ ہر چیز کو اپنے کنٹرول میں رکھنا۔"

"او کے سر۔"

رفیق نے بیل بجائی تو وردا کے ابو نے دروازہ کھولا۔

"جی کہیے؟"

"میں انسپکٹر رفیق مغل۔ مجھے وردا سے ملنا ہے۔"

"وہ اپنے کمرے میں سو رہی ہے۔" ابو نے کہا۔

"دیکھئے۔ میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے۔ پلیز انہیں بلا لیں۔" رفیق نے زور دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ بیٹھیں میں وردا کو بلا کر لاتا ہوں۔"

جب انہوں نے وردا کو بتایا کہ کوئی رفیق مغل اس سے ملنے آیا ہے تو وردا نے ملنے سے منع کر دیا۔

"میرے سر میں شدید درد ہے ابو...... میں کسی سے نہیں ملنا چاہتی۔"

وردا کے ابو نے آ کر یہ بات رفیق کو بتا دی۔

"لگتا ہے اب تک ناراض ہے مجھ سے۔" رفیق نے دل ہی دل میں سوچا۔

"آپ بعد میں آ جائیں۔" ابو نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"بہت ارجنٹ تھا ان سے ملنا۔ میں مجرموں کی تصویریں لایا تھا انہیں دکھانے کے لیے۔ کیا پتہ انہی میں سے کوئی قاتل ہو۔" رفیق بولا۔

یہ سن کر ابو دوبارہ اوپر گئے اور کسی طرح وردا کو منا کر نیچے لے ہی آئے اپنے ساتھ۔

وردا کو دیکھتے ہی رفیق کھڑا ہو گیا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ مگر کسی نے کچھ کہا نہیں ایک دوسرے سے۔

"یہ مجرموں کی تصویریں ہیں۔ انہیں غور سے دیکھیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے ہی کوئی ہمارا مطلوبہ مجرم ہو۔"

وردا فائل لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ جب وردا کے ابو کسی کام سے وہاں سے ہٹے تو رفیق نے کہا۔

"کیسی ہو وردا۔"

"ان میں سے کوئی نہیں ہے۔" وردا نے کہا اور فائل میز پر رکھ دی۔ اس نے رفیق کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"اتنے دنوں بعد ملی ہو۔ کیا بات بھی نہیں کرو گی۔"

وردا نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

رفیق نے فائل اٹھائی اور گھر سے باہر آ گیا۔

"بالکل نہیں بدلی۔ آج بھی ویسی ہی ہے۔ وہی غصہ...... وہی ادا...... سب کچھ وہی ہے۔ آنکھوں کی گہرائی بھی وہی ہے۔ شکر ہے اس نے میری طرف دیکھا تو...... لگتا ہے وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ایسی حسینہ کی ناراضگی بھی کتنی جان لیوا ہوتی ہے۔"

رفیق سیدھا راجو کے پاس آیا اور بولا۔ "ہمارے پاس جتنے بھی مجرموں کی تصویریں ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی وہ قاتل نہیں ہے۔"

"سر ابھی میں ایک بات سوچ رہا تھا۔ برا نہ مانیں تو بولوں؟"

"جھجک کیوں رہے ہو۔ بولو کیا بات ہے۔ چوہان کی طرح پاگل نہیں ہوں میں۔"

ڈی ایس پی صاحب پر پولیس ڈپارٹمنٹ کی گولی چلی تھی۔ اگر ہم یہ تصور کریں کہ وہ درندہ کوئی پولیس والا ہے تو پچھلے دنوں کی کچھ باتوں پر غور کیا ہے میں نے۔"

"ہاں ہاں بولتے جاؤ۔" رفیق بولا۔

"ایک پولیس والے پر شک ہے مجھے۔ وہ ہے سب انسپکٹر وحید ملک۔"

"ایسا کیسے کہہ سکتے ہو تم۔ میں اسے جانتا ہوں۔ اچھا بندہ ہے وہ۔"

"دیکھیں سر۔ جب میرے دوست مراد نے اس درندے کا پیٹ چیرا۔ تب وحید ملک چھٹیوں پر چلا گیا۔ بس اس نے فون کر دیا تھا کہ وہ شادی میں شہر سے باہر جا رہا ہے۔ پورے دو ہفتے بعد ڈیوٹی پر لوٹا۔ پھر جب ڈی ایس پی صاحب پر گولی چلی تھی۔ تب بھی وہ غائب تھا۔ یہ کچھ باتیں ہیں جو میرے خیال سے غور طلب ہیں۔" راجو نے اپنا تجزیہ رفیق کے آگے رکھ دیا۔

"ماننا پڑے گا کہ تمہارا دماغ بہت تیز چل رہا ہے۔ تم اس محکمے میں بہت کامیاب رہو گے۔ میں غور کروں گا ان باتوں پر۔ آج ہی خبر لیتا ہوں ملک کی۔"

"تھینک یو سر۔ یہ میرا شک ہے۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"تفتیش شک کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے۔ جو شک نہیں کر سکتا وہ تفتیش بھی نہیں کر سکتا۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مجھے۔ اب میں چلتا ہوں اور تمہیں یہ کہنے کی ضرورت تو نہیں ہے کہ ہوشیار رہنا ہر وقت۔" رفیق نے راجو کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور اپنی جیپ میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

"اس انسپکٹر نے بڑے غلط وقت پر انٹری دی۔ اب پتہ نہیں یہ پردہ کب ہٹے گا۔ ورنہ دردا جی روز کب ہمیں ایسے دیکھتی ہیں۔ پتہ نہیں کیا بات تھی؟" راجو نے سوچا اور سر جھٹک کر جیپ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اب اس کی نظریں کھڑکی کے پردے پر ہی اٹک کر رہ گئی تھیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

مراد بھی ٹی وی پر درندے کی بنائی ہوئی ویڈیو دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔

"ایک تو یہ کمینہ اتنے وحشیانہ انداز سے خون کر رہا ہے اوپر سے ایسی ویڈیو بنا کر میڈیا کو بھی بھیج رہا ہے۔ کاش اس دن میں اسے مار ہی ڈالتا۔" مراد کا خون کھول رہا تھا۔

صبح کے گیارہ بج رہے تھے۔ ان خبروں کے چکر میں مراد اپنی ڈیوٹی پر بھی لیٹ ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر گھر سے نکل گیا۔

جب وہ بڑی سڑک پر آیا تو اسے بس اسٹاپ پر سحرش کھڑی نظر آئی۔ سحرش کو دیکھ کر مراد کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اس نے سحرش کے پاس آ کر بائیک روک دی۔

"کالج جا رہی ہو۔ میں بھی اسی طرف جا رہا ہوں۔ آؤ تمہیں کالج تک چھوڑ دیتا ہوں۔" مراد نے پیشکش کی۔

"اپنا راستہ ناپو مسٹر۔ اتنی پاگل نہیں ہوں میں جو تمہارے ساتھ چلی جاؤں۔"

"تم حسینوں کے ساتھ یہی مصیبت ہے۔ کبھی کسی کی محبت کی قدر ہی نہیں کرتی ہو۔ اتنا کٹھور دل کہاں سے آ جاتا ہے تمہارے پاس۔ اتنی حسین ہو کر ایسی کڑوی باتیں تمہیں زیب نہیں دیتیں۔ حسن کو ہمیشہ سے محبت کی ضرورت رہی ہے۔ کسی کی سچی محبت ملے تو اسے ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ آؤ بیٹھو۔ میرے ساتھ جانے سے تمہارا کچھ بگڑ نہیں جائے گا۔"

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"تم تو اسپتال میں ایک بار بھی مجھے دیکھنے نہیں آئیں۔ جب بھی کوئی آہٹ ہوتی تھی تو میں اس امید پر آنکھیں کھول دیتا تھا کہ شاید تم آ گئی ہو۔ مگر تم تو بڑی بے حس نکلیں۔ ایک بار بھی آ کر خیریت نہیں پوچھی۔" مراد نے جیسے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں آتی میں تمہیں دیکھنے۔ کیا لگتے ہو تم میرے؟"

"عاشق ہوں تمہارا۔ اب تم مانو یا نہ مانو۔ مگر ہم دونوں کے بیچ محبت کا رشتہ تو قائم ہو ہی چکا ہے۔ چاہے یک طرفہ ہی سہی۔"

"اب دفعہ ہو جاؤ۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی کہ تم خواہ مخواہ مجھے چھیڑ رہے ہو۔" سحرش کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"جا رہا ہوں یار۔ میں تو ویسے ہی ڈیوٹی پر لیٹ ہو رہا ہوں۔ تمہاری وجہ سے رک گیا تھا۔" مراد نے اپنی بائیک اسٹارٹ کی اور اپنا سا منہ لے کر بائیک آگے بڑھا دی۔ "لگتا ہے یہ نہیں پٹے گی مجھ سے۔" مراد نا امیدی کے انداز میں سر ہلاتا ہوا بڑبڑایا۔

سحرش اس بات سے انجان تھی کہ ایک نئی مصیبت اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جس کا اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔

سب انسپکٹر وحید ملک ادھر سے گزر رہا تھا۔ اس نے سحرش کو پہچان لیا۔ "ارے یہ تو وہی کال گرل ہے جو اس دن اس بندے کے ساتھ ہوٹل میں پکڑی گئی تھی۔"

وحید نے جیپ سحرش کے پاس آ کر روک دی اور سحرش کو زبردستی جیپ میں بٹھا لیا۔ سحرش بری طرح سے ڈر گئی تھی اور اسے ڈرنا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ہماری پولیس جو چاہے کر سکتی ہے۔ وہ کانپتے قدموں سے جیپ میں بیٹھ گئی۔ اس کے پاس اس مصیبت سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔

وحید جیپ اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتا ہوا بولا۔

"میری بیوی میکے گئی ہوئی ہے۔ شام تک لوٹے گی۔ تب تک تم میرے ساتھ رہو گی۔ کوئی بہانہ کر کے ڈیوٹی آف کر لوں گا۔ کس لیے۔ صرف تمہارے لیے۔"

سحرش کچھ بول ہی نہیں پا رہی تھی۔ بس اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ مگر وحید نے ان کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا اور سحرش کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

لیکن سحرش کے رونے دھونے کا وحید ملک پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اس حسین موقع کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ سحرش کچھ نہیں بولی۔ بس چپ چاپ ملک کی دست درازی کو برداشت کرتی رہی۔

شاید یہ بات اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی کہ وہ کیا تھی اور کیا بن گئی ہے۔ صرف محبت کے نام پر..... آنسو اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے اور کاجل سیاہ لکیریں چھوڑتا ہوا اسے احساس دلا رہا تھا کہ وہ کتنی داغدار ہو چکی ہے۔

شام چھ بجے وحید نے اس کی جان چھوڑی اور اسے اپنے گھر سے تھوڑی دور اتارتے ہوئے کہا۔

"اگلے ہفتے میرے دو دوست لاہور سے آ رہے ہیں۔ مل کر انجوائے کریں گے۔"

سحرش نے کچھ نہیں کہا اور مرجھایا چہرہ لیے لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ وہ اب گھر نہیں جانا چاہتی تھی بلکہ کہیں جا کر اپنی جان ختم کر دینا چاہتی تھی۔ انہی سوچوں میں ڈوبی وہ سڑک پار کرنے لگی اور بے دھیانی کی وجہ سے وہ ایک کار کے نیچے آتے آتے بچی۔ وہ تو شکر ہے کہ کار والے نے وقت پر بریک لگا دیئے۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا۔ مرنا ہی ہے تو کہیں اور جا کر مرو اپنے ساتھ مجھے کیوں مروانا چاہتی ہو۔" کار والا چلا کر بولا۔

مراد یہ سب منظر سڑک کے دوسری طرف سے دیکھ رہا تھا' اس کے ساتھ مشکل یہ تھی سڑک کے اس جانب گاڑیوں کا رش تھا۔ وہ اتر کر سحرش کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنے گھر آ گئی اور اپنے بستر پر گر کر بے تحاشہ رونے لگی۔ نغمہ نے یہ ماجرا دیکھا تو فوراً دوڑ کر اس کے پاس آ گئی۔

"کیا ہوا..... کیوں رو رہی ہو؟"

"مجھے اکیلا چھوڑ دو باجی۔ پلیز۔" سحرش روتے ہوئے بولی۔

مراد بھی واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اسے سحرش کے لیے بہت افسوس تھا اور کیوں نہ ہوتا' کیونکہ وہ واقعی میں سحرش سے محبت کرنے لگا تھا۔

پریشانی اس کے چہرے سے چھلک رہی تھی۔ بہت زیادہ پریشانی۔ اتنا پریشان کہ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ سحرش کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دکھوں کا کچھ مداوا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے

زخموں پر مرہم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ سوچتا ہی رہا کہ کیا کیا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں جب اس سے کچھ بن نہیں پایا تو اس نے اپنے کمرے کو تالا لگایا اور سحرش کے گھر کی طرف چل پڑا۔

جب مراد وہاں پہنچا تو دروازہ بند تھا۔ مراد نے دستک دی تو نغمہ نے دروازہ کھولا۔

"مراد تم......! یہاں کیسے؟" نغمہ نے پوچھا۔

"مجھے سحرش سے بات کرنی ہے۔ کیا میں اس سے مل سکتا ہوں۔"

"سحرش سے بات...... سحرش سے تمہارا کیا تعلق؟" نغمہ حیرت میں پڑ گئی۔

"میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں' تم اور پریشان مت کرو۔ پلیز مجھے سحرش سے ملنے دو۔"

"تو کیا جس لڑکی سے تم محبت کرتے ہو۔ وہ سحرش ہے؟" نغمہ نے پوچھا۔

"ہاں۔"

نغمہ نے آگے بڑھ کی مراد کی گردن پکڑ لی۔ "کیا کیا ہے تم نے میری بہن کے ساتھ۔ جب سے آئی ہے مسلسل رو رہی ہے۔"

"کاش وہ میری وجہ سے رو رہی ہوتی۔ بات کچھ اور ہی ہے' پلیز مجھے اس سے ملنے دو ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" مراد کے جذبات اس کے لہجے سے چھلک رہے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ آ جاؤ اندر۔" نغمہ نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔

نغمہ اسے سحرش کے پاس لے آئی۔ وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے لیٹی ہوئی تھی۔

"نغمہ میں اکیلے میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز تھوڑی دیر کے لیے۔" مراد نے کہا۔

نغمہ بنا کچھ کہے وہاں سے چلی گئی۔ مراد بستر پر سحرش کے برابر میں بیٹھ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"مراد تم چلے جاؤ یہاں سے' میں اس وقت بات کرنے کے قابل نہیں ہوں۔" سحرش نے بلکتے ہوئے کہا۔

وہاں سے ہٹ کر مراد نے سحرش کے پاؤں پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "مجھ سے کوئی بھول ہو گئی ہو تو مجھے معاف کر دو۔ ہاں میں مانتا ہوں کہ شروع شروع میں' میں تم کو غلط سمجھتا تھا۔ مگر کب محبت کے جذبات جاگ اٹھے مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ شاید میں تمہاری محبت کے لائق بھی نہیں ہوں۔ مگر ایک دوست سمجھ کر ہی مجھے بتا دو کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے اور کس نے کیا ہے۔ میں یہ جاننے کے لیے بہت بے چین ہو رہا ہوں۔ جب تک نہیں بتاؤ گی میں تڑپتا رہوں گا۔ پلیز مجھے بتا دو کہ ان آنسوؤں کی وجہ کون ہے۔"

سحرش اٹھ کر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر ٹکا کر بولی۔

"تم کون ہو میرے۔ جسے سب بتاؤں میں؟"

"محبت کرتا ہوں تم سے...... کیا محبت کا یہ رشتہ کافی نہیں ہے تمہارے نزدیک۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر سنو' مجھے وکی سے ملانے والی کرن تھی۔ پہلے جب بھی وہ مجھے راستے میں ملتا تھا بہت محبت بھری نظر ڈالتا تھا مجھ پر۔ پھر وہ میرا دوست بن گیا۔ آہستہ آہستہ میرے دل میں بھی اس کی محبت جاگنے لگی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مجھ سے دوستی اور پھر محبت۔ یہ سب ایک سازش کا حصہ ہیں۔ یہ بات مجھے اب سمجھ آئی ہے جو کہ وکی سے ملنے کے بعد ہی سمجھ لینی چاہئے تھی۔ وکی نے میرے ساتھ محبت کا ناٹک کھیلا اور میں بھی کیسی بھولی تھی کہ اس کی محبت میں پاگل ہو کر اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیا لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ ہمارے ان لمحات کی ویڈیو بنائی جا رہی ہے۔ جب یہ بات مجھے پتہ چلی تو مجھے بہت

صدمہ پہنچا۔ اس کے بعد بلیک میلنگ کا کھیل شروع ہوا۔ مجھے کہا گیا کہ تم ایک کال گرل بن جاؤ ورنہ یہ ویڈیو انٹرنیٹ پر ڈال دیں گے۔ ان باتوں کی وجہ سے میں بہت پریشان تھی۔ محبت میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ میں نے بہت مزاحمت کی لیکن ایک دن مجھے کال گرل بن کر جانا ہی پڑا۔ وہاں میں پکڑی گئی اور پھر فارم ہاؤس پر انسپکٹر چوہان اور اس کے دوست پرویز نے میری عزت کی وہ دھجیاں اڑائیں جو میں بیان بھی نہیں کر سکتی۔"

"یہ بتاؤ کہ آج کیا ہوا۔" مراد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"آج جب تم گئے تو وہاں ایک پولیس والا آ گیا۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور زبردستی مجھے اپنے گھر لے گیا اور...... بس اس سے آگے میں نہیں کہہ سکتی۔" یہ کہہ کر سحرش نے گھٹنوں میں سر دبا لیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" مراد نے پوچھا۔

"اس کا نام تو نہیں پتہ۔ بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ پولیس والا ہے۔"

"کوئی اور پہچان؟"

"کیا کرو گے جان کر۔"

"ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ کیا تم اس کے بارے میں کچھ اور بتا سکتی ہو۔"

"اور تو کچھ نہیں معلوم۔ لیکن ہاں اس کے پیٹ پر عجیب سا نشان تھا۔" سحرش نے جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

"کیسا نشان؟" مراد چونک گیا۔

"لمبا سا نشان تھا۔ زیادہ غور نہیں کیا میں نے۔ تمہیں اس سے کیا۔ چھوڑو۔"

"اس کے گھر کا پتہ کیا ہے۔" مراد سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

سحرش نے ملک کے گھر جاتے وقت دروازے پر نمبر لکھا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے مراد کو علاقہ اور گھر کا نمبر بتا دیا۔

"یہ تو بابو کے ساتھ والا گھر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ نسرین کا شوہر ہے۔" مراد چونک کر بولا۔ "تھینک یو سحرش کہ تم نے مجھے اتنا کچھ بتا دیا۔ اب تم آرام کرو۔"

"تم یہ سب کیوں جاننا چاہتے تھے؟" سحرش نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"تا کہ یہ سب بتا کر تمہارے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ میں اب جا رہا ہوں۔" مراد کچھ جلدی میں لگ رہا تھا۔

سحرش کا سر پھر گھٹنوں پر ٹکا ہوا تھا۔ مراد نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا تم فکر مت کرو۔"

یہ کہہ کر مراد سحرش کے کمرے سے باہر نکلا تو نغمہ کو سامنے کھڑا پایا۔ نغمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے بھی سحرش کی ساری باتیں سن لی تھیں۔ مراد نے آگے بڑھ کر نغمہ کو گلے سے لگا لیا۔

"سحرش کے ساتھ انصاف ہو گا اور ضرور ہو گا۔" یہ کہہ کر مراد باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وکی نے آج کل ایک نئی لڑکی پھنسائی ہوئی تھی اور اب وہ اسے برباد کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ لڑکی کو نشہ آور کولڈ ڈرنک پلا چکا تھا اور اس وقت وہ لڑکی دنیا جہان سے بے خبر بے سدھ پڑی تھی۔ وکی نے کیمرہ بیڈ پر سیٹ کیا اور لڑکی کے ساتھ کھیلنے لگا۔

وکی جو کچھ کر رہا تھا وہ سب ریکارڈ ہو رہا تھا۔

"اسے تو میں ٹاپ کی کال گرل بناؤں گا۔"

وکی اپنی مستی میں اس بات سے بے خبر تھا کہ ایک نقاب پوش اس کے گھر میں گھس آیا ہے۔ وہ تو اپنے

گناہ میں ہی مگن تھا۔ نقاب پوش بستر کے قریب آیا اور اس نے وکی کو لڑکی کے اوپر سے کھینچ کر زمین پر پٹخ دیا۔

"نا بیٹا...... یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" نقاب پوش نے کہا۔

"کک...... کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو۔" وکی گھبرا گیا۔

"نام میں کیا رکھا ہے، کام دیکھو میرا۔" یہ کہتے ہوئے وہ وکی پر ٹوٹ پڑا اور خنجر کے اتنے وار ہوئے کہ وکی کے گندے خون سے پورا فرش لال ہو چکا تھا۔ لڑکی تو نشے میں دھت تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ کمرے میں کیا ہو گیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

پرویز اس وقت فارم ہاؤس پر تھا۔ اس نے موج مستی کے لیے دو کال گرلز بلا رکھی تھیں۔

پرویز ان کی ہمراہی میں خوب مست ہو رہا تھا اور اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ ایک نقاب پوش فارم ہاؤس میں گھس کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پرویز کو اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔ وہ چونکا اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ایک نقاب پوش وہاں کھڑا تھا۔

"کون ہو تم...... یہ نقاب اتار کر بات کرو۔" پرویز نے کہا۔

"میرے نام اور پہچان میں کیا رکھا ہے۔ تم بس میرا کام دیکھو۔" نقاب پوش نے ایک تیز دھار خنجر نکال لیا۔

پرویز کے ہوش اڑ گئے۔ دونوں لڑکیاں چیختی ہوئی وہاں سے بھاگ گئیں۔

"تت...... تم کیا چاہتے ہو؟" پرویز کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں پھیلنے لگی تھیں۔

"مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اس خنجر سے پوچھو اسے تمہارا خون چاہیے۔" نقاب پوش بے رحمی سے بولا۔

یہ سن کر پرویز نے بھاگنے کی کوشش کی مگر جلد ہی نقاب پوش نے اسے دبوچ لیا۔ ہر طرف خون ہی خون پھیل گیا اور بد بخت پرویز اپنے ہی خون میں تیر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وکی کے گھر سے رفیق فارم ہاؤس پہنچا۔

"یہاں بھی خون ہی خون ہے۔ سر کیا یہ دونوں خون بھی اسی درندے نے کیے ہیں۔" بھولو نے پوچھا۔

"تو اور کون کر سکتا ہے۔ اتنی درندگی کا مظاہرہ صرف وہی کر سکتا ہے۔" رفیق نے کہا۔

"ہاں سر، یہ قاتل واقعی کسی درندے سے کم نہیں ہے۔ اپنے شکار کو چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یہ کسی انسان کا تو کام ہی نہیں ہے۔"

"اس لاش کو بھی پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دو۔" رفیق نے بھولو کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"اوکے سر۔"

رفیق فارم ہاؤس سے سیدھا تھانے پہنچا اور ڈی ایس پی شہلا کو دونوں وارداتوں کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا۔

"کیا یہ اسی سیریل کلر کا کام ہے؟" شہلا کے دماغ میں بھی وہی سوال تھا۔

"بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے میڈم۔ دونوں افراد کے جسموں پر خنجر سے بڑی بے رحمی کے ساتھ وار کیے گئے ہیں۔ باقی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں پتہ چلے گا۔"

"آج ایس پی صاحب یہاں آ رہے ہیں اور ہمارے پاس ان کی تسلی کے لیے کوئی جواب نہیں ہے۔ تم بھی یہ کیس ہینڈل نہیں کر پا رہے ہو۔"

"میڈم مجھے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں یہ کیس لیے ہوئے۔ اتنا الجھا ہوا کیس ہے۔ مجھے تھوڑا وقت اور دیں۔" رفیق نے کہا۔

"وقت ہی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔ ایس پی صاحب آئیں گے تو بولو میں انہیں کیا بتاؤں۔" شہلا کے لہجے میں بیچارگی تھی۔

"میڈم۔ ایس پی صاحب آ گئے ہیں۔" شہلا کے چپراسی نے اندر آ کر اطلاع دی۔

شہلا فوراً اٹھ کر باہر آئی۔ رفیق بھی اس کے ساتھ تھا۔

"ڈی ایس پی صاحبہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ آپ تو لگتا ہے پورے شہر کو مروا کر ہی دم لیں گی۔ آخر کب پکڑا جائے گا وہ سیریل کلر۔" ایس پی نے شہلا کو دیکھتے ہی کلاس لینی شروع کر دی۔

"ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں سر۔"

"کوشش کر رہے ہیں۔ یہ کیسی کوشش ہے تمہاری، جس کا کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل رہا۔ ایم پی اے صاحب کی بیٹی بھی قتل کر دی گئی۔ تم کچھ نہیں کر سکیں اور ساری ڈانٹ مجھے کھانی پڑتی ہے۔ میرا تو دل کرتا ہے کہ تمہیں اٹھا کر اس محکمے سے باہر پھینک دوں۔" ایس پی صاحب بڑے ٹھیک ٹھاک انداز سے شہلا کی کھچائی کر رہے تھے۔

شہلا خاموش کھڑی رہی۔ اسے بھی احساس تھا کہ ایس پی صاحب پر بھی اوپر سے دباؤ ہے ورنہ وہ ایسی بات نہ کرتے۔

"میں صرف یہی کہنے آیا ہوں کہ کرو جو تم کر سکتی ہو۔ مجھے جلد سے جلد وہ درندہ سلاخوں کے پیچھے چاہیے۔" ایس پی صاحب اپنی طرف سے ڈانٹ کا ڈوز دے کر واپس چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی شہلا نے سکون کی سانس لی اور واپس اپنے کیبن میں آ گئی۔ رفیق بھی دوبارہ اس کے کیبن میں آ گیا۔

"تم نے سنا رفیق۔ اب جاؤ اور پلیز کچھ کرو۔ ورنہ ایس پی صاحب مجھے باہر پھینکیں نہ پھینکیں میں تمہیں ضرور باہر پھینک دوں گی۔" ڈانٹ سننے کے بعد شہلا کے لہجے میں جھلاہٹ بھری ہوئی تھی۔

رفیق گہری سانس لے کر باہر آ گیا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

"کچھ بھی ہو۔ بات گھوم پھر کر میرے ہی سر پر آتی ہے۔ یہ کیس میں جو ہینڈل کر رہا ہوں۔ اف جب میڈم ڈانٹتی ہیں تو جان ہی نکال دیتی ہیں۔ اب تو کچھ کرنا ہی ہوگا۔ مجھے اس بلیک اسکارپیو کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔"

رفیق نے پہلی فرصت میں وہیکل ڈپارٹمنٹ سے پوری تفصیل نکلوائی تو اسے معلوم ہوا کہ جدید ماڈل کی بلیک اسکارپیو صرف چار لوگوں کے پاس تھی۔ ایک اسکارپیو اسلم شاہ کے نام پر تھی۔ وہ ایک بزنس مین تھا اور شہر میں اس کا کافی نام تھا۔ ایک بلیک اسکارپیو آرمی کے ریٹائرڈ کرنل داؤد خان کے پاس تھی۔ تیسری کار ایک خاتون سمرن کے نام پر تھی۔ وہ ایک بینکر تھی۔ سب سے خاص بات یہ تھی کہ ایک بلیک اسکارپیو سب انسپکٹر وحید ملک کے نام پر تھی۔

"وحید کے پاس بلیک اسکارپیو...... شاید ریاض حسین کا شک صحیح ہے۔ اس وحید ملک پر واقعی نظر رکھنا پڑے گی۔" رفیق نے سوچا اور واپس تھانے کی طرف چلا آیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وردا کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔ اسے ایک سو چار بخار تھا اور وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ چونکہ باہر لے جانے میں درندے کا خطرہ تھا اس لیے وردا کے ابو نے ڈاکٹر کو گھر پر ہی بلوا لیا تھا۔

وردا نے دوا لے لی تھی اور اب وہ لیٹی ہوئی خیالوں

میں کھوئی ہوئی تھی۔ رفیق مغل سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی اور اسے کالج کے دن یاد آ گئے۔

وردا بار بار ان دنوں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"رفیق تم مجھے اپنی شکل نہ ہی دکھاتے تو اچھا تھا۔ مجھے تم سے بات کرنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ آئندہ میرے دروازے پر مت آنا۔" بخار میں وردا بڑبڑاتے ہوئے رفیق سے مخاطب تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

رفیق تھانے کی طرف جا رہا تھا کہ ایک کالج کے سامنے اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی اور وہ ٹھٹک گیا۔

"ارے یہ تو ریما ہے۔ چلو اس سے بھی مل لیتا ہوں۔ ٹرین کی ملاقات کے بعد تو اس سے رابطہ ہی نہیں ہوا۔" رفیق نے یہ سوچتے ہوئے کالج کے پاس جیپ روک کر ریما کو آواز دی۔ رفیق کو دیکھ کر وہ چونک گئی اور جلدی سے رفیق کے پاس آ گئی۔

"تم پولیس کی جیپ میں کیا کر رہے ہو؟" ریما نے آتے ہی پوچھا۔

"تمہارے نکمے بھیا کی طرح میں بھی اتفاق سے پولیس والا ہی ہوں۔" رفیق نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے بھیا کو نکما مت کہو۔ دن رات ڈیوٹی کرتے ہیں وہ۔"

"ہاں وہ تو ہے۔ چلو چھوڑو اور بتاؤ کیسی ہو۔ ٹرین کی اس ملاقات کے بعد تو تم نے مجھے یاد ہی نہیں کیا۔" رفیق شکایت کرتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں میں۔ تم سے ملنے کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔ ویسے بھی تم نے کون سا نمبر یا پتہ دیا تھا کہ میں تمہیں یاد کرتی۔" ریما نے شکایت در شکایت کہا۔

"اوہ شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ چلو آج میں تمہیں اپنا ایڈریس اور نمبر دے دیتا ہوں۔ مگر میرے گھر پر جگہ نہیں رہتی۔ میرے والدین ساتھ رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ ہم وہاں سکون سے بات نہیں کر سکتے۔" رفیق نے کہا۔

"میرے بھیا اکثر باہر رہتے ہیں اور گھر پر میں اکیلی ہی ہوتی ہوں۔ آج بھی اکیلی ہوں۔ بھیا شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں گھر ہی جا رہی ہوں۔" ریما کی باتوں میں بہت کچھ تھا سمجھنے کے لیے اور رفیق سمجھ بھی گیا لیکن اس کی بھی کچھ مجبوریاں تھیں۔

"آؤ بیٹھو۔ تمہارے گھر چلتے ہیں۔" رفیق خود کو روک نہیں پایا۔

ریما مسکراتے ہوئے جیپ میں بیٹھ گئی۔ "ویسے تو مجھے تم سے ڈر لگ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔"

"یہ تمہارا گھر کتنی دور ہے؟" رفیق نے پوچھا۔ شاید اسے یہ راستہ کچھ زیادہ ہی طویل لگ رہا تھا۔

"بس پہنچ ہی تو گئے ہیں۔ آگے والی گلی سے اندر موڑ لینا۔"

گھر میں چائے پیتے ہوئے ریما نے پوچھا۔ "تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے۔"

"کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"تم مجھے ایسے دیکھ رہے ہو جیسے تم مجھ سے پیار کرتے ہو۔" ریما نے اسے اس کی نگاہوں کا مفہوم بتاتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں پیار کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ ہمارے بیچ ایک خوبصورت رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ اب تم اسے کچھ بھی کہہ سکتی ہو۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہے۔"

"کچھ کھاؤ گے؟"

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لے آؤ کچھ۔" رفیق نے بلاتکلف کہا۔

"او کے تم بیٹھو میں لاتی ہوں کچھ۔" ریما مسکرائی اور وہاں سے کچن کی طرف جانے لگی۔

"اف کیا چال ہے تمہاری۔ کہیں یہ زمین نہ ہل جائے۔ ایسے نہ چلا کرو۔" رفیق کے لہجے میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ شاید وہ چند لمحے پہلے چھائی ہوئی اداسی کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

"چپ رہو تم۔ ایک تو میں تمہارے ساتھ نیکی کر رہی ہوں بھوکے کو کچھ کھلا کر اوپر سے ایسی باتیں سنائی جا رہی ہیں۔" ریما جاتے جاتے بولی۔

تھوڑی ہی دیر میں ریما کچھ کھانے پینے کا سامان اٹھا لائی اور دونوں باتیں کرتے ہوئے کھاتے بھی رہے۔ اچانک رفیق کا موبائل بجنے لگا۔

"ہیلو۔" رفیق نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

"رفیق تم کہاں ہو۔" دوسری طرف سے شہلا کی آواز آئی۔

"ابھی آ رہا ہوں میڈم۔ کوئی خاص بات ہے کیا۔" رفیق نے جلدی سے کہا۔

"ہاں۔ جلدی آؤ۔ کچھ ارجنٹ ہے۔" شہلا نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔

رفیق نے فوراً جانے کی تیاری کر لی۔

"ارے تم تو کھاتے ہوئے بالکل رک گئے۔" ریما بولی۔

"وہ ایسی قیامت ہے کہ اس کی آواز سن کر وقت رک جائے۔ میری تو اوقات ہی کیا ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔"

"ارے کھانا ادھورا چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

"اب بالکل وقت نہیں ہے ریما۔ فوراً نہیں پہنچا تو سمجھو نوکری کا خدا حافظ۔ بڑی مشکلوں سے واپس ملی ہے۔ تم فکر مت کرو۔ ہماری ملاقات ہوتی رہا کرے گی۔" رفیق نے کہا۔

"پھر کب ملو گے؟"

"تم اپنا نمبر میرے فون میں فیڈ کر دو۔ میں بعد میں فون کر کے بتا دوں گا۔"

ریما نے اپنا نمبر اس کے موبائل میں فیڈ کر دیا اور اس کے اگلے بیس منٹ میں اس کی جیپ تھانے کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ سیدھا شہلا کے کمرے میں پہنچا۔

"جی میڈم۔ آپ نے یاد کیا؟" رفیق نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹھو۔ کیا پروگریس ہے؟" شہلا نے پوچھا۔

"میڈم بلیک اسکارپیو کے مالکان کی لسٹ لایا ہوں۔ پورے شہر میں چار لوگوں کے پاس بلیک اسکارپیو ہے۔" رفیق نے لسٹ شہلا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس لسٹ میں وحید ملک کا نام بھی ہوگا۔" شہلا نے لسٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو کیسے پتہ؟" رفیق نے حیرت سے کہا۔

"چوہان نے بتایا تھا کہ وحید ملک نے چھ مہینے پہلے بلیک اسکارپیو خریدی تھی۔"

"مگر چوہان تو یہاں نہیں ہے۔ وہ تو شاید شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"بے وقوف۔ اس سے فون پر بات ہوئی تھی۔ مجھے وحید ملک پر شک تھا۔ وہ اکثر ڈیوٹی سے غائب رہتا ہے۔ میں نے فون کر کے چوہان سے پوچھا تھا کہ کیا وحید ملک کے پاس بلیک اسکارپیو کار ہے تو اس نے بتایا کہ ہاں تم وحید ملک پر نظر رکھو۔ بس اسی لیے بلایا ہے تمہیں۔"

"میں خود یہی سوچ رہا تھا میڈم۔" رفیق نے کہا۔

"اب سوچو کم اور کام زیادہ کرو۔ مجھے جلد ہی کوئی

نتیجہ چاہیے۔ ورنہ.....'' شہلا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''سمجھ گیا میڈم۔ مجھے اجازت دیں۔''
''ہاں جاؤ اور وحید ملک کے ساتھ ساتھ باقی تینوں پر بھی نظر رکھو۔ وہ درندہ ان چاروں میں سے ہی کوئی ہے۔'' شہلا نے ہدایت دی۔
''بالکل میڈم۔ ایسا ہی کروں گا۔ ویسے کل سے وحید ملک پھر سے غائب ہے۔ وہ آج بھی ڈیوٹی پر نہیں آیا۔''
''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ اب وقت ضائع مت کرو۔'' شہلا تیز لہجے میں بولی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شام کے چھ بج رہے تھے اور ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ نسرین بازار سے گھر کا کچھ سامان لے کر لوٹ رہی تھی۔ جب وہ اپنے گھر کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ان کے دروازے کے باہر بائیک پر کوئی کھڑا ہے۔ اس نے غور کیا تو پہچان گئی۔
''یہ تو مراد ہے۔''
مراد نے نسرین کو دیکھ کر کہا۔ ''میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ کیسی ہیں؟''
''میں ٹھیک ہوں۔ اندر آئیے۔''
نسرین نے دروازہ کھولا اور مراد کے ساتھ اندر آ گئی۔
''آپ اچھے وقت پر آئے ہیں۔ کیونکہ میرے شوہر گھر پر نہیں ہیں۔'' نسرین بولی۔
''آپ کے شوہر کہاں گئے ہیں؟'' مراد نے پوچھا۔
''کسی کام سے لاہور جانے کا کہہ کر گئے ہیں۔ شاید کل تک آ جائیں گے۔''
''ہوں۔'' مراد ہنکار کر بولا۔
''ویسے مجھے کچھ ڈر لگ رہا ہے لیکن قرض بھی مجھ پر ہے۔'' نسرین نے کہا۔
''آپ ہر قرض سے آزاد ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو بس ویسے ہی ملنے آ گیا تھا اور اگر ہو سکے تو بس ایک بات بتا دیں۔'' مراد بولا۔
''جی پوچھیں۔''
''آپ کے شوہر کے پیٹ پر وہ لمبا سا نشان کس چیز کا ہے؟''
''آپ کیوں جاننا چاہتے ہیں؟''
''پلیز۔ ہو سکے تو بتا دیں۔ وجہ مت پوچھیں۔''
اس رات آپ کے جانے کے بعد میرے شوہر گھر آئے تھے۔ ان پر سیریل کلر نے حملہ کر کے ان کے پیٹ پر وار کیا تھا۔ مگر وہ کسی طرح سے بچ کر نکل آئے اور بڑی مشکل سے گھر پہنچ پائے تھے۔'' نسرین نے بتاتے ہوئے کہا۔
''تو آپ ان کو کون سے اسپتال میں لے گئی تھیں ٹریٹمنٹ کے لیے؟'' مراد ہر قسم کا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔
''انہوں نے اسپتال جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کہہ رہے تھے سب کو پتہ چل جائے گا تو پولیس کی بدنامی ہو گی۔ ویسے میں خود بھی ایک ڈاکٹر ہوں۔ میں نے ہی جیسے تیسے گھر پر آپریٹ کیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ سب ٹھیک رہا۔''
''ہوں۔'' مراد کو اپنا شک یقین میں بدلتا نظر آ رہا تھا۔
''اب بتائیں آپ یہ کیوں جاننا چاہتے تھے۔''
''کوئی خاص بات نہیں۔ بس ویسے ہی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔''
نسرین اس کی اچانک آمد اور اس طرح واپس جانے پر حیران ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ نسرین کوئی اور سوال کرتی' مراد خاموشی سے باہر نکل آیا اور بائیک

پر بیٹھ کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔
مراد اپنے گھر پہنچا تو اسے سحرش باہر کھڑی نظر آئی۔
''ارے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا سوچیں گے۔''
''تم یہ سب کیوں کر رہے ہو۔ تمہارے اس خون خرابے سے کچھ بدل نہیں جائے گا۔'' سحرش نے کہا۔
''میں کچھ سمجھا نہیں۔'' مراد نے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔
''میں نے ابھی ابھی کل کا اخبار دیکھا ہے۔ وکی اور پرویز کو کسی نے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا ہے۔''
سحرش مراد کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔
''یہ تو بہت اچھا ہوا۔ وہ دونوں اسی لائق تھے۔ مگر انہیں کسی نے نہیں بلکہ اسی درندے نے مارا ہے۔''
''میری آنکھوں میں دیکھ کر بات کرو اور بتاؤ کہ تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟''
''یہاں تماشہ مت لگاؤ۔ آؤ اندر چل کر بات کرتے ہیں۔'' مراد نے کمرے کا تالا کھولتے ہوئے کہا۔
''کوئی بات نہیں کروں گی۔ جب تک تم یہ سب بند نہیں کرو گے۔'' سحرش بولی۔
''شاید تمہیں کچھ غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ارے واقعی میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' مراد نے اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کی۔
''یعنی تم یہ سب بند نہیں کرو گے۔ یونہی خون کی ہولی کھیلتے رہو گے۔ لگتا ہے تمہیں اب میری ذرا برابر بھی فکر نہیں ہے۔''
''کیا مطلب؟ آؤ تم اندر تو آؤ۔ اب کام کی بات کی نا تم نے۔ مجھے پہلی بار تمہاری آنکھوں میں اپنے لیے کچھ الگ جذبات نظر آ رہے ہیں۔'' مراد نے خوش ہو کر کہا۔
''یہ صرف تمہاری فکر کے جذبات ہیں کچھ اور نہیں۔ تم یہ سب روک دو۔ ورنہ میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔'' سحرش کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔
''ابھی دو لوگ باقی ہیں۔ میں تمہارے ساتھ مکمل انصاف کرنا چاہتا ہوں۔ ادھورا نہیں۔''
''تو تم نہیں رکو گے؟''
''نہیں۔'' مراد نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔
سحرش نے کچھ نہیں کہا اور مڑ کر واپس اپنے گھر کی طرف جانے لگی۔ مراد نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔
سحرش اپنے گھر کی طرف جا تو رہی تھی مگر اسے ایک ایک قدم منوں وزنی لگ رہا تھا۔ وہ کسی الجھن میں تھی۔ اچانک وہ رک گئی اور واپس مراد کے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔
''میں مراد کو یہ سب نہیں کرنے دوں گی۔ اسے میری بات ماننا ہی پڑے گی۔'' تیز تیز قدموں سے وہ اپنے اور مراد کے گھر کا فاصلہ کم کر رہی تھی۔
جب وہ گھر کے باہر پہنچی تو دروازہ بند تھا۔ اندر مراد نہانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دستک ہوئی تو وہ ہڑبڑا گیا۔ اس نے جلدی سے تولیہ اپنی کمر کے گرد لپیٹا اور دروازہ کھول دیا۔
''سحرش تم......'' وہ حیران رہ گیا۔ اسے گمان بھی نہیں تھا کہ سحرش واپس بھی آ سکتی ہے۔ ''تم رکو میں کپڑے پہن لوں۔'' یہ کہتے ہوئے مراد نے دروازہ بند کر لیا۔
''سحرش! میں سمجھا تم چلی گئی ہو۔ میں نہانے ہی جا رہا تھا۔''
''میں یہ کہنے کے لیے واپس آئی ہوں کہ میری خاطر رک جاؤ۔ مجھے یہ سب ٹھیک نہیں لگ رہا۔ تم ہی بتاؤ ان کو مارنے سے کیا حاصل ہوگا۔ کیا میری عزت...... میرے جذبات...... میری سوچ واپس

ہو سکتی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں...... میرے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب کچھ بدل نہیں سکتا۔ تم بیکار میں ان کے گندے خون سے اپنے ہاتھ رنگ رہے ہو۔"

"کہنے کو تو مجھ سے محبت کے دعوے کرتے ہو۔ مگر میری ایک بات بھی ماننے کو تیار نہیں ہو۔ کیا یہی تمہاری محبت ہے۔ تم یہ بھی نہیں سوچ رہے کہ اگر تمہیں ہی درندہ سمجھ لیا گیا تو پھر کیا ہوگا۔"

"کیا تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہو۔ جو تمہیں میری اتنی فکر ہو رہی ہے۔" مراد نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"محبت میرے لیے ایک الجھن بن گئی ہے۔ میں شاید زندگی میں دوبارہ کبھی کسی سے محبت نہیں کر پاؤں گی۔ بس انسانیت کے ناتے مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔" سحرش نے وضاحت کی۔

"باہر تم نے کہا تھا کہ کیا میری فکر نہیں تمہیں۔ تم نے ایسا کیوں کہا تھا۔"

"اگر تم میری وجہ سے یہ خون خرابہ کرتے رہو گے تو مجھے کون سی خوشی مل جائے گی۔ بلکہ اور زیادہ پریشان ہو جاؤں گی۔ اگر مجھ سے محبت کرتے ہو تو کیا تم یہ چاہو گے کہ میں پریشانیوں میں گھری رہوں اور کیا ایسے حالات میں مجھے تمہاری فکر نہیں ہونی چاہیے۔ تم ایسا خطرناک کھیل کھیل رہے ہو جس میں تمہاری اپنی جان کو بھی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔" سحرش نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"واہ...... تم کو میری فکر ہونے لگی ہے۔ یہی تو محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔" مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب کسی اور سے محبت کرنا میرے لیے ناممکن ہے۔ یہ محبت نہیں ہے۔ صرف تمہاری فکر ہے اور کچھ نہیں ہے۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ لیکن اگر تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو تمہیں فوراً یہ خونی کھیل بند کرنا ہوگا۔"

مراد نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ "ٹھیک ہے سحرش۔ سب تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔ جیسا تم کہو لیکن کم سے کم اس وحید ملک کا کھیل تو ختم کرنے دو۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ وہی وہ درندہ ہے جس نے اتنی دہشت پھیلا رکھی ہے اور بے گناہ معصوم لوگوں کے خون سے اپنے نامعلوم جذبوں کی آبیاری کر رہا ہے۔"

"کون وحید ملک؟" سحرش نے پوچھا۔

"وہ پولیس والا جو تمہیں زبردستی اپنے گھر لے گیا تھا۔ اس کا نام وحید ملک ہے۔" مراد نے بتایا۔

"اگر وہی درندہ ہے تب بھی تم کیوں قانون اپنے ہاتھ میں لے رہے ہو۔ میرے جیتے جی تم ایسا کچھ نہیں کرو گے سمجھ لو۔ مجھے مار دو پھر جو چاہے کرتے پھرو۔" سحرش نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے۔ میں یہ بات انسپکٹر رفیق مغل کو بتا دوں گا۔ آگے وہ خود سنبھال لے گا۔" مراد نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"شکریہ مراد۔ یہ سن کر میرے دل کو بہت سکون ملا ہے۔ کاش تم مجھے پہلے ملے ہوتے۔" سحرش نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب میں چلتی ہوں مراد۔ باجی پریشان ہو رہی ہوں گی۔"

"مجھ سے ملتی رہنا۔ کم از کم اچھے دوست کی حیثیت سے تو ہم مل ہی سکتے ہیں نا۔" مراد نے امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل۔" وہ مراد کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

"تم جھوٹ بول سکتی ہو سحرش، لیکن تمہاری آنکھیں تمہارے دل کی بات مجھ سے کہہ گئی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرنے لگی ہو بس اپنے ساتھ ہونے والے فریب کی وجہ سے ہچکچا رہی ہو اور شاید اسی وجہ سے تم میری محبت کو قبول نہیں کر پا رہی ہو۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تم کب تک خود کو یونہی دھوکے میں رکھ سکتی ہو۔" مراد بھی بڑبڑاتا ہوا دوبارہ غسل خانے میں گھس گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

رفیق نے بھولو کو بلایا اور کہا۔ "مجھے سب انسپکٹر وحید ملک کی تصویر چاہیے۔"

"ان کی تصویر کا کیا کریں گے سر۔" بھولو نے بھولپن سے پوچھا۔

"ہے کوئی کام۔ تم تصویر تو لاؤ۔"

"او کے سر۔"

رفیق نے بھولو کے جانے کے بعد راجو کا نمبر ملایا۔ "ہیلو ریاض۔ ایک بات تو بتاؤ۔ کیا وردا نے کبھی سب انسپکٹر وحید ملک کو دیکھا ہے؟"

"نہیں سر۔ وحید ملک ابھی تک اس کے سامنے نہیں آیا ہے۔" راجو نے جواب دیا۔

"کل صبح میں وحید کی تصویر لے کر آؤں گا وردا کو دکھانے کے لیے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ وحید ہی ہمارا مطلوبہ مجرم ہے۔" رفیق نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

پھر رفیق نے اچانک فون کاٹ دیا۔ اس کے دروازے پر وحید ملک کھڑا تھا۔

"گڈ مارننگ سر۔ کیسے ہیں آپ؟" وحید نے کہا۔

"وحید تم...... آؤ۔" رفیق جلدی سے بولا۔

"ابھی ابھی لاہور سے واپس آ رہا ہوں سر۔ جلد ہی آپ سے ملتا ہوں۔" یہ کہہ کر وحید وہاں سے چلا گیا۔

"حیرت ہے۔ میں اس کا سینئر ہوں اور خود ہی اسے اندر بلا رہا ہوں اور وہ ٹال کر چلا گیا۔ شاید اس نے میری فون پر ہونے والی بات سن لی ہے۔" رفیق سوچ میں پڑ گیا۔

وہ انہی سوچوں میں تھا کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے دیکھا اس کی چھوٹی بہن پنکی کی کال تھی۔

"بھیا میری برتھ ڈے پر تو وقت پر آ جاؤ گے نا۔ آج تو ممی پاپا بھی نہیں ہیں یہاں۔ میں نے ایسا روکھا پھیکا برتھ ڈے کبھی نہیں منایا۔" پنکی نے کہا۔

"بس تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ کیا گفٹ لاؤں تمہارے لیے۔"

"مجھے کیش دے دینا۔ میں خود خرید لوں گی۔ گفٹ کے معاملے میں آپ کی چوائس بالکل بھی اچھی نہیں ہے۔"

"اوکے، جیسے تمہاری مرضی۔ آ رہا ہوں تھوڑی دیر میں۔" یہ کہہ کر رفیق نے فون بند کر دیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا اور وحید ملک کے بارے میں سوچتا رہا۔ "اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا ہوگا۔ تب ہی بات بن پائے گی۔ فی الحال گھر چلتا ہوں ورنہ پنکی جان لے لے گی میری۔"

پھر رفیق تھانے سے نکلا اور پنکی کے منع کرنے کے باوجود راستے میں ایک شاپنگ سینٹر کے سامنے رک کر اس نے پنکی کے لیے ایک اچھی سی جینز کا تحفہ لیا۔ گھر پہنچ کر رفیق نے چپ چاپ دروازہ کھولا۔ اندر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

"یہ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے پنکی نے۔" رفیق نے یہ سوچتے ہوئے فوراً لائٹ جلائی۔

لائٹ جلا کر وہ جیسے ہی مڑا اس کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ ڈرائنگ روم کے بیچوں بیچ پنکی ایک کرسی پر عریاں حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ اور اس کے بالکل پیچھے ایک نقاب پوش کھڑا تھا اور پستول کی نال پنکی کے سر سے

لگا رکھی تھی۔

"میں نے سوچا برتھ ڈے پارٹی میں میں بھی شامل ہو جاؤں۔ ہی ہی ہی۔ اپنا پستول مجھے دے دو اور ہاتھ اوپر کرکے کھڑے ہو جاؤ۔" نقاب پوش نے حکم دیتے ہوئے کہا۔

"وحید...... یو باسٹرڈ۔ تمہاری اتنی ہمت۔" رفیق چلایا۔

"میرے پیچھے پڑے ہو۔ آج پتہ چلے گا تمہیں، جلدی سے اپنی پستول مجھے دو۔ ورنہ تمہاری بہن کا بھیجہ اڑا دوں گا اور سب جانتے ہیں کہ رحم نام کا لفظ میری ڈکشنری میں موجود ہی نہیں ہے۔" درندے نے غراتے ہوئے کہا۔

لاچار ہو کر رفیق نے اپنا پستول نکال کر زمین پر رکھا اور پاؤں سے ٹھوکر مار کر نقاب پوش کی طرف دھکیل دیا۔

"گڈ...... اب اپنے ہاتھ اوپر کرو۔ کوئی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو بہت برا انجام ہوگا سر۔" درندہ ہنستے ہوئے بولا۔ "صوفے پر رکھے انجکشن کو اپنے بازو میں لگاؤ تاکہ میں کچھ موج مستی کرسکوں۔"

رفیق الجھن میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ "دیکھو۔ ایک بات غور سے سنو۔ تم بےشک مجھے گولی مار دو مگر بہن کو چھوڑ دو۔ اسے اس سارے کھیل سے الگ رکھو۔ وہ یہ سب برداشت نہیں کرسکتی۔ پلیز۔" رفیق نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

"آیا تو میں تمہیں ہی مارنے تھا۔ مگر یہاں یہ مل گئی تو مزا اور بھی دوبالا ہو گیا۔ برتھ ڈے کے لیے گھر تو سجا رکھا ہے مگر کسی مہمان کو مدعو ہی نہیں کیا۔ ایسا کیوں۔ چلو اچھا ہے ناکہ میں تو آ گیا۔"

"میں پھر پوچھ رہا ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ میں تمہاری بہن کی عزت کے ساتھ کھیلوں اور تم چپ چاپ بیٹھ کر تماشہ دیکھو۔ بولو کرو گے ایسا۔" وحید ملک ایسی سچویشن سے خوب مزا لے رہا تھا۔

یہ سب رفیق کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے ہاتھ میں لیے انجکشن وحید کی طرف پھینکا۔ وحید نے اس کی طرف فائر کیا مگر نشانہ چوک گیا۔ رفیق کے لیے اتنی مہلت ہی کافی تھی۔ اس نے پھرتی سے چھلانگ لگا کر وحید کو دبوچ لیا۔ دونوں زمین پر گر گئے اور رفیق نے وحید پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ اسی دھینگا مشتی میں انجکشن وحید کے ہاتھ میں آ گیا اور اس نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر اسے رفیق کی گردن میں انجیکٹ کر دیا۔ اسی دوران رفیق کے ہاتھ میں بھی گن آ گئی تھی مگر وہ اسے چلا نہیں پایا اور بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

"اب تمہارا برتھ ڈے خوب اچھی طرح سے مناؤں گا میں۔" وحید مکروہ ہنسی کے ساتھ پنکی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

"پلیز۔ کیوں کر رہے ہو تم ایسا۔" پنکی گڑگڑائی۔

"چپ کر...... مجھے تم جیسی کالج گرل بہت اچھی لگتی ہیں۔ آؤ تم بھی اپنی سالگرہ پر مزے کرو۔ مرنے سے پہلے تھوڑی موج مستی کرلو گی تو تمہاری روح کو بھی سکون ملے گا۔" وحید کے ہر قہقہے کے ساتھ پنکی کی جان آدھی ہوتی جا رہی تھی۔

وحید نے رفیق کو کھینچ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا اور رسی سے کس کر باندھ دیا اور اس کی گردن پر ایک اور انجکشن لگا دیا۔

"اب اسے جلد ہی ہوش آ جائے گا اور یہ خود تمہاری سالگرہ کا تماشہ دیکھے گا اپنی آنکھوں سے۔ پچھلے سال ایک چھوٹی سی بات پر اس نے میری بہت بےعزتی کی تھی۔ وہ بھی کچھ سپاہیوں کے سامنے۔

میں آج تک چپ رہا۔ موقع کی تلاش میں تھا۔ مگر اس سے پہلے یہ ہی میرے پیچھے پڑ گیا۔ آج میرا انتقام بھی پورا ہو جائے گا۔"

"پلیز ایسا ظلم مت کرو۔" پنکی بلک کر بولی۔

"کچھ بھی کہو۔ مجھے تو یہ کام کرنا ہے اور وہ بھی تمہارے اس بھائی کی آنکھوں کے سامنے۔" جتنا گھناؤنا اس کا کردار تھا اتنا ہی گھناؤنا اس کا منصوبہ بھی۔

"تو سچ میں تم ہی وہ درندے ہو؟" پنکی نے پوچھا۔

"ہا...... بہت خوب...... دیکھو تمہارے بھائی کو ہوش آ رہا ہے۔ ہوش کی دنیا میں واپسی مبارک سر۔ کیسے ہیں آپ؟" وحید مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔

"وحید۔ تمہیں تمہارے گناہوں کی سزا ضرور ملے گی۔ میں نہیں دے پایا تو کوئی اور دے گا۔ مگر دے گا ضرور۔ میں تو یہ جان کر ہی حیران ہوں کہ تم ہی وہ درندے ہو جس نے پورے شہر میں خوف کی فضاء قائم کر رکھی ہے۔"

"اب اپنی بکواس اپنے پاس ہی رکھو اور دیکھو کہ میں تمہاری بہن کے ساتھ کیسے برتھ ڈے مناتا ہوں۔" یہ کہہ کر وحید پنکی کے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"کمینے دور رہو میری بہن سے۔ ورنہ خون کر دوں گا میں تمہارا۔" رفیق نے کرسی پر تڑپتے ہوئے کہا۔

"میں کیسے دور رہوں سر آپ کی بہن اتنی پیاری ہے۔" پھر وہ پنکی کی طرف مڑا۔ "ہاں تو میرے سر کی پیاری سی بہن۔ کہو کہ تم اپنی خوشی سے میرے ساتھ برتھ ڈے مناؤ گی۔"

پنکی نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

اسی وقت بہت زور کی آواز سنائی دی۔

"یہ کیسی آواز تھی۔" وحید نے حیرانی سے کہا۔

رفیق سمجھ گیا کہ آواز گھر کے پچھلے حصے سے آئی ہے مگر وہ کچھ نہیں بولا۔

"کیا تم دونوں کے علاوہ گھر میں کوئی اور بھی ہے۔" وحید نے پنکی کے بالوں کو جکڑتے ہوئے پوچھا۔

"اور کوئی نہیں ہے۔" پنکی کراہ کر بولی۔ "صرف ہم دونوں ہی ہیں۔ ساتھ والے گھر میں بچے دھوم دھام کرتے رہتے ہیں۔ وہیں سے ایسی آوازیں آتی رہتی ہیں۔"

"او کے ٹھیک ہے۔ تو سر مجھے اپنا تماشہ شروع کرنے کی اجازت ہے۔"

وحید نے پستول ایک طرف رکھا اور پنکی کو دبوچ لیا۔ پنکی نے شرم کے مارے آنکھیں بند کرلیں۔

وحید کو کسی نے پیچھے سے پکڑ کر کھینچا۔ اچانک وحید نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ک ک...... کون ہے۔"

"اپنے باپ کو نہیں پہچانا بیٹا۔" مراد نے یہ کہتے ہوئے وحید کو پنکی کے اوپر سے کھینچ لیا اور اسے زمین پر گرا کر گھونسے مارنے لگا۔ لیکن وحید بھی جلد ہی سنبھل گیا اور دونوں کے بیچ میں زبردست ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ کبھی مراد حاوی ہو رہا تھا تو کبھی وحید۔

اور اسی دوران پستول مراد کے ہاتھ میں آ گیا۔ جس کی نال اس نے وحید کی کنپٹی سے لگا دی۔

"بس بہت ہو گیا۔ اب تمہارا کھیل ختم...... کسی سے وعدہ کیا ہے خون نہ بہانے کا ورنہ ابھی تیرا بھیجہ اڑا دیتا۔" پستول ہاتھ میں آنے کے بعد مراد کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی کا شکار ہو گیا تھا اور یہی خود اعتمادی اسے لے ڈوبی۔

وحید نے اچانک انجکشن مراد کی گردن میں گاڑ دیا۔ مراد درد سے کراہ اٹھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا اور وہ بے ہوش ہو کر وحید کے اوپر گر گیا۔

مراد اور وحید کی لڑائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پنکی نے عقل سے کام لیا اور اپنے حواس برقرار رکھتے

ہوئے رفیق کے ہاتھ پاؤں کھول دیئے۔
"پنکی تم اپنے کمرے میں جاؤ اور اندر سے کنڈی لگالینا۔" رفیق نے پنکی کی طرف سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔
پنکی فوراً وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
وحید نے مراد کو ایک طرف دھکیلا اور اس کے ہاتھ سے پستول لے کر رفیق کی طرف تانی مگر رفیق کے بڑھتے ہوئے قدم رکے نہیں۔
"کیا ہوا۔ چلاؤ گولی...... رک کیوں گئے۔"
"گولی تو تم کو مارنی ہی ہے۔" وحید نے نفرت سے کہا۔
ابھی وحید اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اچانک رفیق نے ایک ایسا وار کیا کہ پستول اس کے ہاتھ سے نکلتا چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی رفیق کا اگلا مکہ وحید کے منہ پر پڑا۔ مکہ اتنی زور کا تھا کہ وحید کے اگلے دو دانت ٹوٹ کر باہر آ گرے اور اس کا منہ خون سے بھر گیا۔
اس کے بعد رفیق نے وحید کی طرف سے کی گئی ہر بدتمیزی کا جواب دینا شروع کر دیا۔ رفیق اپنی چھوٹی بہن سے اتنی محبت کرتا تھا کہ کبھی اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی بھی نہیں دیکھ پاتا تھا کہاں وحید نے اتنی گھناؤنی حرکت کر ڈالی تھی اس کی لاڈلی بہن کے ساتھ۔ وحید بچنے کی بہت کوشش کر رہا تھا مگر اس کا کوئی داؤ نہیں چل پا رہا تھا۔
"میری بہن کے ساتھ تم نے اتنی گری ہوئی شرمناک حرکت کی...... اسے چھونے کی ناپاک کوشش کی تو نے...... کمینے میں تیرے یہ ہاتھ ہی کاٹ ڈالوں گا۔ تم خود کو درندہ کہلوا کر فخر کرتے ہو نا۔ آج دیکھ میں تجھے کیسی درندگی دکھاتا ہوں۔" رفیق کا ہاتھ ایک پل کے لیے بھی نہیں رک رہا تھا۔

رفیق نے اسے اتنا مارا کہ خود اسے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ تب اس نے پستول کی نال وحید کے سر پر رکھ دی۔
"نہیں نہیں۔ مجھے مت مارو۔ مجھے جیل میں ڈال دو۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے غلطی کی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ قانون جو سزا دے گا مجھے منظور ہے۔" وحید گڑگڑاتے ہوئے بولا۔
"قانون نہیں۔ سزا تجھے میں دوں گا۔ اب تیرے پاپ کا گھڑا بھر چکا ہے۔ انصاف ابھی اور اسی وقت ہوگا۔" رفیق نے آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔
"دیکھو۔ یقین کرو میں وہ سیریل کلر نہیں ہوں۔" جان پر بنتی دیکھ کر وحید کی ساری ہیکڑی نکل چکی تھی۔
"اچھا! تو پھر کون ہو تم، اس کے بھائی ہو یا بیٹے کون ہو تم......؟"
"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میں وہ سیریل کلر نہیں ہوں۔ میں نے تو صرف اس کی پھیلائی ہوئی دہشت کا فائدہ اٹھانا چاہا تھا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تمہارے اور تمہاری بہن کے ساتھ نہایت گھٹیا حرکت کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مجھے قانون کے حوالے کر دو۔ میں خاموشی سے ہر سزا بھگت لوں گا۔"
"پکڑے جانے پر ہر مجرم یہی کہتا ہے۔ تم تو خود سب انسپکٹر ہو۔ تم خود یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔"
"ہاں۔ مگر میں سچ بول رہا ہوں۔ میں سیریل کلر نہیں ہوں۔" وحید گڑگڑاتے ہوئے بول رہا تھا۔
"مجھے آج کم سنائی دے رہا اور میرا دماغ بھی خراب ہو چکا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ بہرحال جہنم کے سفر کی تیاری کر لو۔ کاش خدا تمہارا ابھی حافظ ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے رفیق نے بلا جھجک وحید ملک کا بھیجہ اڑا دیا اور اس کے گندے خون کی کچھ چھینٹیں رفیق کی طرف بھی

آ گئیں۔
اس کے بعد رفیق نے اپنی جیب سے موبائل نکالا اور ڈی ایس پی شہلا احمد کا نمبر ملایا۔
"میڈم میں نے درندے کو گولی مار دی ہے۔ اس کی لاش میرے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔ آئی ایم سوری میں خود کو نہیں روک سکا۔"
بس اتنا کہہ کر رفیق نے فون کاٹ دیا۔
اگلے بیس منٹ میں شہلا احمد رفیق کے گھر پر پہنچ چکی تھی۔ رفیق گم صم خاموش بھیگی ہوئی آنکھیں لیے پنکی کے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا قانون کو اندر آنے کے لیے۔ شہلا کو فون کرنے کے بعد رفیق نے ایک ڈاکٹر کو بھی بلا لیا اور اس کے دیئے ہوئے انجکشن کے اثر سے مراد کو بھی ہوش آ گیا تھا۔
"کون تھا یہ؟" شہلا خون میں لت پت چہرے کو پہچان نہیں پائی۔
"وہی۔ جس پر ہمیں شک تھا۔ وحید ملک۔"
"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اب مجھے مجبور ہو کر تمہارے خلاف ایکشن لینا ہوگا۔" شہلا افسردہ لہجے میں بولی۔
"آپ نے جو ایکشن لینا ہے لے لیجئے۔ مگر میں اسے کسی بھی حالت میں زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں تو کیا کوئی بھی غیرت مند بھائی ایسا ہی کرتا۔ اس نے میری آنکھوں کے سامنے میری بہن کے ساتھ۔" آنسوؤں میں ڈوبا رفیق اس سے آگے نہیں کہہ پایا۔
"بس بھیا بس۔" پنکی روتے ہوئے رفیق کے سینے سے لگ گئی۔
شہلا کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ "رفیق۔ یہ گولی تم نے سیلف ڈیفنس میں چلائی ہے۔ سمجھ گئے نا۔"
"جیسا آپ کہیں میڈم میں نے آپ کو سب سچ بتا دیا ہے۔"
یہ بات ہم دونوں کے بیچ رہے گی ڈھنڈورا مت پیٹنا کہ تم نے درندے کو گولی ماری ہے، سمجھے۔" شہلا نے پھر سمجھایا۔
"سمجھ گیا میڈم۔" رفیق نے کہا۔
"شکر ہے کہ آخرکار یہ کیس بھی کلوز ہو ہی گیا۔ مبارک ہو رفیق۔ گڈ جاب۔"
رفیق نے شہلا کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔
"تھینک یو میڈم، یہ سب آپ کی ڈانٹ کا نتیجہ ہے۔"
اس بات پر شہلا ہنس پڑی۔ "وہ تو ہے اور یہ مت سوچنا کہ آئندہ ڈانٹ نہیں پڑے گی۔ ابھی اور بھی بہت سے ایسے کیسز ہیں جنہیں تم نے ہینڈل کرنا ہے۔" ہنسی کے بعد شہلا دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی اور وہی کرخت لہجہ۔
"بالکل میڈم۔ میں جانتا ہوں۔"
شہلا کی نظر مراد پر پڑی تو بولی۔ "یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟"
"یہ اگر وقت پر نہ آتا تو میرے سامنے میری بہن...... مگر ہاں، مراد تم یہاں آئے کیسے؟" اب رفیق نے دھیان دیا تو اس بات پر وہ بھی چونک گیا کہ آخر یہاں مراد کا کیا کام۔
"میں آپ کو بتانا چاہتا تھا کہ وحید ملک ہی درندہ ہے۔ میں اس کی بیوی سے ملا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس رات وحید زخمی حالت میں گھر لوٹا تھا۔ جس رات میری سیریل کلر سے جھڑپ ہوئی تھی۔ وحید کی بیوی ڈاکٹر رہ چکی ہے۔ اس نے گھر پر ہی اس کو آپریٹ کیا تھا۔ اتنا ہی کلیو کافی تھا مجھے یہ سمجھانے کے لیے کہ وحید ہی درندہ ہے۔ میں فوراً یہ بات آپ کو بتانے کے لیے تھانے پہنچا۔ وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ آپ گھر چلے گئے ہیں۔ وہاں سے آپ کے گھر کا

ایڈریس لے کر یہاں آ گیا۔ جب میں دروازے کی بیل بجانے لگا تو مجھے اندر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں سمجھ گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ پھر میں آپ کے گھر کی پچھلی طرف سے کسی طرح اندر کود آیا۔ اس کے بعد باقی تو آپ کو پتہ ہی ہے۔"

"پیچھے سے آواز تو آئی تھی۔ مگر میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ تم ہو سکتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے رفیق نے مراد کو گلے سے لگا لیا۔

"میں نے تو اپنا فرض نبھایا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" مراد نے کہا۔

تھوڑی دیر میں وحید کی لاش کو وہاں سے ہٹا لیا گیا۔ سب کے جانے کے بعد رفیق نے پنکی سے کہا۔ "میرے ہوتے ہوئے تم کو اتنا کچھ سہنا پڑ گیا۔ مجھے معاف کر دینا میری بہن۔"

"ایسے تو مت کہیں بھیا۔ اس نے حالات ہی کچھ ایسے پیدا کر دیئے تھے۔ چلیں اب میرا گفٹ دیں۔" پنکی نے رفیق کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

رفیق نے جذباتی ہو کر پنکی کو گلے سے لگا لیا۔ اس واقعے کے بعد ان کا رشتہ اور بھی مضبوط ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆

مراد نے رات کو ہی راجو کو سب کچھ بتا دیا اور یہ سنتے ہی وہ وردا کے دروازے کی طرف لپکا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے بیل بجائی تو وردا کے ابو نے دروازہ کھولا۔

"مجھے ابھی ابھی پتہ چلا ہے کہ درندہ مارا جا چکا ہے۔ کیا میں وردا جی سے مل سکتا ہوں۔"

"اوہ وہ مارا گیا' بہت اچھا ہوا۔ اب میری بیٹی سکون سے جی پائے گی۔"

"کیا میں وردا جی سے مل سکتا ہوں۔" راجو نے دوبارہ پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گولی کھا کر سوئی ہے۔ اسے اٹھانا مناسب نہیں ہے۔" ابو نے کہا۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ میں ان سے کل صبح مل لوں گا۔"

"ہاں بیٹا۔ کل صبح ہی مل لینا تو بہتر ہو گا۔"

راجو یہ خبر وردا کو سنانے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ جب وہ واپس جیپ میں آیا تو اسی وقت شہلا کا فون آیا۔

"ریاض۔ وہ سیریل کلر وحید ملک ہی تھا اور اب وہ مارا جا چکا ہے۔"

"جی میڈم۔ مجھے پتہ چل چکا ہے۔"

"تمہیں اب وہاں ڈیوٹی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اب گھر جا سکتے ہو۔ کل صبح تھانے آ جانا اور ہاں تمہارے ساتھ وہاں جو سپاہی ہیں ان کو بھی چھٹی دے کر کل صبح تھانے میں رپورٹ کرنے کا کہہ دو۔" شہلا نے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"اوکے میڈم۔"

راجو نے سپاہیوں کو تو چھٹی دے دی۔ مگر خود وہیں جیپ میں بیٹھا رہا۔ اسے وردا سے ایک بار بات جو کرنی تھی۔ وہ چپ چاپ افسردہ دل لیے وردا کی کھڑکی پر نظریں ٹکائے بیٹھا رہا۔ کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اٹھا اور اس کھڑکی کی طرف چل دیا۔

"یہاں سے اوپر چڑھا جا سکتا ہے۔" راجو نے سوچا۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا تھا۔ بنا سوچے سمجھے وہ اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور دیوار کے سہارے کسی نہ کسی طرح اس کھڑکی تک پہنچ گیا۔ جہاں سے وردا جھانکتی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے کھڑکی کے شیشے کو بجایا۔ وردا واقعی سوئی ہوئی تھی۔ مگر کھڑکی پر ہونے والی

تھپ تھپ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

"اس وقت کون دروازہ بجا رہا ہے۔" آنکھ کھلتے ہی وردا نے سوچا۔ مگر جلد ہی وہ سمجھ گئی کہ آواز دروازے سے نہیں بلکہ کھڑکی سے آ رہی ہے۔ وہ حیران رہ گئی۔ مگر وہ اٹھی اور ڈرتے ڈرتے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ "راجو تم...... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"وردا جی' درندہ مارا گیا۔ اب آپ کو فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

وردا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس بات پر وہ کس ردعمل کا اظہار کرے۔

"کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔ مجھے تو یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ اب آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔" راجو بولا۔

"تم گر گئے تو...... ایسے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں نے آپ کے ابو کو یہ بات بتائی تھی۔ آپ سے ملنے کی درخواست بھی کی تھی میں نے۔ مگر انہوں نے کہا آپ گولی کھا کر سو رہی ہیں۔ پھر بھی مجھ سے رہا نہیں گیا۔ یہ خبر آپ کو سنانا تھی نا۔" راجو نے معصومیت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا شکریہ۔ اب تم جاؤ۔ ورنہ گر بھی سکتے ہو۔"

اسی وقت وردا کے دروازے پر دستک ہونے لگی۔

"تم جاؤ اب۔ شاید ممی آئی ہیں۔ تم دوبارہ مت آنا۔" وردا نے جلدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ صبح آپ سے مل کر ہی جاؤں گا۔" راجو نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ اب جاؤ بھی۔" وردا دانت بھینچتے ہوئے بولی۔

راجو جھٹ سے نیچے اتر گیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

وردا نے دروازہ کھولا سامنے امی کھڑی تھیں۔

"کیسی طبیعت ہے بیٹا؟"

"ٹھیک ہے امی۔ سر میں ابھی ہلکا ہلکا درد ہے۔" وردا نے کہا۔

"ابھی تم فون پر کسی سے بات کر رہی تھیں کیا؟" امی نے پوچھا۔

وردا سوچ میں پڑ گئی۔ اور اسے امی سے جھوٹ بولنا پڑا۔ "جی فون پر بات کر رہی تھی۔"

"سو جاؤ بیٹا۔ آرام کرو۔ تب ہی تو طبیعت جلدی ٹھیک ہو گی۔" وردا کی امی اسے نصیحت کرتے ہوئے چلی گئی۔

وردا بستر پر گری اور دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆

اگلی صبح وردا جلدی اٹھ گئی اور اپنے کمرے کا ٹی وی آن کیا۔ وہ درندے کی نیوز سننا چاہتی تھی۔ اسے پتہ تھا کہ ٹی وی پر یہ نیوز ضرور دکھائی جائے گی۔ جب اس نے ٹی وی پر خود یہ نیوز سنی تو اس کے دل کو یہ سن کر سکون سا مل گیا کہ درندہ مارا گیا۔ مگر جب ٹی وی پر وحید ملک کی تصویر دکھائی گئی تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ حیرت زدہ سی وحید کی تصویر کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا۔ ایک رنگ جا رہا تھا۔ خوف اس کی آنکھوں سے چھلک رہا تھا۔ ہونٹ تھرا رہے تھے اور پھر الفاظ نے ان تھراتے ہونٹوں کے بیچ جگہ بنائی۔

"درندہ ابھی زندہ ہے۔" وردا بڑبڑائی۔

اس نے فوراً کھڑکی کا پردہ ہٹا کر جھانکا۔ راجو جیپ میں بیٹھے بیٹھے سو رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتری اور دروازہ کھول کر راجو کی جیپ کی طرف بڑھی اور قریب آ کر راجو کا کندھا پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔

"کک کون ہے۔" راجو ہڑ بڑا کر اٹھ گیا۔ "ارے وردا جی آپ؟"

"وہ جو مارا گیا ہے۔ وہ درندہ نہیں ہے۔" وردا نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

"کیا..... آپ کو کیسے پتہ چلا؟"

"میں نے ابھی ابھی ٹی وی پر نیوز دیکھی ہے۔ مرنے والا درندہ نہیں کوئی اور ہے۔"

"اوہ نو۔" یہ سنتے ہی راجو جیپ سے اتر آیا اور فوراً شہلا کا نمبر ملایا۔

"میڈم وحید ملک درندہ نہیں تھا۔ وردا جی نے ابھی نیوز دیکھ کر بتایا ہے کہ وحید درندہ نہیں ہے۔"

"کیا؟" یہ سن کر شہلا بھی حیران رہ گئی۔ "وردا کو فون دو۔"

راجو نے فون وردا کی طرف بڑھا دیا۔ "ڈی ایس پی صاحبہ بات کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہاں وردا۔ ریاض جو کہہ رہا ہے کیا وہ سچ ہے؟" شہلا نے پوچھا۔

"جی میڈم جسے مارا گیا ہے وہ اصل مجرم نہیں ہے۔"

"اوہ میرے خدا..... ریاض کو فون دو۔"

"ریاض۔ یہ لو بات کرو۔" وردا نے فون تھما دیا۔

"ریاض۔ تم وہیں رکو اور تمہاری باقی کی ٹیم کہاں ہے؟"

"انہیں تو میں نے رات کو ہی واپس بھیج دیا تھا۔ آپ سے بات کرنے کے بعد۔" راجو نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں انہیں واپس بھیجتی ہوں۔ تم وہیں رکو اور ہوشیار رہو۔"

"آپ فکر نہ کریں میڈم۔ میرے ہوتے ہوئے یہاں کچھ نہیں ہوگا۔" راجو نے دل سے کہا۔

"گڈ۔" شہلا نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

"وردا جی آپ اندر جائیں۔ یہاں باہر خطرہ ہے۔"

"ہاں جا رہی ہوں۔ تم بھی اپنا خیال رکھنا۔" وردا یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئی اور راجو کے دل میں ہلچل مچ گئی کہ وردا اب اس کا کتنا خیال رکھنے لگی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو سے بات کرنے کے بعد شہلا نے فوراً رفیق کا نمبر ملایا۔

"رفیق جلدی پہنچو۔ جسے تم نے گولی ماری تھی۔ وہ اصل مجرم نہیں تھا۔ کیونکہ ہماری واحد عینی شاہد وردا شمسی کا کہنا ہے کہ وحید ملک وہ درندہ نہیں تھا۔ میں نے ابھی اس سے بات کی ہے۔"

"مگر یہ کیسے؟"

"ایسا ہی ہے۔ تم جلدی سے تھانے پہنچو۔ میں بھی پہنچ رہی ہوں۔ اب سب کچھ نئے سرے سے سوچنا پڑے گا۔" شہلا نے ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"آ رہا ہوں میڈم۔" رفیق کے لہجے میں مایوسی صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

"اچھا ہوا کہ میں رات کو یہیں رک گیا۔ اگر وحید درندہ نہیں تھا تو پھر کون ہے وہ درندہ۔ یہ معاملہ تو اور الجھتا جا رہا ہے۔ ٹی وی پر چلنے والی خبروں کی وجہ سے تو وہ درندہ اور بھی زیادہ چوکنا ہو جائے گا۔" راجو انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے اور وردا کے امی ابو کسی کام سے باہر جا رہے تھے۔ وردا کے ابو نے راجو سے کہا۔ "کسی اور کو ہی مار دیا تم لوگوں نے۔ کیا تم لوگ ایسے ہی کام کرتے ہو۔ عوام ٹھیک ہی کہتی ہے کہ تمہارا محکمہ کسی بھی بے گناہ کو مار کر اپنا کیس کلوز کر دیتا ہے۔ اصلی مجرم آزاد گھوم رہا ہے اور ایک بے قصور مار دیا گیا۔ واہ کیا انصاف ہے کیا قانون ہے۔ میرا تو

پولیس پر سے اعتماد ہی اٹھ گیا ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر ہم بھی انسان ہی ہیں۔ ہم لوگوں سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔" راجو نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

"اور تم لوگوں کی غلطی کی وجہ سے بے قصور مارا جاتا ہے اس کا کیا؟"

راجو نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اب وہ بیچارہ وردا جی کے ابو سے کیا بحث کرتا۔

"ذرا سوچو کہ اگر یہ جھوٹی بات سن کر وردا باہر نکلتی اور درندے کا شکار ہو جاتی تو کیا ہوتا..... وہ تو شکر ہے اس نے ٹی وی پر دیکھ لیا۔ ورنہ مصیبت تو میری بیٹی کے گلے ہی پڑتی نا۔" وردا کے ابو دل کھول کر اپنے پھپھولے پھوڑ رہے تھے۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔" راجو نے بس اتنا ہی کہا۔

"اس وقت تم اکیلے ہی ہو۔ یہ کیسی حفاظت کی جا رہی ہے میری بیٹی کی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ باقی سپاہی بھی جلد ہی واپس پہنچ رہے ہیں۔ میرے ہوتے ہوئے وردا جی کو کچھ نہیں ہوگا۔" راجو نے کہا۔

"ہمیں ضروری کام سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ شام تک لوٹیں گے۔ کیا ہم تم پر بھروسہ کر کے جائیں؟" ابو نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ بے فکر ہو کر جائیں۔" راجو بولا۔

تھوڑی دیر بعد وردا کی امی اور ابو کار میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی محکمے کے دو گن مین اور چار سپاہی بھی پہنچ گئے۔

راجو نے تین تین کی ٹولی بنا کر ان کی گھر کے آگے اور پیچھے ڈیوٹی لگا دی۔ "بالکل الرٹ رہنا تم لوگ۔" راجو نے کہا اور سب نے گردن ہلا کر اس کی ہدایت مان لی۔

سب کو ڈیوٹی پر لگا کر راجو پھر سوچ میں ڈوب گیا۔

وردا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہی۔

شام کے سات بج رہے تھے جب ایک آدمی وہاں پہنچا اس کے ہاتھ میں دو ڈبے تھے۔ اس نے راجو سے پوچھا۔ "وردا شمسی یہیں رہتی ہیں؟"

"ہاں یہیں رہتی ہیں۔ کیا کام ہے؟" راجو نے کہا۔

"ان کا کوریئر آیا ہے۔" آدمی نے کہا۔

راجو نے ایک سپاہی سے کہا کہ اس کی تلاشی لے کر اس کے ساتھ جاؤ۔ سپاہی نے اچھی طرح سے اس آدمی کی تلاشی لی اور اس کے ساتھ چل دیا۔

بیل کے جواب میں وردا نے بڑی دیر کے بعد دروازہ کھولا۔ اسے لگ رہا تھا کہ دروازے پر راجو ہی ہوگا۔ مگر جب اس آدمی نے چلا کر کہا کہ آپ کا کوریئر ہے۔ تب کہیں جا کر اس نے دروازہ کھولا اور سائن کر کے دونوں ڈبے لے لیے۔

"کس نے بھیجے ہیں یہ ڈبے؟" وہ بڑبڑائی اور جیسے ہی اس نے ایک ڈبہ کھولا اور اس نے ڈبے کے اندر جو دیکھا اسے دیکھ کر وہ اتنی زور سے چلائی کہ باہر بیٹھا راجو بھی بری طرح سے چونک اٹھا۔ چیخنے کے بعد وردا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ابو..... نہیں۔"

راجو فوراً پستول نکال کر گھر کی طرف بھاگا۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ راجو زور زور سے دستک دینے لگا۔ مگر وردا کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ وہ دروازہ کھول پاتی۔ راجو نے بہت زور کا دھکا مارا لیکن دروازہ کافی مضبوط تھا۔ مگر راجو رکا نہیں۔ اس نے بار بار کوشش کی۔ گن مین اور سپاہیوں نے بھی اس کی مدد کی۔ آخر کار کار لاک ٹوٹ گیا اور دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ راجو اندر گھسا تو اس نے دیکھا کہ وردا

ڈبے کے پاس بیٹھی بے تحاشہ روئے جارہی ہے۔
راجو قریب آیا تو وہ بھی ایک بار جھانکنے کے بعد دوبارہ دیکھ نہیں پایا۔ ”اوہ مائی گاڈ...... نہیں...... یہ سب کیسے...... ورداجی۔“
ڈبے میں وردا کے ابو کا کٹا ہوا سر تھا۔ ساتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا بھی رکھا تھا۔ راجو نے کانپتے ہاتھوں سے وہ اٹھایا اور پڑھنے لگا۔
”وردا میں تمہارے لیے یہ تحفہ بھیج رہا ہوں۔ امید ہے تمہیں بہت پسند آئے گا۔ یہ سب دیکھ کر تمہارے چہرے پر جو ڈر آئے گا۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ کتنا خوبصورت ہوگا۔ یہ ڈر اپنے چہرے پر قائم رکھنا۔ کیونکہ میں بہت جلد تم سے ملنے والا ہوں اور یاد رکھنا۔ تم بھاگ تو سکتی ہو مگر چھپ نہیں سکتیں۔ جلد ہی ملتے ہیں۔“
دوسرے ڈبے میں کیا ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر ہی راجو کی روح تک کانپ گئی تھی۔ اس نے ہمت کر کے دوسرا ڈبہ کھولا۔ اور اس کے شک کے عین مطابق اس میں وردا کی امی کا سر تھا۔ وردا یہ بات شاید پہلے ہی سمجھ گئی تھی۔ اس لیے اس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا۔ ویسے اس وقت اس کی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ وہ دیکھ پاتی، مگر جتنا اس نے دیکھا تھا وہ اس کے ہوش چھین لینے کے لیے کافی تھا۔
راجو نے موبائل نکال کر شہلا کو فون لگایا۔ ”میڈم قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔“
”اب کیا ہوا ریاض۔“ شہلا نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ اتنی بری خبریں سنائی دے رہی تھیں کہ اب اچھی خبر کا شائبہ تک نہیں رہا تھا۔
”کوریئر کے ذریعے ورداجی کے گھر دو بکس آئے ہیں۔ ان میں وردا کی امی اور ابو کے کٹے ہوئے سر رکھے ہیں۔ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا ہے کہ ایسی صورت حال میں کیا کروں۔“
”اوہ یہ تو واقعی اس نے قیامت ڈھا دی ہے۔“ شہلا نے کہا۔
شہلا کے سامنے اس وقت رفیق بیٹھا ہوا تھا اس نے پوچھ لیا۔ ”کیا ہوا میڈم۔“
”اس درندے نے کوریئر سے وردا کے ماں باپ کے کٹے ہوئے سر بھیجے ہیں۔“ شہلا نے رفیق کو بتایا۔
”اوہ نو۔“ رفیق کو بھی جیسے گہرا صدمہ پہنچا تھا۔
”راجو ہم ابھی وہاں پہنچتے ہیں۔“ شہلا نے کہا۔
ابھی شہلا نے فون بند ہی کیا تھا کہ بھولو بھاگتا ہوا کمرے کے اندر آیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ شہلا نے دل تھام لیا ایک اور بری خبر سننے کے لیے۔ ”کیا بات ہے۔ تم اس طرح بھاگتے ہوئے کیوں آ رہے ہو؟“
”وہ...... وہ میڈم وہ......“ بھولو سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔
”کچھ بتاؤ گے بھی کہ کیا ہوا؟“ اس بار شہلا نے غصے سے کہا۔
”میڈم تھانے کے سامنے کوئی دو لاشیں پھینک گیا ہے۔ اور ان دونوں لاشوں کے سر غائب ہیں۔“
”کیا۔“ شہلا اور رفیق ایک ساتھ چلائے اور فوراً باہر کی طرف بھاگے۔ تھانے کے بالکل سامنے دو لاشیں پڑی تھیں۔
”وہ دن دھاڑے دو لاشیں پھینک کر چلا گیا اور کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“ شہلا طیش میں بولی۔
رفیق کو ایک مردانہ لاش کی جیب میں کاغذ کا ٹکڑا دکھائی دیا۔ رفیق نے اسے نکالا اور پڑھنے لگا۔
”مسٹر رفیق مغل۔ تم آج ہر چینل پر چھائے ہوئے تھے۔ مبارک ہو۔ تمہارے لیے بھی ایک فنکارانہ پلان تیار ہے۔ جلد ہی ملیں گے۔“
”تم ملو تو سہی۔ وہ حال کروں گا کہ پھر کسی سے

ملنے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔“ رفیق دانت پیستے ہوئے بولا۔
”کیا لکھا ہے اس کاغذ میں؟“ شہلا نے پوچھا۔
”میرے لیے بھی ایک فنکارانہ پلان بنایا ہے اس درندے نے دھمکی دی ہے مجھے۔“ رفیق نے کہا۔
”یہ دھمکی اس نے تمہیں نہیں۔ پورے پولیس ڈپارٹمنٹ کو دی ہے۔ وہ بہت بڑی چیز ہے۔ ہمت تو دیکھو اس کی تھانے کے عین سامنے دو سر کٹی لاشیں پھینک گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے اس کے کیے کی سزا دی جائے۔ کچھ بھی کرو رفیق۔ میں اس درندے کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتی ہوں۔ جلد سے جلد۔“ شہلا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس درندے کی گردن مروڑ کے رکھ دے جو انسانیت کے نام پر ایک دھبہ تھا۔
”میں پوری کوشش کروں گا میڈم۔ کہ اس کا یہ بھیانک کھیل اب زیادہ دن نہ چل پائے۔“
ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کسی چینل کی تیز طرار رپورٹر وہاں آ دھمکی اور رفیق کے منہ سے مائیک لگا کر بولی۔ ”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ پولیس اسٹیشن کے باہر یہ لاشیں کس کی ہیں۔“
رفیق نے اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔ ”دیکھئے۔ ابھی ہم اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تحقیقات چل رہی ہیں۔“
”تحقیقات ہی کرتے رہیں آپ۔ ایک دن وہ درندہ ہم سب کو چیر پھاڑ کر رکھ دے گا اور آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے تحقیقات ہی کرتے رہنا۔“
”کیا نام ہے آپ کا؟“ رفیق نے پوچھا۔
”میرے نام سے آپ کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہئے۔ مگر پھر بھی آپ کو بتا دیتی ہوں۔ میرا نام مونا ہے۔ میں بھی اس سیریل کلر کے کیس کو فالو کر رہی ہوں۔ کل آپ نے جسے گولی ماری وہ درندہ نہیں تھا۔ وہ زندہ ہے ابھی۔ اس کا ثبوت یہ دو لاشیں ہیں جو تھانے کے باہر پڑی ہیں۔“
”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو یہ سب باتیں کیسے پتہ چلیں؟“ رفیق نے پوچھا۔
”میں نیوز رپورٹر ہوں اور معلومات اکٹھی کرنے کا میرا اپنا طریقہ ہے۔ آپ کو کیوں بتاؤں۔“ مونا نے کہا۔
”دیکھئے ابھی تفتیش چل رہی ہے۔ اس لیے میرے لیے کچھ بھی کہنا مناسب نہیں ہوگا۔“ یہ کہہ کر رفیق اندر چلا گیا۔
رفیق کے جانے کے بعد مونا نے شہلا کو گھیر لیا۔ ”کب تک کھیلا جاتا رہے گا درندگی کا یہ کھیل۔ آخر پولیس کچھ کر کیوں نہیں پا رہی۔“
”ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ پولیس ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ وہ درندہ جلد ہی پکڑا جائے گا۔“
تھوڑی دیر بعد رفیق اور شہلا وردا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ مونا بھی کیمرہ مین کے ساتھ ان کے پیچھے چل پڑی۔
”اگر ہم میڈیا والے پولیس پر دباؤ نہیں ڈالیں گے تو یہ کچھ بھی نہیں کریں گے۔ ایک نمبر کی نکمی پولیس ہے ہماری۔“ مونا نے اپنے کیمرہ مین سے کہا۔
رفیق اور شہلا ایک ہی جیپ میں جا رہے تھے۔ شہلا کا موبائل بجنے لگا۔ شہلا نے فون ریسیو کر کے بات کی اور فون بند کرنے کے بعد بولی۔ ”رفیق۔ جنگل میں مجھ پر گولی چلانے والا ابھی وحید ملک ہی تھا۔ جو گولی مجھ پہ چلائی گئی تھی وہ اس گولی سے میچ ہو گئی ہے جو کل وحید ملک کے پستول سے حاصل کی گئی تھی۔ پتہ نہیں وحید ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اس نے تو

سارا کیس ہی الجھا کے رکھ دیا ہے۔"

"جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں میڈم۔ وہ بھی درندہ ہی تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اصلی مجرم سے متاثر ہو کر یہ سب کر رہا ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وحید اصلی سیریل کلر سے ملا ہوا ہو۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اس بات کی تحقیقات کرو اور ہاں باقی تین لوگ جن کے پاس بلیک اسکار پیو ہے ان کے بارے میں بہت احتیاط سے چھان بین کرنی ہے تم نے۔"

"جی میڈم۔ ایسا ہی کروں گا۔"

رفیق نے اپنا موبائل نکالا اور ایک نمبر ملایا۔

"ہیلو۔ شوکت بھائی۔ کیسے ہو؟"

رفیق نے اپنے کالج کے دوست شوکت کو بھی وردا کے ماں باپ کی موت کی خبر سنا دی اور وہ بھی وردا کے گھر کی طرف نکل گیا۔

"یہ شوکت کون ہے؟" شہلا نے پوچھ لیا۔

"وردا کا کزن ہے۔ سکھر میں رہتا ہے۔ ویسے ہم اسے شوکی کہتے ہیں۔ مجھے لگا کہ اسے بھی اس کی اطلاع کر دوں۔ اب وردا اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کے اپنے خاندان کے کسی فرد کا پاس ہونا وردا کی ہمت بڑھا سکتا ہے۔"

"یہ تم نے اچھا کیا۔" شہلا نے تعریفی لہجے میں کہا۔

☆☆☆☆☆☆☆

راجو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ وردا کو کیسے سنبھالے۔ وہ پاگلوں کی طرح روئے جا رہی تھی۔ وہ ابھی تک اس بکس کے پاس ہی بیٹھی تھی۔ وہ اپنی محبت کی بے بسی کا تماشہ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔

جس سے ہم محبت کرتے ہیں اس کی تڑپ کو برداشت کرنا ہماری قوت سے باہر ہوتا ہے اور جب یہ بھی پتہ ہو کہ آپ بس اسے تڑپتا ہوا دیکھ ہی سکتے ہیں اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تو محبت کرنے والے دل پر کیا قیامت گزر جاتی ہے اسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے اور اس وقت راجو بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھا۔

راجو نے دونوں ڈبے وہاں سے ہٹوا دیئے اور سب کو باہر بھیج دیا۔ "تم لوگ باہر انتظار کرو۔ کوئی بھی غیر معمولی بات محسوس کرو تو فوراً مجھے بتانا۔"

"جی سر۔"

ان کے جانے کے بعد راجو وردا کے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ "وردا جی۔ آپ کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ تڑپا تڑپا کر ماروں گا اس درندے کو۔ آپ پلیز چپ ہو جائیں۔"

"کیسے چپ ہو جاؤں۔ اپنے ماں باپ کو کھو دیا میں نے۔ دیکھو کتنی دردناک موت ملی ہے انہیں، تم میرا غم نہیں سمجھ سکتے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

"میں نے بچپن میں ہی اپنے ماں باپ کھو دیئے تھے۔ اس وقت میں صرف سات سال کا بچہ تھا جب وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ تب سے یتیمی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ ماں باپ کو کھونے کا غم کیا ہوتا ہے۔ یہ مجھ سے بہتر اور کون سمجھ سکتا ہے اور اسی ناتے میں آپ کے غم کا بھی اندازہ کر سکتا ہوں۔" راجو بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا اپنے ماں باپ کی موت کو یاد کر کے۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور بولی۔

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت تھی۔

"بات ہی کہاں ہوئی ہے آپ سے۔ ویسے بھی میں یہ بات کسی کو بتاتا نہیں ہوں۔ آپ پلیز چپ ہو جائیں۔ مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا ہے۔" راجو کے لہجے میں ہمدردی ہی ہمدردی رچی ہوئی تھی۔

"راجو میں خود کو روک نہیں پا رہی ہوں۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ آنسو خود بہ خود میرے اندر سے اُمڈے چلے آ رہے ہیں۔" وردا نے بے بسی سے کہا۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ میں بھی دو دن مسلسل روتا رہا تھا۔ آپ بھی اپنا دل ہلکا کر لیں۔ میں بس آپ کو اس حالت میں دیکھ نہیں پا رہا ہوں اس لیے چپ ہونے کا کہہ رہا ہوں اور اب آپ میری طرف سے پریشان مت ہونا۔ میں اپنی غلطی سمجھ گیا ہوں۔" راجو نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

رفیق اور شہلا بھی اس دوران وہاں پہنچ گئے۔ رفیق تو وردا کو روتے دیکھ کر کچھ بول ہی نہیں سکا۔ شہلا اس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ "یہ بہت ہی برا ہوا ہے۔ مجھے بہت دکھ ہے وردا۔ ہم کچھ بھی نہیں کر پائے۔ پورا پولیس ڈپارٹمنٹ تمہارا قصور وار ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ اسے اس کی سزا جلد ہی ملے گی۔"

"مجھے اُس کے حوالے کر دیں۔ یہ سب میری ہی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر وہ مجھے مارنا چاہتا ہے تو یہی سہی۔ ویسے بھی اب میں نے جی کر کرنا ہی کیا ہے۔ میرے پاس اب کچھ نہیں بچا۔ میری موت سے اگر یہ سلسلہ رکتا ہے تو مجھے مر جانے دیں۔"

اس سے پہلے کہ شہلا کچھ کہتی۔ راجو نے بیچ میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا بول رہی ہیں آپ۔ میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ اب مرنے کی باری اس درندے کی ہے۔"

شہلا، وردا اور رفیق تینوں نے راجو کی طرف دیکھا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آپ کیوں مریں گی۔ مرے گا اب وہ جس نے موت کو ایک کھیل بنا رکھا ہے۔"

"ریاض حسین۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمیں پولیس میں یہی جذبہ چاہئے۔" رفیق نے کہا۔

"بند کرو یہ بکواس۔" شہلا نے چلا کر کہا۔ رفیق نے کچھ نہیں کہا۔ بس خاموشی سے کھڑا رہا۔ راجو کی بھی کچھ بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"فضول کی بک بک کرنے کی بجائے ان بکسز کا معائنہ کرو اور دیکھو کہ کوریئر کہاں سے آیا تھا اور کس نے بھیجا تھا۔" شہلا غصے سے بولی۔

"یس میڈم۔ ابھی دیکھتا ہوں۔" رفیق نے کہا۔

"راجو وہ بکسز کہاں ہیں۔"

"وردا جی کے سامنے سے ہٹوا دیئے تھے میں نے۔ دوسرے کمرے میں رکھے ہیں۔" راجو نے کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔" رفیق بولا اور راجو کے ساتھ اس کمرے میں آیا جہاں ڈبے رکھے تھے۔

"یا خدا۔" رفیق سے دیکھا نہیں گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

"سر یہ کوریئر فاسٹ لائن سے آیا تھا۔"

"کون دے کر گیا تھا؟"

"ایک آدمی تھا کوریئر کمپنی کا۔" راجو نے کہا۔

"کیا نام تھا اس کا۔" رفیق نے پوچھا

"نام تو میں نے نہیں پوچھا تھا سر۔" راجو خجل ہو کر بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ فاسٹ لائن کے آفس سے سب پتہ چل جائے گا۔"

جب رفیق باہر آیا تو شہلا نے پوچھا۔ "کچھ پتہ چلا؟"

"فاسٹ لائن کوریئر کمپنی سے ہی پتہ چلے گا سب۔"

"تو فوراً جا کر پتہ کرو۔"

وردا کو دلاسہ دے کر شہلا باہر جانے لگی۔ "چلو رفیق۔"

"میڈم ابھی آتا ہوں۔ وردا سے ذرا بات کرلوں۔" رفیق نے کہا۔ مگر راجو وہیں کھڑا رہا۔

"ریاض تم گھر کے چاروں طرف راؤنڈ لے کر آؤ۔ دیکھو سب ٹھیک ہے یا نہیں۔" رفیق نے راجو سے کہا۔

راجو کو عجیب تو لگا لیکن وہ سینئر کا حکم مان کر وہاں سے چلا گیا۔ راجو کے جانے کے بعد رفیق، وردا کے پاس آ گیا۔ وہ صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔

"وردا۔ تمہارا سب سے بڑا گنہگار تو میں ہوں۔ میرے ہوتے ہوئے بھی یہ سب ہو گیا۔ میں خود کو معاف نہیں کر پا رہا ہوں۔ مگر میری بات کا یقین کرو۔ اب وہ درندہ زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے گا۔ بس ایک بار میرے سامنے آ جائے۔"

وردا خاموشی سے فرش کو تکتی رہی۔

"کیا تم زندگی بھر مجھ سے ناراض رہو گی۔ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتی ہو کہ میں تمہارا غم بانٹ سکوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ ہم کتنی پیاری پیاری باتیں کرتے تھے۔ پتہ نہیں کس کی نظر لگ گئی ہماری دوستی کو۔"

"میں کچھ نہیں سننا چاہتی۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔ پلیز چلے جاؤ۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" وہ پھر سے رونے لگی۔

راجو نے یہ سن لیا مگر وہ سمجھ نہیں سکا کہ ماجرا کیا ہے۔ رفیق چپ چاپ وہاں سے چلا گیا۔ اس کی آنکھیں اشکوں سے تر تھیں۔ جیسے کسی اپنے کے غم میں ہوتی ہیں۔ یہ دیکھ کر راجو اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ لیکن وہ رفیق سے کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔

راجو وردا کے پاس آیا اور بولا۔ "کیا بات ہے وردا جی۔ کیا آپ رفیق صاحب کو جانتی ہیں۔"

"ہاں۔ بہت اچھے دوست تھے ہم۔ ایک ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔" وردا نے کہا۔

"یہاں سے جاتے وقت ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور اس بات سے مجھے الجھن ہو رہی ہے۔"

"راجو پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ ابھی میں اس حالت میں نہیں ہوں کہ کچھ بول سکوں۔ پلیز۔"

"سوری وردا جی، میں باہر ہی ہوں۔ کوئی بھی بات ہو تو بس ایک آواز دے دینا۔ بندہ حاضر ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے راجو باہر نکل گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆

وردا کے گھر سے نکل کر رفیق سیدھا فاسٹ لائن کے آفس پہنچا مگر وہاں سے اسے کوئی سراغ نہیں ملا۔ بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ ایک رکشہ والا دو ڈبے لایا تھا اور کوریئر کروا کے چلا گیا۔

"کیا اس رکشہ والے کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟" رفیق نے بکنگ کلرک سے پوچھا۔

"نہیں سر یہاں تو روزانہ کتنے ہی لوگ آتے ہیں۔ کس کس کو یاد رکھوں۔"

"وہ سیریل کلر بلا کا چالاک ہے۔ کسی رکشہ والے کو پکڑ کر دو ڈبے تھما دیئے اور وردا کے گھر کوریئر کروا دیئے۔ یہ تو ماننے کی بات ہے کہ وہ بہت شاطر دماغ ہے۔" رفیق نے خود سے کہا۔

فاسٹ لائن کے آفس سے رفیق سیدھا وحید ملک کے گھر پہنچا۔ اس نے دستک دی تو نسرین نے دروازہ کھولا۔

"میں انسپکٹر رفیق مغل ہوں۔ آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

رفیق نے جملہ ختم ہی کیا تھا کہ نسرین نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ دے مارا۔

"تمہیں کیسے بھول سکتی ہوں میں، تم نے ہی مارا ہے نا میرے شوہر کو۔"

تھپڑ کھانے کے بعد ایک پل کے لیے تو رفیق سن سا ہو کر رہ گیا۔ مگر اس دوران نسرین کچھ نرم پڑ گئی تھی۔

"اب بتائیں۔ میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔" نسرین بولی۔

"ایک اور تھپڑ مار لیں۔ پھر آرام سے بات کریں گے۔ تھپڑ مارنے کے بعد لگتا ہے آپ کو کچھ سکون سا آ گیا ہے۔ آپ ایک اور مار لیں۔ میں برا نہیں مانوں گا۔" رفیق نے کہا۔

"آیئے اندر۔" نسرین نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

رفیق اندر آ کر چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گیا۔ نسرین بھی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

"میری آنکھوں کے سامنے وحید نے میری بہن کی عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ آپ کو بتا نہیں سکتا کہ اس نے کیا کیا غلیظ حرکتیں کیں۔ اس کے انداز سے مجھے یہی لگا کہ وہی درندہ ہے۔ میں نے غصے میں اسے گولی مار دی۔ ویسے بھی اگر میں اسے نہ مارتا تو وہ ہمیں بے عزت کرنے کے بعد مجھے اور میری بہن کو مار دیتا۔ میں خود کو روک نہیں سکا۔ اس کے لیے سوری۔" رفیق نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں نے آپ کو تھپڑ ایک بیوی کی حیثیت سے مارا تھا۔ ایک عورت ہونے کے ناتے کہہ سکتی ہوں کہ آپ نے جو کیا ٹھیک کیا۔ انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے میری چھوٹی بہن کی عزت کو پامال کیا تھا۔ میں بھی انہیں مار دینا چاہتی تھی مگر مجازی خدا سمجھ کر معاف کر دیا تھا میں نے۔" نسرین بھی اپنے دل کا درد باہر لے آئی۔

"آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے۔"

"تین سال۔"

"مجھے شک ہے کہ آپ کا شوہر درندے کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ آپ بھی جانتی ہیں کہ اس درندے نے شہر میں خوف کی کیسی فضا قائم کر رکھی ہے۔ اس کو پکڑنا بہت ضروری ہے ورنہ وہ یونہی خون بہاتا رہے گا۔ کیا آپ کوئی ایسی بات جانتی ہیں جس سے درندے کی پہچان میں کوئی مدد مل سکے۔" رفیق امید بھری نظروں سے نسرین کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"کچھ دنوں سے وہ سارا سارا دن باہر رہنے لگے تھے اور اکثر راتوں کو گھر کا رخ ہی نہیں کرتے تھے۔ کچھ پوچھتی تھی تو مجھے مارتے پیٹتے تھے۔ میں نے یہیں گھر پر ہی ان کا آپریشن کیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔ وہ میرے لیے ہمیشہ پراسرار ہی رہے۔"

"میں نے بے وقت آپ کو تکلیف دی۔ اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیں۔" یہ کہہ کر رفیق جانے کے لیے صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

اچانک اس کی نظر ٹی وی پر رکھی ایک انگلش فلم کی سی ڈی پر پڑی۔ فلم کا ٹائٹل تھا "بورن ٹو کل"۔ رفیق نے سی ڈی اٹھا کر کہا۔ "کیا وحید یہ فلم دیکھتا تھا۔"

"ہاں۔" نسرین نے جواب دیا۔ "وہ اکثر ایسی انگلش فلمیں دیکھتے تھے جن میں بلاوجہ خون بہاتے دکھایا جاتا ہو اور ایک ایک فلم وہ کئی کئی بار دیکھتے تھے۔ ایک طرح سے آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں ایسی فلمیں دیکھنے کی لت لگی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں انہیں ایسی فلمیں دیکھ کر کیا مزا آتا تھا۔ میں تو کبھی نہیں دیکھ پائی۔"

"ویسے یہ فلم دیکھی تو میں نے بھی نہیں ہے۔ لیکن نام بہت سنا ہے۔ اگر آپ کو برا نہ لگے تو کیا میں یہ سی ڈی لے سکتا ہوں۔ جلد لوٹا دوں گا۔" رفیق نے کہا۔

”لے جائیں۔ میں نے کیا کرنا ہے اس فلم کا اور واپس کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔“

”شکریہ۔ اب میں چلتا ہوں۔“

رفیق جیسے ہی نسرین کے گھر سے باہر نکلا۔ مونا نے اسے گھیر لیا۔ ”کیا آپ وحید ملک کی بیوی سے معافی مانگنے آئے تھے۔ کیا اب آپ کو احساس ہو رہا ہے کہ آپ نے ایک بے گناہ آدمی کو مار دیا۔“

”ہماری تحقیقات ابھی چل رہی ہیں۔ اس لیے میں اس کیس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ رفیق نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

”ویسے انہوں نے آپ کے منہ پر تھپڑ کیوں مارا تھا۔ اس کے بارے میں تو بتا سکتے ہیں کچھ۔“ مونا کی بات نے اسے چونکا دیا۔

”تمہیں کیسے پتہ۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اور کیمرے میں ریکارڈ بھی کر لیا ہے۔“

”مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنا۔ جاؤ جو کرنا چاہتی ہو وہ کرتی رہو۔“ یہ کہہ کر رفیق نے اپنی جیپ اسٹارٹ کی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

رفیق سیدھا تھانے پہنچا تو اسے باہر ہی بھولو کھڑا مل گیا۔ وہ کچھ پریشان سا لگ رہا تھا۔

”بھولو ڈی ایس پی صاحب ہیں کیا؟“ رفیق نے پوچھا۔

”ایک گھنٹہ پہلے ہی نکلی ہیں وہ۔ اور ان کے جاتے ہی مصیبت کھڑی ہو گئی۔“

”کیا ہوا بھولو۔ تم کس مصیبت کی بات کر رہے ہو۔“ رفیق جلدی سے بولا۔

”چوہان صاحب ایک عورت کو مجبور کر کے اس کے ساتھ...... اس کا شوہر ایک معمولی جرم میں قید ہے۔ درخواست کرنے آئی تھی وہ اپنے شوہر کے لیے۔ مگر چوہان صاحب موقع کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔“ بھولو نے اپنی پریشانی بتاتے ہوئے کہا۔

”میں ابھی اس چوہان کی خبر لیتا ہوں۔“ رفیق غصے سے بولا۔

”سر۔ بیچ میں میرا نام نہ آئے کہ میں نے چغلی کھائی ہے۔“ بھولو بتا کر ڈرا ہوا بھی تھا۔

”نہیں آئے گا تمہارا نام۔“ رفیق سیدھا چوہان کے کمرے کی طرف بڑھا۔ رفیق نے اندر جھانک کر دیکھا۔ چوہان واقعی اس عورت کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔

”مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔“ رفیق نے کہا۔

”تم!“ چوہان نے چونک کر کہا۔ ”میں کوئی زبردستی نہیں کر رہا ہوں۔ یہ خود راضی ہوئی ہے۔ بدلے میں اس کا شوہر آزاد بھی تو ہو جائے گا اور کیا چاہیے اسے۔“ چوہان نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی یہ محکمہ بدنام ہو رہا ہے۔ چھوڑ دو اسے۔“ رفیق نے غصے سے کہا۔

”تم دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔ میرا مزا خراب مت کرو۔ یہ سب کچھ اس عورت کی مرضی سے ہو رہا ہے تو تمہیں کیا تکلیف ہو رہی ہے۔“ عورت کے معاملے میں تو چوہان ہمیشہ سے ہی کمینہ رہا تھا۔

رفیق نے اس عورت کی آنکھوں میں اور ان آنکھوں میں بھر آئے آنسوؤں کو دیکھا۔ وہ آنکھیں جو شرم و بے عزتی کی وجہ سے اٹھ ہی نہیں پا رہی تھیں۔

”اسے چھوڑ دو۔ ورنہ۔“ رفیق نے حتمی لہجے میں کہا۔

”ورنہ کیا......؟ مجھے بھی وحید کی طرح گولی مار دو گے؟“ چوہان پھر ہنسا۔

”بالکل ماروں گا۔“ یہ کہتے ہوئے رفیق نے پستول نکال کر چوہان پر تان لی۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا۔ نیچے کرو اسے۔“ چوہان

بوکھلا کر بولا۔

”پستول بھی نیچے ہو جائے گا۔ پہلے جو کہا جا رہا ہے وہ کرو۔“ رفیق نے کرخت لہجے میں کہا۔

چوہان اس عورت کے پاس ہٹ گیا اور بولا۔ ”دیکھ لوں گا تجھے۔“

اس عورت نے اپنی حالت ٹھیک کی اور بولی۔ ”شکریہ صاحب۔“

”تمہارے شوہر کا نام کیا ہے اور وہ کس جرم میں قید ہے؟“ رفیق نے عورت سے پوچھا۔

”شاہد علی۔ انہیں چوری کے جھوٹے الزام میں پھنسایا گیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اور کل صبح دس بجے ملنا مجھ سے۔ دیکھتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے۔“ رفیق نے اس عورت کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ عورت کی آنکھوں میں تشکر کے ساتھ ساتھ حیرت کے تاثرات بھی بخوبی دیکھے جا سکتے تھے۔ اسے تو امید ہی نہیں تھی کہ پولیس ڈپارٹمنٹ میں ایسے بھی بخشا جا سکتا ہے کسی کو۔ ورنہ یہاں تو سارے ہی اپنے پیٹی بھائی کے جرم میں برابر کے شریک ہوتے ہیں اور مفت ہاتھ آئی جوانی بھلا کون اپنے ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

شوکت جیسے ہی وردا کے گھر پہنچا، اسے دیکھتے ہی وردا اس سے لپٹ گئی اور پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بھیا، سب ختم ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔“

”بس اب چپ ہو جاؤ۔ ایسے رونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ الٹا اپنی طبیعت بھی خراب کر لو گی۔“ شوکی نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

”مگر میں وہ منظر کیسے بھول سکتی ہوں بھیا۔ امی ابو کو بہت ہی دردناک موت ملی ہے۔

”مجھے رفیق نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم تو فون ہی نہیں کرتی ہو کبھی۔ کم از کم ایسے نازک وقت میں تو اپنوں کو یاد کر لیا کرو۔“ شوکی نے شکایت کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے رشتے داروں میں ابھی کسی کو بھی فون نہیں کیا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ اب کر دیں گے۔ تدفین میں تو سب کو بلانا ہی ہو گا۔“

”چاچا چاچی نہیں آئے۔“ وردا نے پوچھا۔

”وہ بھی آ رہے ہیں۔ وہ پرسوں سے ملتان گئے ہوئے ہیں۔ راستے میں ہی ہیں۔“ شوکی نے بتایا۔ اپنوں کا ساتھ مل جانے پر وردا کو کچھ ڈھارس سی بندھی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

رفیق تھانے سے باہر نکل رہا تھا جب اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے ریسیو کیا۔

”ہیلو جانِ من کہاں ہو؟“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ہیلو ریما، کیسی ہو؟“ رفیق نے آواز پہچانتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ کو میرا گھر یاد ہو تو کچھ کام ادھورے چھوڑ گئے ہیں آپ۔ کب آ رہے ہو۔ میں تو تب سے تڑپ رہی ہوں۔“ ریما کے لہجے میں بے قراری تھی۔

”آ رہا ہوں جی۔“ رفیق نے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

”بڑی بے صبری سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ ریما نے کہہ کر فون کاٹ دیا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں وہ دروازے پر بیل بجا رہا تھا۔ بیل بجتے ہی ریما نے دروازہ کھول دیا۔ ایسے لگا جیسے وہ دروازے کے ساتھ ہی لگ کر کھڑی تھی۔

”بہت جلدی آ گئے تم۔ میں تو سمجھی تمہیں آنے

میں ایک دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"تم نے بلایا ہی اس انداز سے کہ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور کھنچا چلا آیا تمہارے پاس۔"

رفیق اندر داخل ہوا تو ریما نے مسکراتے ہوئے دروازہ بند کرلیا۔

"اچھا یہ بتاؤ جب میں فون کر رہی تھی تو اس وقت تم کہاں جا رہے تھے؟" ریما نے ایک آنکھ میچتے ہوئے کہا۔

"ارے میں تو گھر ہی جا رہا تھا۔ وہ تو راستے میں آپ کی آواز اچک کر مجھے یہاں لے آئی۔ ورنہ سچ مانو تو آج میرا دل بہت بے چین ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"وردا کے ساتھ بہت برا ہوا ہے۔ اس کے ماں باپ کا سر کاٹ کر ڈبے میں سجا کر اس کے گھر بھیجا ہے اس درندے نے۔" رفیق دکھی لہجے میں بولا۔

"اوہ مائی گاڈ...... بس آگے کچھ مت بتانا۔ میں سن نہیں پاؤں گی۔ یہ تو درندگی کی حد ہی کر دی ہے اس نے۔" ریما نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں وردا کے لیے بہت پریشان ہوں۔ مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ اسے تو مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں ہے۔" رفیق بہت اداس ہو رہا تھا۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں دونوں مل کر کوئی مووی دیکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس طرح تمہاری پریشانی کچھ کم ہوجائے۔" ریما نے کہا۔

"اوہ ہاں۔ میرے پاس ایک مووی ہے بورن ٹو کل، وہ دیکھتے ہیں۔"

"ارے وہ تو بہت زبردست فلم ہے۔ میں نے بہت کچھ سنا ہے اس مووی کے بارے میں ڈی وی ڈی کہاں ہے۔" ریما بولی۔

"ڈی وی ڈی جیپ میں ہے۔ ابھی لے کر آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم لے آؤ۔ تب تک میں پوپ کارن تیار کرتی ہوں۔" ریما نے کہا۔

رفیق جیپ سے ڈی وی ڈی لے آیا۔ "تمہارے روم میں ہی دیکھیں گے نا۔"

"ہاں وہیں دیکھیں گے۔ تم چلو میں آ رہی ہوں۔"

تھوڑی ہی دیر میں ریما پاپ کارن اور کچھ اسنیکس لے کر آ گئی۔ ریما نے ڈی وی ڈی پلیئر میں لگا دی اور خود رفیق کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی ٹائٹل نہیں آیا اور مووی شروع ہوگئی۔" ریما نے بور ہوتے ہوئے کہا۔

"ایک منٹ ریما۔ وہ فلم تو کچھ سال پہلے کی تھی۔ مگر اسے دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ تمہیں یہ سڑک کچھ جانی پہچانی نہیں لگ رہی۔" رفیق نے غور سے مووی دیکھتے ہوئے کہا۔

مووی میں بس سڑک اور مارکیٹ دکھائی جا رہی تھی۔ آواز کوئی نہیں تھی۔ اچانک کیمرہ ایک سنسان جگہ پر گھوم گیا اور اب کیمرہ ایک لڑکی کو فالو کر رہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ...... یہ تو رضیہ ہے۔" ریما نے چونک کر کہا۔

"رضیہ...... کون رضیہ؟" رفیق نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ درندے نے اس کا خون کر دیا تھا۔ تم پولیس والے ہو۔ تمہیں تو یہ سب پتہ ہونا چاہئے۔"

"اوہ ہاں۔ یاد آیا۔ آج دماغ اتنا گھوما ہوا ہے کہ پوچھو مت۔ بس اسی چکر میں بھول گیا شاید۔ کہیں درندے نے اس کے قتل کی مووی تو نہیں بنائی۔" رفیق نے ایک خیال کے تحت کہا۔

تب ویڈیو میں دکھایا گیا کہ اچانک کسی نے پیچھے

سے آ کر رضیہ کو دبوچ لیا اور اسے کچھ سونگھا دیا۔ چند ہی لمحوں میں رضیہ بے جان ہو کر اس کی بانہوں میں جھول گئی اور اس آدمی نے گھسیٹتے ہوئے اسے کار کی ڈکی میں ڈال دیا۔

"اف میرے خدا۔ یہ تو رضیہ کے قتل کی ہی ویڈیو ہے۔ رفیق پلیز بند کرواسے۔ میں نہیں دیکھ سکتی۔" ریما نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"ریما مجھے یہ مووی دیکھنی پڑے گی۔ پلیز تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔ جیسے ہی مووی ختم ہوگی میں تمہیں بلا لوں گا۔"

"ہارر موویز مجھے اچھی لگتی ہیں۔ مگر رفیق یہ تو ریئل ہے۔"

"میری بات مانو اور یہیں بیٹھی رہو۔ ہم مل کر اس مووی کا تجزیہ کرتے ہیں۔ کیا پتہ درندے کے خلاف کوئی ثبوت مل جائے۔" رفیق نے اسے سمجھایا۔ اور رفیق کی بات مان کر ریما وہیں بیٹھی رہی۔ لیکن اس کے چہرے پر خوف کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔ فلم دیکھنا اور بات ہوتی ہے اور حقیقت میں قتل ہوتے دیکھنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔

فلم میں اگلا سین ایک گھر کا تھا۔ رضیہ فرش پر پڑی گڑگڑا رہی تھی۔ "پلیز مجھے جانے دو۔"

"ہا...... ہا...... ہا۔ یہاں سے تم کہیں نہیں جا سکتیں۔ یہاں سے اب تمہاری لاش ہی باہر جائے گی۔ گھبراؤ مت۔ میں تمہیں اتنی حسین موت دوں گا کہ تمہیں مرتے ہوئے فخر محسوس ہوگا کہ تم میرے ہاتھوں ماری گئیں۔"

فلم میں درندے کا چہرہ نہیں دکھایا جا رہا تھا۔ کیمرہ صرف رضیہ کو فوکس کر رہا تھا۔

"تمہارے پاس دو چوائس ہیں۔ یہ خنجر دیکھ رہی ہو۔ اسے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے دل میں اتار لو۔ اگر تم نے یہ خنجر اپنے دل میں اتار لیا تو میں تمہیں کچھ نہیں کروں گا اور جانے دوں گا، اور اگر ایسا نہیں کیا تو میں خود کوئی طریقہ استعمال کروں گا اور ہوسکتا ہے میرا طریقہ ذرا دردناک ہو۔ اس لیے خود ہی یہ کام کرلو تو تم تکلیف سے بچ جاؤ گی۔"

رضیہ روتے ہوئے بولی۔ "میں یہ نہیں کرسکتی۔ پلیز مجھے جانے دو۔"

"رفیق! یہ درندہ تو واقعی بہت خطرناک اور مکار ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں رضیہ کو موت ہی ملنی ہے۔" ریما نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ گھر...... جس میں یہ ویڈیو بنائی گئی ہے۔ اسی شہر میں نہیں ہوگا۔ کچھ عجیب سا نہیں ہے یہ کمرہ...... ایسے کمرے کون بنواتا ہے آج کل۔ بہت ہی پرانا گھر لگتا ہے۔" رفیق غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

"ہاں۔ ایسے گھر تو میں نے گاؤں گوٹھوں میں ہی دیکھے تھے۔ اب ایسی کنسٹرکشن کوئی نہیں کرواتا۔"

اچانک مووی رک گئی۔

"یہ کیا ہوا! بس اتنی ہی تھی کیا۔" رفیق نے کہا۔

"اچھا ہے جو اتنی ہی ہے۔ اس سے آگے اس نے رضیہ کا قتل ہی کیا ہوگا۔" ریما جھرجھری لے کر بولی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ شاید اس میں آگے کہیں درندے کی شکل دیکھنے کو مل جائے گی۔ مگر یہ تو رک ہی گئی۔" رفیق مایوس ہو کر بولا۔

انہوں نے کافی ٹرائی کی کہ شاید آگے بھی کچھ ہو لیکن مووی یہیں تک تھی۔

"یہ ڈی وی ڈی تمہیں کہاں سے ملی؟" ریما نے پوچھا۔

"یہ مجھے وحید ملک کے گھر سے ملی ہے۔ وحید ملک کو میں نے گولی ماردی تھی۔ کیونکہ صورت حال

ایسی تھی کہ وہی درندہ لگ رہا تھا۔ مگر اب بات اور بھی الجھ گئی ہے۔ اس ڈی وی ڈی کا مطلب ہے کہ وحید ملک اصلی درندے سے ملا ہوا تھا۔" رفیق نے ریما کو اپنے گھر پر ہونے والے واقعے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسے یہ ڈی وی ڈی کہیں سے ملی ہو اور اس سے متاثر ہوکر ہی وہ بھی درندہ بننے کی کوشش کررہا ہو۔ کیا وہ درندے جیسا نہیں بن سکتا تھا؟"

"درندے جیسا تو وہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے مجھے۔ بس یہ پتہ لگانا ہے کہ کیا وہ اصلی درندے سے ملا ہوا تھا یا نہیں۔ یہ ڈی وی ڈی وحید ملک کے گھر سے ملی ہے اور اس سے کئی سوالات جنم لے رہے ہیں۔ جن کا جواب مجھے ڈھونڈنا ہی ہوگا۔ اب مجھے جانا ہوگا ریما۔ سوری آج تمہارے ساتھ انجوائے نہیں کر سکا۔" رفیق نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ اس وقت تم کن حالات کا شکار ہو۔"

"شکریہ۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ ڈی وی ڈی دیکھ کر میرا دماغ اور بھی خراب ہوگیا ہے۔"

"چلو پھر کبھی سہی۔ اب تم مجھ سے بھاگ کر جاؤ گے بھی کہاں۔" ریما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوکے جانِ من ہم چلتے ہیں۔" رفیق ڈی وی ڈی لے کر باہر آ گیا اور واپس وحید ملک کے گھر کا راستہ لیا۔ "کیا پتہ ایسی اور بھی ڈی وی ڈی ہوں وحید کے پاس۔ یہ دیکھنا ضروری ہے۔"

راستے میں ایک سنسان سڑک پر رفیق نے ایک کار کھڑی ہوئی دیکھی۔ یہ تو کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ مگر اس کی توجہ اس بات نے اپنی جانب مبذول کروائی کہ کار بری طرح سے ہل جل رہی تھی۔ جیسے اس کے اندر دھینگا مشتی چل رہی ہو۔ رفیق نے اپنی جیپ روکی اور کار کا شیشہ بجایا۔

"کیا ہے۔ کیا تکلیف ہے تمہیں۔" ایک لڑکا شیشہ کھول کر بولا۔

"یہاں سنسان جگہ پر کیا کررہے ہو۔ رات بھی ہوچکی ہے۔ کیا تمہیں درندے کا ڈر نہیں ہے۔"

"تمہیں اس سے کیا۔ دفعہ ہوجاؤ۔" لڑکے نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"بڑے باپ کی اولاد لگتا ہے۔ پولیس کی وردی کا بھی کوئی ڈر نہیں ہے اسے۔" رفیق نے دل میں سوچا۔ پھر اس نے کار کے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے ایک لڑکی روتی ہوئی نظر آئی۔ وہ اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ رہی تھی۔

"کون ہے یہ لڑکی اور کیوں رو رہی ہے۔" رفیق نے پوچھا۔

"تیری بہن ہے۔" لڑکے نے بدتمیزی سے کہا۔ "اور کچھ سننا ہے کیا۔ چلو دفعہ ہوجاؤ۔ سنا نہیں تم نے۔"

"اچھا۔ تو یہ میری بہن ہے تو بہنا چلو کار سے باہر آجاؤ۔" رفیق نے کہا۔

رفیق نے یہ کہا ہی تھا کہ لڑکے نے ریوالور نکال لیا اور رفیق پر تان لیا۔

"ایک بار سمجھ میں نہیں آتا کیا تمہیں۔ چلو نکلو یہاں سے۔ ہمارے معاملے میں دخل مت دو۔"

لڑکا یہ بول ہی رہا تھا کہ رفیق نے پھرتی سے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر اسی پر تان لیا۔ "ان کھلونوں سے کھیلنا خطرناک ہے منے۔ چلو چپ چاپ باہر نکلو ورنہ بھیجہ اڑا دوں گا۔ اور یہ سمجھ لو کہ میں تمہاری طرح اناڑی نہیں ہوں۔" رفیق نے جیسے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"رک...... رکو...... نکلتا ہوں۔ تم جانتے نہیں مجھے کہ میں کون ہوں۔ میں اسلم شاہ کا بھائی ہوں۔ تمہارا پورا اپارٹمنٹ خرید سکتا ہوں۔"

"اسلم شاہ...... بہت خوب، تم سے تو جلد ہی ملاقات ہوگی منے۔ چلو اب یہ کار یہیں چھوڑو اور پیدل نکل لو۔ کوئیک۔" رفیق نے ریوالور کے زور پر حکم دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لوں گا تمہیں۔" وہ لڑکا جاتے ہوئے بولا۔

"اوئے سن، تیرے بھائی کے پاس بلیک اسکارپیو ہے کیا؟"

"ہاں ہے، کیوں؟"

"مجھے رینٹ پر لینی تھی۔ کل آؤں گا تمہارے گھر۔ سوچ لینا اچھی کمائی ہوجائے گی تم لوگوں کی۔" رفیق نے اسے تپاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم یہ بات میرے بھیا کے سامنے بولتے تو یہاں تمہاری لاش گری ہوئی ہوتی۔"

"لاش تو تمہاری بھی گر سکتی ہے۔ اگر تم یہاں سے گئے نہیں تو۔" رفیق ریوالور نچاتا ہوا بولا۔

وہ لڑکا کار چھوڑ کر وہاں سے بھاگ گیا۔

"باہر آؤ۔ اب ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" رفیق اس لڑکی سے مخاطب ہوا۔

لڑکی ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"ثمن۔"

"چلو آؤ تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ وہیں چھوڑ دیں مجھے۔"

"اوکے۔ آؤ بیٹھو۔" رفیق نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ثمن چپ چاپ جیپ میں بیٹھ گئی۔

"کیوں آئی تھیں اس کے ساتھ۔ جبکہ تمہیں پتہ ہونا چاہیے کہ ایسے برگر بچے اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔" رفیق نے جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھا دی۔

"یہ کچھ دنوں سے ہی بدلا بدلا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔"

"تو تم یہ کیوں نہیں سمجھ رہی ہو کہ اسے اب دوسری لڑکی مل گئی ہے۔"

"مجھے پتہ ہے۔ اسی لیے میں اس کے ساتھ نہیں آنا چاہتی تھی۔ ریوالور دکھا کر زبردستی ساتھ لایا ہے۔" لڑکی نے کہا۔

"اس کے خلاف شکایت لکھوا دو۔ سالے کو ابھی لاک اپ میں ڈال دیتا ہوں۔"

"جانے دیں۔ بدنامی تو میری ہی ہوگی۔ اس کا کیا بگڑے گا۔"

"کیا تم نے اس کے ساتھ تعلقات میں آخری حد بھی پار کرلی ہے؟" رفیق نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"بس ویسے ہی پوچھ رہا تھا۔"

"جی۔" لڑکی نے سر جھکاتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔

"آپ کو ایسے لوگوں کے ساتھ سنبھل کر رہنا چاہیے۔ یہ امیر باپوں کے بگڑے ہوئے بچے کسی کے جذبات کو سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنی غرض سے غرض ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے ہی ایسے ہوتے ہیں، مگر اکثریت ایسے ہی بگڑے ہوئے برگروں کی ہے۔ ویسے کیا تم بھی اس کے ساتھ انجوائے کرتی تھیں۔"

"آپ میرے ساتھ ایسی باتیں نہ کریں پلیز۔ ابھی ایسی باتوں سے میرا ذہن الجھ رہا ہے۔"

"تمہارا ہوسٹل آ گیا۔ ویسے اس لڑکے کا نام کیا تھا؟" رفیق نے پوچھا۔

"انور شاہ۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔"

"شکریہ آپ کا۔ آج وہ مجھے مار پیٹ رہا تھا۔ ایسا اس نے پہلی بار کیا ہے۔ بہت برا لگ رہا تھا مجھے۔

اس کے اس عمل سے میرے دل پر بہت گہری چوٹ پہنچی ہے۔"

"میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم جاؤ۔ اور ہاں اب اس سے دور رہنے کی کوشش کرنا۔" رفیق نے ثمن کو اتارا اور نسرین کے گھر کی طرف چل دیا۔ "کہیں نسرین سو نہ گئی ہو۔" اس نے سوچا۔

رفیق جب نسرین کے گھر پہنچا تو اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔

"گھر کی ساری لائٹس بند تھیں۔ لگتا ہے نسرین سوگئی ہے۔ انہیں اٹھانا مناسب نہیں ہوگا۔ صبح مل لوں گا اس سے۔ رفیق جیپ موڑ کر وہاں سے جانے ہی والا تھا کہ اسے ایک چیخ سنائی دی۔ چیخ کی آواز نسرین کے گھر سے ہی آئی تھی۔ رفیق نے فوراً پستول نکالا اور گھر کی طرف دوڑا۔ اس نے گھر کی بیل بجائی اور دروازے کو زور زور سے پیٹنے لگا۔ مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ دوبارہ چیخ تو نہیں البتہ کچھ اور قسم کی آوازیں ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھیں۔

رفیق نے تھانے فون کر کے فوری نفری بھیجنے کا کہا اور پھر دروازے کے پاس کھڑے ہو کر آواز لگائی۔

"نسرین صاحبہ دروازہ کھولیں۔ میں ہوں انسپکٹر رفیق مغل۔"

مگر اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں ملا۔

"اب یہ دروازہ توڑنا ہی پڑے گا۔" یہ سوچ کر رفیق نے دروازے کے لاک پر فائر کیا اور دروازہ کھل گیا۔ رفیق پستول لیے گھر کے اندر گھس گیا۔ اندھیرا بہت اندھیرا تھا۔ وہ دیوار سے چپک کر ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ پھرتے ہوئے سوئچ بورڈ تلاش کیا مگر سارے بٹن دبانے کے باوجود لائٹ نہیں جلی۔ "شاید مین سوئچ ہی بند کر دیا ہے کسی نے۔" رفیق نے سوچا۔

ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کوئی آ کر اس سے ٹکرا گیا۔

"کک کون ہے۔۔۔" نسرین کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یہ میں ہوں۔ رفیق مغل۔"

"آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟" نسرین نے پوچھا۔

رفیق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے کہنے کا مطلب کیا ہے۔ اس نے اپنا دماغ استعمال کیا اور جلدی سے نسرین کو دبوچ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے کان میں بولا۔ "شش۔ بالکل چپ رہیں۔ شاید کوئی آپ کے گھر میں گھسا ہے۔"

تب انہیں گھر کی پچھلی طرف کوئی آواز سنائی دی۔

"آپ کے پاس کوئی ٹارچ ہے؟" رفیق نے پوچھا۔

"ہاں، مگر وہ کچن میں رکھی ہے اور آواز وہیں سے آ رہی ہے شاید۔"

"آپ ڈریں مت۔ میں یہاں ہوں۔ کچھ سپاہی بھی منگوا لیے ہیں میں نے۔ اس وقت جو کوئی بھی آپ کے گھر میں گھسا ہے بچ کر نہیں جائے گا۔"

اور پچھلی طرف سے اس بار کچھ اور تیز آواز آئی۔

"آپ یہیں رکیں۔ میں دیکھتا ہوں کون ہے۔"

یہ کہہ کر رفیق آگے بڑھ گیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر کے پچھواڑے آ گیا۔ وہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ ایک سایہ اس کے بالکل پیچھے دیوار سے لگ کر کھڑا ہے۔ اسے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے مڑا اور جب تک وہ کچھ سمجھ پاتا اس کے سر پر ایک زور کا وار ہوا اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر گیا۔ اسی وقت پولیس کے سائرن کی آوازیں بھی گونجنے لگیں اور وہ سایہ رفیق کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

رفیق کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور اسے اپنے سر پر خون کی چپچپاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ گہری چوٹ کے باعث اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ہمت کر کے اٹھا اور پستول ہاتھ میں پکڑ کر لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ پولیس نے گھر کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ ہر طرف تلاشی لی گئی مگر وہ سایہ کہیں نہیں ملا۔

"سالا نکل گیا ہاتھ سے۔ وہ ضرور درندہ ہی تھا۔ اس کمینے کو مارنے کے لیے میرا ہی سر ملا تھا۔ ابھی تک گھوم رہا ہے۔" رفیق نے کہا۔

گھر کا مین سوئچ آن کر دیا گیا اور روشنی میں دوبارہ پوری تلاشی لی گئی۔ مگر کوئی ہوتا تو ملتا۔

"کچن کی کھڑکی سے گھسا تھا وہ۔ اور شاید یہیں سے فرار بھی ہوا ہے۔" رفیق بولا۔

رفیق ڈرائنگ روم میں نسرین کے پاس آیا۔ وہ صوفے پر بیٹھی رو رہی تھی۔

"نسرین صاحبہ۔ معافی چاہتا ہوں کہ آپ ایسی الجھن میں ہیں مگر ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔"

"جی پوچھیں۔"

"جو ڈی وی ڈی میں لے گیا تھا۔ کیا ویسی اور ڈی وی ڈی بھی موجود ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ ایک ہی تھی۔"

"کیا آپ کو یقین ہے۔"

"ہاں میں یقین سے کہہ رہی ہوں۔" نسرین بولی۔

"دیکھیں اگر آپ کچھ بھی جانتی ہیں تو بتا دیں۔ اس درندے کو پکڑنا بہت ضروری ہے۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔"

"اگر آپ کو برا نہ لگے تو آپ کی الماریوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ کیا پتہ کچھ مل ہی جائے۔" رفیق نے نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیشک تلاشی لے لیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" نسرین نے اجازت دے دی۔

"تھینک یو۔" رفیق نے مزید ڈی وی ڈی ملنے کی امید میں اچھی طرح تلاشی لی۔ مگر اسے مایوس ہی ہونا پڑا۔

رفیق نے نسرین کی حفاظت کے لیے دو سپاہیوں کو مامور کر دیا اور خود وہاں سے نکل گیا۔ "تھوڑی مرہم پٹی کروا لیتا ہوں۔ پتہ نہیں کیا مارا ہے کم بخت نے۔"

☆☆☆☆☆☆☆

صبح مراد اپنی ملازمت پر جا رہا تھا کہ بس اسٹاپ پر اسے سحرش نظر آئی اور اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے لپک کر بائیک سحرش کے پاس روک دی۔ اسے دیکھ کر سحرش کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"کیسی ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟"

"میں بھی بالکل ٹھیک ہوں۔ لگتا ہے کالج سے چھٹی لے رکھی ہے تم نے۔ روز دیکھتا تھا مگر تم نظر ہی نہیں آئی تھیں۔" مراد نے ایسے کہا جیسے شکایت کر رہا ہو۔

"ہاں کالج جانے کا دل ہی نہیں کر رہا تھا۔ لیکن کب تک گھر پر بیٹھی رہوں۔ اب جانا تو ہے نا۔" سحرش نے اپنی بس آتے دیکھ لی۔ "میری بس آ گئی ہے۔ اب میں جاؤں۔"

"اگر روکوں گا تو کیا تم رک جاؤ گی۔" مراد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم کہو گے تو رک جاؤں گی۔ مگر تم مجھے کیوں روکنا چاہتے ہو؟"

مجھے تم سے محبت ہے، تم جانتی ہو نا، پھر بھی پوچھتی ہو کیوں۔ آؤ بیٹھو تمہیں کہیں گھما کر لاتا ہوں۔"

''میں بہت دنوں بعد کالج جارہی ہوں مراد۔ آج نہیں۔''

''تو پھر بعد میں کسی دن چلوگی؟'' مراد نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں یہ ہوسکتا ہے۔ اب تم جاؤ' ڈیوٹی پر لیٹ ہوجاؤ گے۔''

''ہماری باتوں میں تمہاری بس تو نکل گئی۔ آؤ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔''

''بیس منٹ میں دوسری بس آجائے گی۔ تم جاؤ لیٹ ہوجاؤ گے۔''

''بیٹھ جاؤ نا پلیز۔'' مراد نے پیار سے کہا۔

سحرش کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ بکھر گئی اور وہ مراد کے پیچھے بیٹھ گئی۔

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگی ہو؟'' مراد نے پوچھا۔

مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا۔''

''مگر مجھے لگتا ہے۔''

''اچھا...... یہ تمہیں کیسے لگا۔''

''بس پتا لگ گئی نا یہ بات۔''

سحرش نے اپنا سر مراد کے کندھے پر ٹکادیا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میرا دماغ الجھنوں میں جکڑا ہوا ہے۔''

''ایک بار میری محبت کے سرور میں ڈوب کر تو دیکھو ساری الجھنیں دور ہوجائیں گی۔'' مراد نے سچے دل سے کہا۔

''تم مجھے گھمانے کے لیے کہاں لے جانا چاہتے تھے۔''

''ہاکس بے لے چلتا...... چلیں؟'' مراد نے پوچھا۔

''کل چلیں گے۔ آج کالج کا چکر لگا لیتی ہوں۔ کسی سہیلی سے نوٹس بھی لے لوں گی۔''

مراد نے بائیک ایک طرف روک کر پوچھا۔ ''تم صرف میری خاطر بول رہی ہو یا سچ میں جانا چاہتی ہو۔''

''مجھے کچھ نہیں پتہ۔ تم بس مجھے لے چلنا۔ خوشی خوشی چلوں گی تمہارے ساتھ۔''

''مجھے تو یہ خواب سا لگ رہا ہے۔'' مراد خوش ہوکر بولا۔

''چلوں گی میں' مراد تمہارے ساتھ کہیں بھی چلنے کو تیار ہوں۔ مگر فی الحال تو کالج کے لیے لیٹ ہورہی ہوں۔ جلدی سے پہنچادو۔''

''اوہ ہاں بالکل۔'' مراد نے کہا اور اسپیڈ دکھاتے ہوئے تھوڑی ہی دیر میں سحرش کو کالج پہنچادیا۔

''پھر کل ملتے ہیں۔'' سحرش نے اپنے ہونٹوں پر پیاری سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

''اپنا خیال رکھنا۔''

''ارے ہاں بابا۔ اب تم جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم مزید لیٹ ہوجاؤ۔''

''اوکے...... بائے...... باقی باتیں کل۔''

☆☆☆☆☆☆

رفیق نے رات کو ہی ایک کلینک سے بینڈ تیج کروالی تھی۔ اور سیدھا تھانے چلا گیا تھا۔ صبح جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو پنکی اس کی مرہم پٹی دیکھ کر بے چین سی ہوگئی۔

''بھیا یہ کیا ہوا۔ یہ سر پر پٹی کیوں بندھی ہوئی ہے؟''

سر پر پتہ نہیں کیا مار دیا تھا ظالم نے' پنکی ایک بات سنو جب تک یہ درندہ پکڑا نہیں جاتا تم نوابشاہ چلی جاؤ چاچا جان کے پاس۔ اماں ابا بھی وہیں ہیں۔ تم تینوں کچھ دنوں کے لیے وہیں رک جاؤ۔'' رفیق نے کچھ سوچ کر کہا۔

''بھیا میرے کالج کا حرج ہوگا۔ میں نوابشاہ کیسے جاسکتی ہوں۔''

''ارے چھٹی لے لو۔ مگر اب تم ایک دن کے لیے بھی یہاں نہیں رکوگی۔ درندے نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اس نے میرے لیے کوئی پلان بنا رکھا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم لوگوں پر کوئی آنچ آئے۔''

''بھیا میں آپ کی یہ بات نہیں مان سکتی۔''

''جو کہا ہے وہ کرو۔ چلو جاؤ سامان پیک کروا اپنا۔ میں تمہیں نوابشاہ والی بس میں بٹھا کر آؤں گا۔ اور رہی بات کالج کی تو وہاں میں خود ہی اطلاع کردوں گا۔ اور اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔''

پنکی پاؤں پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے چٹخنی لگالی۔ رفیق اس کے کمرے کے باہر آکر بولا۔ ''کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ ایک گھنٹے بعد تم مجھے تیار ہوکر ملو۔ اوہ ہاں' تمہیں بس میں لمبے سفر سے الرجی ہے۔ سمجھ گیا۔ چلو ٹھیک ہے کار بک کروادوں گا۔ اب تو خوش ہونا۔''

اگرچہ پنکی بالکل بھی جانا نہیں چاہتی تھی مگر رفیق کے آگے اس کی ایک نہیں چلی اور ایک گھنٹے بعد وہ ایک پرائیویٹ کار میں نوابشاہ کے لیے روانہ ہورہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆

پنکی کو روانہ کرنے کے بعد رفیق' وردا کے گھر آ گیا جہاں اس کے ماں باپ کی تدفین ہورہی تھی۔ تعزیت کرنے والوں میں مراد کو دیکھ کر وردا اس کے پاس آئی اور بولی۔ ''دیکھو تمہارے اس دن کے کھیل نے کیا قہر ڈھا دیا ہے میری زندگی میں۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ نہ تم اس رات مجھے روکتے نہ آج میرے ساتھ یہ سب ہورہا ہوتا۔ تمہاری ہی وجہ سے میں نے اپنے ماں باپ کھو دیئے۔ کیوں آئے ہو یہاں۔ کس نے بلایا ہے تم کو۔''

مراد نے کچھ نہیں کہا۔ بس چپ چاپ نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ وہ خود کو واقعی میں وردا کا مجرم محسوس کررہا تھا۔

''میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔'' وردا پھر رونے لگی۔

وردا کی چچی نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔ ''بس وردا بس۔''

بہت ہی غمناک ماحول تھا۔ وردا کے ماں باپ کی تدفین ہونے کے ساتھ ساتھ کئی ساری خوشیاں' خواب اور امیدیں بھی منوں مٹی تلے دفن ہوگئیں تھیں۔ اپنے کسی قریبی کی موت انسان کو اندر تک سے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی وردا کے ساتھ بھی ہورہا تھا۔ لیکن ایک دن تو اسے سنبھلنا تھا۔ مگر سنبھلتے سنبھلتے بھی اسے شاید کافی وقت کی ضرورت تھی۔

وردا کی یہ حالت نہ راجو سے برداشت ہورہی تھی نہ رفیق سے دیکھی جارہی تھی۔ دونوں بس اسے تڑپتے ہوئے ہی دیکھ سکتے تھے۔ یہ بھی زندگی کی عجیب الجھنوں میں سے ایک الجھن تھی۔

شہلا بھی وہ وہاں موجود تھی لیکن وہ بالکل خاموش تھی۔ رفیق اس کے پاس آیا اور بولا۔ ''میڈم آج مجھے چھٹی چاہیے۔ میرا دل بہت اداس ہورہا ہے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔''

''ٹھیک ہے جاؤ۔ مگر کل اور زیادہ محنت کرنی پڑے گی تمہیں۔'' شہلا نے کہا۔

''تھینک یو میڈم۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہوگیا۔

شوکت اور اس کے ماں باپ نے بڑی مشکلوں سے وردا کو قابو کیا ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دیواروں سے اپنا سر ٹکرا کر اپنی زندگی بھی ختم کرلے۔ جب اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو چچی نے اسے آرام کرنے کے لیے کمرے میں بھیج دیا اور حسب معمول راجو اپنی جیپ میں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کی چوکیداری کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆

رفیق جب گھر پہنچا تو اسے ریما کا فون آیا۔ ''کیسے

ہو رفیق؟“

”میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو۔“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔ مگر تمہیں بہت مس کر رہی ہوں۔“

”میرے گھر آ سکتی ہو۔“

”کیوں نہیں آ سکتی۔ تم بولو تو سہی۔“ ریما نے خوش ہو کر کہا۔

”تو آ جاؤ پھر۔“

”میں اس وقت کالج میں ہوں۔ ابھی بیس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔“

”او کے۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر رفیق نے ریما کو اپنے گھر کا پتہ سمجھا دیا۔

پھر رفیق کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور بیس منٹ سے پہلے ہی ریما اس کے سامنے تھی۔

”ارے یہ تمہارے سر پر کیا ہوا؟ کس نے سجا دیا یہ سہرا؟“ ریما حیرانگی میں بھی شوخی سے بولی۔

رفیق نے نسرین کے گھر پر ہونے والا واقعہ ریما کو سنا دیا۔

”اوہ مائی گاڈ، تو کیا وہ درندہ تھا نسرین کے گھر میں۔“

”ابھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن کو بھی نوابشاہ بھیج دیا ہے۔ میرے والدین تو پہلے سے ہی وہیں ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھ سے دشمنی کرتے ہوئے درندہ انہیں کچھ نقصان پہنچائے۔“

”میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتی۔“

”ارے میں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔ قسم لے لو جو تم پر کسی بابا سے کوئی تعویز کروایا ہو۔“

”یہ تو تم خود سے پوچھو کہ تم نے مجھ پر کیا کر دیا ہے۔“ ریما آنکھیں نچاتی ہوئی بولی۔

”آئی لو یو رفیق۔“ ریما کی آنکھوں میں سچائی تھی۔

”کیا...... کیا کہا تم نے......؟“

”آئی لو یو۔“ ریما نے دوبارہ کہا۔

”ریما، مذاق مت کرو۔ میں کچھ لاتا ہوں کھانے پینے کے لیے۔“

ریما نے بڑی اداسی سے رفیق کی طرف دیکھا۔

”کیا کوئی مذاق میں بھی کسی کو آئی لو یو کہتا ہے۔“

رفیق نے آہستہ سے ریما کو خود سے الگ کیا۔

”ریما بس اب بہت ہو گیا۔ ہم صرف اچھے دوست ہیں۔ دوست ہی رہیں گے۔ تم جانتی ہو کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں۔ پھر بھی۔“

”یہ کیسی محبت ہے رفیق۔ وہ تو تم سے بات تک نہیں کرتی۔ کیا پتہ وہ کسی اور کو چاہتی ہو۔“ ریما نے کہا۔

”ریما پلیز، یہ سب کہنے کی تم کو ضرورت نہیں ہے۔ اگر تم سچ میں مجھ سے محبت کرتی ہو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں، مگر میں بھی جھوٹ نہیں بولوں کہ میرے دل میں تمہارے لیے ایسا کوئی احساس نہیں ہے۔ میں تمہیں دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میں تمہیں بس ایک دوست کے روپ میں دیکھتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“ رفیق نے بھی اپنے دل کی بات کہہ دی۔

یہ سن کر ریما کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ یہ دیکھ کر رفیق نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

”تم پاگل ہو گئی ہو کیا۔ رو کیوں رہی ہو۔ میں نے جو کہا سچ کہا۔ جھوٹ بولنے سے فائدہ بھی کیا۔ اگر زندگی کے کسی موڑ پر مجھے تم سے محبت ہو گئی تو ضرور بتاؤں گا۔ ابھی وہ احساس میرے دل کے کسی گوشے میں پنپا ہی نہیں تو کیسے کہہ دوں۔“

”کوئی بات نہیں رفیق۔ جانے دو۔ کچھ کھانے کو لاؤ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ ویسے سچ ہی کہا تم نے جو احساس دل میں جاگا ہی نہ ہو اس کا اقرار انسان

کیسے کر سکتا ہے۔ جو محبت کرتے ہیں ان کی منزل صرف محبت ہی ہوتی ہے۔“ ریما کے لہجے میں اس کے دل کا درد جھلک رہا تھا۔

”اب کیسے سمجھاؤں تم کو۔“ رفیق بے بسی سے بولا۔

”کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو کچھ کھانے کو لاؤ۔ کہا نا بھوک لگ رہی ہے مجھے۔“ ریما زبردستی اپنے لہجے میں شوخی کا عنصر لاتے ہوئے بولی۔

”یار کھانا تو بنانا پڑے گا۔ ایسا کرتا ہوں باہر سے کچھ لا دیتا ہوں۔“

”نہیں، باہر سے کیوں لاؤ گے۔ میں بنا دیتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ رفیق کے ساتھ کچن میں آ گئی اور اپنی پسند کا کھانا پکا کر رفیق کے آگے رکھ دیا۔

”واہ یار۔ تم تو بہت اچھا کھانا بناتی ہو۔ مزا آ گیا کھا کے۔“

کھانے کے بعد ریما نے کہا۔ ”رفیق مجھے کالج جانا ہوگا۔ ایک اسائنمنٹ جمع کروانا ہے شام تک۔ وہ دے کر گھر چلی جاؤں گی۔“

”ٹھیک ہے میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ ابھی تو دو ہی بجے ہیں۔“

”ابھی چھوڑ دو تو اچھا ہے۔ ابھی اسائنمنٹ لکھنا بھی تو ہے۔ لائبریری میں بیٹھ کر لکھ لوں گی۔“

”او کے جیسی تمہاری مرضی۔“

رفیق نے ریما کو کالج چھوڑا اور دوبارہ گھر آ کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے دماغ میں ریما کی کہی باتیں گھوم رہی تھیں۔ جب وہ اسے کالج چھوڑنے جا رہا تھا تو راستے بھر ریما نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ جیسے اس نے اپنے لب سی لیے ہوں۔ کالج کے دروازے پر اس نے ایک درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ رفیق کو بائے کہا تھا۔

”اوہ ریما، مجھے کچھ وقت دو۔ جھوٹ نہیں بول سکتا تم سے۔ تم اچھی لڑکی ہو۔ خوبصورت ہو۔ کاش مجھے تم

گانے کی کراہت

زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ کی کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ اچانک ایک نوجوان (پاس سے) گانا گاتے ہوئے گزرا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: ”اے نوجوان! تم پر افسوس ہے تم (گانے کی بجائے) قرآن کریم کو ترنم سے کیوں نہیں پڑھ لیتے؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کئی بار دہرائی۔ (دیلمی)

سے محبت ہو جائے۔ یہ محبت بھی بڑی عجیب چیز ہے۔ جہاں ڈھونڈتے ہیں وہاں ملتی نہیں اور جہاں پانے کی تمنا بھی نہیں ہوتی وہاں مل جاتی ہے۔ ریما میں تمہارے بارے میں سوچوں گا۔ بس تھوڑا وقت دو۔“

انہی خیالوں میں کھوئے ہوئے رفیق کو نیند آ گئی۔ بہت گہری نیند۔ آٹھ بجے دروازے پر بجنے والی بیل سے اس کی آنکھ کھلی۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔

رفیق نے دروازہ کھولا تو اسے دہلیز پر ایک لفافہ پڑا ہوا ملا۔ رفیق نے دائیں بائیں دیکھا مگر اسے کوئی دکھائی نہیں دیا۔

رفیق نے لفافہ کھولا اور لفافے کے اندر اس نے جو دیکھا اس نے اس کا دل ہلا کر رکھ دیا۔ لفافے میں ریما کی تصویریں تھیں۔ اس کا بدن لباس کے نام سے محروم تھا۔ اور ایک بیڈ سے بندھی ہوئی تھی۔ لفافے میں ایک چٹ بھی تھی۔ رفیق نے اسے کھول کر پڑھا۔

”ہیلو مسٹر مغلِ اعظم، اب ملاقات کا وقت آ گیا ہے۔ کسی ایسی ہستی کو ڈھونڈ رہا تھا میں جو آپ سے بہت قریب ہو۔ اس لڑکی کو تم کالج چھوڑ کر گئے اور میں اسے اٹھا لایا۔ اب تم ایسا کرو کہ چپ چاپ اسی

کھنڈر میں آجاؤ جہاں تمہیں نشاء اور شرفو کی خوبصورت لاشیں ملی تھیں۔ کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ریما کا وہ براحال کروں گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے' اور گھبرانا مت۔ میرے فن کا حصہ بننے جا رہے ہو تم۔ تم بھی اوروں کی طرح فخر کرو گے کہ تم میرے ہاتھوں مرے۔ جلدی آؤ۔ تمہارے لیے ایک کھیل تیار رکھا ہے میں نے۔ تمہارے گھر سے بس آدھے گھنٹے کا تو راستہ ہے اس کھنڈر کا۔ فوراً پہنچو ورنہ انجام تو تم جانتے ہی ہو۔"

رفیق کے پاس اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ وہ سکون سے بیٹھ کر کچھ سوچ سکتا۔ اسے ہر حال میں وقت پر کھنڈر پہنچنا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے پھنسانے کے لیے وہ درندہ ریما کو چارے کے طور پر استعمال کرے گا۔

رفیق نے فوراً شہلا کو کال کرنے کے لیے فون نکالا۔ مگر اس کا اپنا موبائل بجنے لگا۔

"ہیلو۔" رفیق نے کہا۔

"کسے فون کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے مسٹر مغلِ اعظم؟ تم سے مجھے ایسی امید نہیں تھی۔ یاد رکھو کہ تمہاری ہر حرکت پر نظر ہے میری۔"

رفیق نے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

"ضرور اس کمینے نے کوئی اسپائی کیمرہ لگا رکھا ہے۔" رفیق نے سوچا۔

"کیا سوچ رہے ہو مسٹر مغلِ اعظم' لگتا ہے ریما کی کوئی پروا نہیں ہے تمہیں۔ یہ موبائل ایک طرف پھینک دو اور کوئی چالاکی دکھائے بنا کھنڈر میں آجاؤ' میں بڑی بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کب تک تڑپاتے رہو گے مجھے۔"

"اوکے' میں آرہا ہوں۔ میری جیپ کی چابی اندر پڑی ہے۔ وہ تو اٹھا سکتا ہوں نا۔"

"ہاں اٹھا لو۔ مگر زیادہ جیمز بانڈ بننے کی کوشش مت کرنا۔ تمہاری ہر حرکت پر نظر ہے میری۔"

رفیق گھر کے اندر گیا اور تھوڑی ہی دیر میں باہر آگیا۔ مگر باہر آتے ہی اس نے دیکھا چینل رپورٹر مونا اپنا مائیک لیے کھڑی ہے۔

"انسپکٹر رفیق مغل۔ کیا اب آپ بتا سکتے ہیں کہ وہ درندہ کون ہو سکتا ہے۔" مونا نے مائیک آگے کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھیں اس وقت میں بہت جلدی میں ہوں۔ پلیز۔ ابھی مجھے ڈسٹرب مت کریں۔" یہ کہتا ہوا رفیق اپنی جیپ کی طرف بڑھا۔

"دیکھیں لوگوں کو درندے کے بارے میں جاننے کا پورا حق ہے تاکہ وہ اس کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔" مونا بولی۔

ایک پل کے ہزارویں حصے میں رفیق کے دماغ میں بجلی سی کوندی اور اس نے جھٹ سے مونا کو گلے سے لگا لیا اور سرگوشی کرتا ہوا بولا۔ "میں تمہاری جیب میں ایک چٹ ڈال رہا ہوں۔

فوراً ڈی ایس پی شہلا احمد سے رابطہ کرنا۔ یہاں پڑھنے کی کوشش مت کرنا۔"

مونا کو سمجھ میں نہیں آیا کہ رفیق کہنا کیا چاہتا ہے۔ اس سے پہلے کہ مونا مزید کوئی سوال کرتی رفیق جلدی سے جیپ میں سوار ہوا اور وہاں سے نکل گیا۔

"اس نے ایسا کیوں کیا۔ کچھ گڑبڑ ہے۔ چٹ کہیں اور جا کر پڑھتی ہوں۔" مونا نے اپنے دل میں سوچا۔

باقی آئندہ

□

بدلتے رشتے

طاہرہ جبین تارا

سرمایہ دارانہ نظام کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ تمام مقدس رشتوں کو آنا پائی میں تبدیل کر دیتا ہے. وقت کے ساتھ تمام رشتوں کی نوعیت تبدیل ہو جاتی ہے. آسودہ حال لوگوں کی برائیاں بڑے لوگوں کی ٹیکس چوری فیشن اور کئی دن کے فاقہ زدوں کی ایک روٹی کی طلب چوری اور ڈکیتی کہلاتی ہے.

زیر نظر کہانی ایک ایسی نوشیزہ کی ہے' وقت نے جس کے کاندھے پر چار جانوں کا بوجھ ڈال دیا تھا. یہ لڑکی آج بھی حالات سے نبرد آزما ہے.

اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات تھی جو انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے میں کئی دنوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میرا اور اس کا اسٹاپ ایک ہی تھا وہ اپنی فیکٹری کی وین کا انتظار کرتی تھی اور میں پنجاب یونیورسٹی کی بس کا...... کیونکہ آج کل مجھ پر نئے نئے تجربات کرنے کا بھوت سوار تھا اس لیے میں اپنی گاڑی میں نہیں جاتی تھی' یوں بھی پوائنٹ پر جانے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے' بھانت بھانت کی بولیاں اسٹوڈنٹس کے مسائل اور مختلف ڈیپارٹمنٹ کی اسٹوڈنٹس سے دوستیاں اور پچھلے دو مہینوں سے میں اسے دیکھ رہی تھی وہ اپنی فیکٹری کی ساتھیوں کے ساتھ کھڑی کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتی نظر آتی اردگرد سے بے خبر کہ کسی کی نگاہیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں وہ ساری لڑکیاں درمیانے طبقے سے تعلق رکھتی تھیں معمولی سے کپڑوں میں ملبوس تقریباً ہر لڑکی نے ہی سستے سے میک اپ سے اپنے آپ کو سجایا ہوتا۔ زیادہ تر نے عبایا پہنا ہوتا وہ بھی بالکل سمپل لیکن عبایا میں ملبوس اپنی کتاب میں گم میں نے کئی بار چاہا کہ میں اس سے پوچھوں وہ کن کتابوں کا مطالعہ کرتی ہے۔ میگزین یا ڈائجسٹ مگر میری یونیورسٹی کی بس اس کی وین سے پہلے آجاتی اور میں علم کی جستجو کی مسافر بن جاتی اور غمِ روزگار کے مسافر بس اسٹاپ پر کھڑے رہ جاتے۔

کبھی وہ لڑکی مجھے دسمبر کی اداس شاموں کی مانند نظر آتی کبھی گرمیوں کی دوپہروں کی طرح کملائی کملائی سی دکھائی دیتی۔ نہ وہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے باتیں کرتی' نہ ہنستی مسکراتی دکھائی دیتی بس اپنے آپ میں گم یا پھر کتاب میں گم' شاید وہ کتابوں کی دنیا سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ میں سوچتی' اسے رومانوی کہانیاں پسند ہوں گی اسی لیے وہ ایک لمحے کے لیے کتاب سے نظر اٹھا کر اِدھر اُدھر نہیں دیکھتی۔ بدلتی رُتیں' بدلتے موسم سرمست ہوائیں اسے چھو کر گزر جاتیں مگر اس میں موسم کی تبدیلی کا کوئی اثر دکھائی نہ دیتا۔ عجیب بے حسی سی طاری رہتی۔ وہ لڑکی اب تو میرے اعصاب پر سوار رہنے لگی تھی یونیورسٹی میں بھی اور گھر آکر بھی میں اسے سوچتی رہتی۔

......☆☆☆......

"آج کل کہاں کھوئی کھوئی رہتی ہو خیر تو ہے؟" صوفشاں نے مجھے ٹہوکا مارتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے محترمہ کو عشق ہو گیا ہے' کبھی خلاؤں میں گھورنا' کبھی بیٹھے بیٹھے گم ہو جانا یہ علامات عشق کے ماروں کی ہے کیوں محترمہ فروا صاحبہ! ایم آئی رائٹ؟" روحی نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم سچ کہہ رہی ہو مجھے عشق ہو گیا ہے میں اس سے بات کرنے کو ترس رہی ہوں۔ میں جو یونیورسٹی کی بے باک ڈیبیٹر ہوں' کوئی میرے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ اُس سے بات کرنے سے گھبراتی ہوں کیونکہ اس کے چہرے پر کوئی ایسی بات ہے جو بات کرنے والے کو روک دیتی ہے۔ یہ بند کتاب ہے اس میں جھانکنا منع

ہے میں، میں اس کتاب کو پڑھنا چاہتی ہوں مگر.......“
”کیا......؟ کیا تم سچ مچ کسی کے عشق میں مبتلا ہو چکی ہو کون ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں ملا؟“
”میرے گھر کے قریب بس اسٹاپ پر میں یونیورسٹی کے لیے اور وہ وین کے لیے محوِ انتظار ہوتے ہیں وہ کیسا ہے؟ تو میں نے صرف اس کے چہرے کو دیکھا ہے گندمی رنگت غلافی آنکھیں جن میں اداسی بسی ہوتی ہے اس نے اپنے آپ کو عبایا میں چھپایا ہوتا ہے اور بس......“
”عبایا میں چھپایا ہوا...... کیا وہ دہشت گرد ہے؟ تجھے کسی دہشت گرد سے عشق ہوا ہے فری! تمہاری مت ماری گئی ہے“ صوفی چیخی۔
”نکمیوں وہ لڑکی ہے......“ میں نے بتایا۔
”لڑکی......؟“ روحی نے دل تھام لیا۔
”ہاں مائی ڈیئر فرینڈز! لڑکی...... پورے اسٹاپ پر سب سے منفرد، سب سے جدا۔ میں اُس سے بات کرنا چاہتی ہوں مگر......“ فروا نے بے بسی سے کہا۔
”تم سچ کہتی ہو۔ کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں، جن کے سامنے انسان بے بس ہو جاتا ہے مگر تم عام روٹین کی بات کرو تو آہستہ آہستہ تعلق بن جائے گا۔“ صوفی نے مفت مشورہ دیا۔
”نہیں یار! بہت مشکل ہے، وہ اسٹاپ پر کھڑی کسی نہ کسی کتاب میں گم ہوتی ہے صرف اس کی وین ہی اس کی محویت کو توڑتی ہے، جب وہ تیزی سے وین کی طرف لپکتی ہے۔“
”ایسا کرو کسی دن اپنی گاڑی میں اس کی فیکٹری پہنچ جاؤ وہاں مل لینا۔“ صوفی نے اسے ایک اور مشورہ دیا۔
”تم الٹے مشورے ہی دینا۔“ میں نے صوفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”او کے یار! ابھی تو بھوک لگی ہے کیفے چلو پھر اس عشقِ لاحاصل کے بارے میں کچھ سوچتے ہیں۔“ صوفی نے دونوں کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

......☆☆☆......

میں شام کو عثمان بھائی کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے نکلی تو راستے میں لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ ”عثمان بھائی! گاڑی روکو یہاں کیا ہوا ہے؟ چل کر دیکھتے ہیں۔“
”تم نے شاپنگ کے لیے جانا ہے یا سوشل ورک کے لیے ایکسیڈنٹ ہوا ہے ریسکیو والے لے جائیں گے۔“
”اُف عثمان بھائی! آپ بہت سنگدل اور بے حس ہیں پلیز گاڑی روکیں، دیکھیں تو کیسا خون میں لت پت وجود پڑا ہے اور لوگ تماشائی بنے ہوئے ہیں یہ نہیں کہ اسپتال ہی پہنچادیں۔“
”میری بہنا! لوگ سنگدل نہیں ہیں ڈرتے ہیں۔ یہاں الٹا دستور ہے جو مجرم اور گناہ گار ہیں وہ کھلے عام دندناتے پھر رہے ہیں اور جو بے گناہ ہیں سزا وہ پاتے ہیں۔ جیلیں ان سے بھری جاتی ہیں، کوئی بھی انسان بے حس نہیں ہوتا۔ آئے روز کے حادثات، قتل و غارت، دہشت گردی نے بے حس بننے پر مجبور کر دیا ہے گھر سے باہر نکلتے ہیں تو لاشیں دیکھتے ہیں۔“
”ہاں عثمان بھائی! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم ہی بے حس ہو گئے ہیں مگر یہ زمین ہماری بے حسی پر آنسو بہا رہی ہے، اس پر لاشوں کے انبار گرائے جاتے ہیں۔ درندگی کی فصل اُگائی جاتی ہے۔ اب اس دھرتی پر پھول نہیں برستے بلکہ انگارے دہکتے ہیں۔ پکے ہوئے پھل نہیں گرتے بلکہ اشجار گولیوں کی باڑ گراتے ہیں اور زمین اس ظلمت پر، انسانیت کی تذلیل پر، حوا کی بیٹی کے لٹ جانے پر، مردوں کی بے حرمتی پر، درندگی پر خون کے آنسو روتی ہے اس کے آنسو کسی کو دکھائی نہیں دیتے......“
”او کے او کے، اتنا ثقیل لیکچر۔ میری توبہ جو آئندہ آپ کو گاڑی چلاتے ہوئے روکوں۔“
میں گاڑی سے نکلی تو خون میں لت پت وجود کے ساتھ وہ لڑکی موجود تھی جس سے بات کرنے کو میں ترس رہی تھی، میں تیزی سے آگے بڑھی۔
”...... یہ میری ماں ہیں جسے موٹر سائیکل سوار نے جان بوجھ کر ٹکر ماردی ہے۔“ اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔
”عثمان بھائی! جلدی سے آئیں انھیں اسپتال پہنچانا ہے شالیمار اسپتال۔“
”پلیز کسی سرکاری اسپتال لے چلیں یہاں......“
”آپ فکر نہ کریں وہاں میری کزن ڈاکٹر ہیں وہ دیکھ لیں گی۔“ میں نے کہا۔
”صبا آپی! یہ میری دوست ہے اس کی والدہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے خون بہت بہہ گیا ہے۔“
”او کے فری ڈونٹ وری۔“ ڈاکٹر صبا ان کو ایمر جنسی میں لے گئیں۔ ویٹنگ روم میں، میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔
”عثمان بھائی! آپ چلے جائیں میں صبا آپی کے ساتھ آجاؤں گی۔“ میں نے عثمان بھائی کی بیزار شکل دیکھتے ہوئے کہا۔
”او کے میں چلتا ہوں تم امی اور بابا کو فون کردینا......“ عثمان کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔
”ہاں ہاں میں بتادوں گی، آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے کہا۔
”آپ اپنی والدہ کے ساتھ کہاں جا رہی تھیں......؟“ وہ جو نہ جانے کن خیالوں میں کھوئی تھی ایک دم چونک گئی۔
”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“
”میرا نام فروا ہے سب مجھے فری کہتے ہیں آپ بھی مجھے فری کہہ سکتی ہیں فکر نہ کریں آپ کی والدہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“ میں نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔
”آپ کا نام کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔
”ایمل رضا۔“ اس نے جواب دیا۔
”بہت خوبصورت نام ہے، آپ کی طرح۔ آپ اپنی والدہ کو لے کر کہاں جا رہی تھیں؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا۔
”ڈسپنسری، امی کو کل سے بخار تھا اور اب یہ......“ اس کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر بہہ نکلے......
”آپ روئیں مت آپ کی امی ٹھیک ہو جائیں گی صبا آپی کے ہاتھ میں بہت شفا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔
”امی کے سوا ہمارا کوئی نہیں ہے اگر انھیں کچھ ہو گیا تو......“ اس نے گھٹی گھٹی سی سسکی لی۔
”کچھ نہیں ہوگا آپ کی امی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی آپ کے ابو کہاں ہیں؟“ میں نے بے اختیار اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔
ابو......؟ پلیز ابھی آپ مجھ سے ان کے بارے میں کچھ نہ پوچھیں۔ بس میری امی......“ اتنے میں صبا آپی ایمر جنسی سے باہر آئیں میں تیزی سے صبا کی طرف بڑھی۔
”آپی کیا ہوا، آنٹی ٹھیک ہیں؟“
”فکر نہ کرو وہ ٹھیک ہیں۔ سر پر چوٹ آئی تھی، شکر ہے بچت ہو گئی، بس کمزوری اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔ اسٹیچز لگا دیے ہیں، ابھی ایک دو گھنٹے تک ہوش آجاتا ہے۔ میں انھیں وارڈ میں منتقل کروا دیتی ہوں، ایک دو دن اسپتال میں رہنا پڑے گا۔“ صبا آپی نے مجھے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔
”آپی! آپ وارڈ کے بجائے پرائیویٹ روم میں شفٹ کروادیں بل پے ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔
”او کے، میں انھیں روم میں منتقل کروا دیتی ہوں، ایک گھنٹہ کے بعد مل لینا۔“ صبا آپی نے ایمر جنسی روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔
”آپ پلیز انھیں وارڈ میں شفٹ ہونے دیں۔ پرائیوٹ روم کے اخراجات میں افورڈ نہیں کر سکتی۔ آپ کی مہربانی کی وجہ سے مجھے دھکے نہیں کھانے پڑے ورنہ تو یہاں غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔“

"پوچھتا......؟ ارے آپ سے اخراجات کی کس نے بات کی ہے۔ وہ میری بھی تو آنٹی ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔" میں نے اس کی ہمت بندھائی۔

"چلیں آپ آنٹی کو دیکھ لیں پھر میں آپ کو گھر کو چھوڑ دیتی ہوں۔ آپ کے گھر والے پریشان ہوں گے۔"

......☆☆☆......

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا وہ چار بجے گھر سے نکلی تھی اور اب سات بج رہے تھے۔ اسے یکدم اپنی چھوٹی بہنوں ایمن، ایمان اور بھائی ہادی کا خیال آیا۔ ان کا تو رو رو کر برا حال ہوگا۔ کیسے اطلاع دیتی۔ سستا سا موبائل اس کے پاس تو تھا مگر گھر والوں کے پاس تو نہیں تھا۔ اب کی بار پے ملے گی تو ایک اور موبائل لے لوں گی جو گھر میں رکھ دوں گی۔ وہ خیالوں کی دنیا میں گم تھی۔

"آپ کہاں کھوگئی ہیں......؟ آنٹی کو دیکھ کر آپ کے گھر چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"امی کو اکیلا چھوڑ کر......؟" اس نے فکرمندانہ لہجے میں کہا۔

"ارے اکیلا کیوں، یہاں ڈاکٹر اور نرسیں ہیں نا، آپی سے کہہ کر ایک نرس کی فل ڈیوٹی لگوا دیتی ہوں اور تمھیں گھر چھوڑ دوں گی۔" میں نے آپ جناب کا تکلف ختم کرتے ہوئے کہا۔

"میں کیسے آپ کا شکریہ ادا کروں آپ تو میرے لیے فرشتہ بن کر آئی ہیں۔ میں زندگی بھر اس کا احسان نہیں اتار سکوں گی۔"

"تم شکریہ ادا کرنا چاہتی ہو تو پلیز یہ آپ جناب کا تکلف ختم کرو، مجھ سے اتنا ادب برداشت نہیں ہوتا، مجھے تم کہہ کر بلاؤ۔"

......☆☆☆......

مریض کو ہوش آگیا ہے، وہ ایمل کو بلا رہی ہیں۔" نرس نے آکر کہا۔ ہم دونوں تیزی سے روم کی جانب چل دیں۔

"امی!" ایمل نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑا [illegible] دھاڑیں مار کر رونا شروع کردیا۔

"حوصلے سے کام لو ایمل! تم تو آنٹی کو پریشان [illegible] رہی ہو۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ایمل بیٹا! میں ٹھیک ہوں۔ تم گھر جاؤ تمھار[illegible] بہنیں اور بھائی پریشان ہوں گے۔" وہ ایمل [illegible] مخاطب ہوئیں۔

"ٹھیک ہے امی! میں جاتی ہوں مگر جلد ہی آجاؤ[illegible] گی۔"

"نہیں ایمل! تم گھر میں رہنا۔ میری فکر نہ کرو، میں ٹھیک ہوں۔" انہوں نے ایمل سے کہا۔

"چلیں ایمل! پہلے میرے گھر چلیں۔ بابا اور امی [illegible] بتا کر پھر تمھارے گھر چلیں گے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ کرسی سے اٹھتے ہو[illegible] بولی۔

......☆☆☆......

"صبا کے ساتھ آئی ہو؟ نہیں امی! صبا آپی کی ڈیو[illegible] ختم نہیں ہوئی، یہ ایمل ہے اس کی امی کا ایکسیڈنٹ [illegible] ہے۔" میں نے کہا۔

"بیٹی! کیسی طبیعت ہے؟ اب آپ کی امی کی۔ [illegible] گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو، تم فری [illegible] دوست ہو نا"

"نہیں آنٹی! ایسی کوئی بات نہیں بس امی کی و[illegible] ہے......" اس کی غلافی آنکھیں آنسوؤں سے [illegible] گئیں۔

"نہ رو بیٹی! یہ بھی اللہ کی طرف سے اپنے بند[illegible] آزمائش ہوتی ہے۔ اللہ اپنے پیارے بندوں کو آز[illegible] ہے۔" اس نے ان کی طرف دیکھا اتنے بڑے گھر [illegible] مالکن اور امیر ہونے کے باوجود کوئی غرور اور تکبر نہ تھا۔ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ شاید ایسے ہی [illegible]

لوگوں کی وجہ سے ہی دنیا قائم ہے......"

"ارے کہاں کھو گئی ہو؟ چلو میرے کمرے میں، فریش ہو جاؤ۔ امی! جلدی سے کھانا لگوائیں، بہت بھوک لگی ہے پھر ایمل کے گھر بھی جانا ہے۔"

"تم لوگ فریش ہو کر آؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔"

"چلو ایمل! کھانا کھالو۔" میں نے کہا۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" ایمل نے کہا۔

"ایمل! کھانا کھالو کھانا نہ کھانے سے کیا پریشانی ختم ہو جائے گی۔ اپنی امی کی دیکھ بھال کے لیے تو تمھیں زیادہ کھانا کھانا چاہئے۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"امی! کچھ کھانا ایمل کے گھر والوں کے لیے پیک کروادیں انہوں نے کہاں بنایا ہوگا بیچارے گھر میں پریشان ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بوا جی چار پانچ لوگوں کے لیے کھانا پیک کردیں۔" امی نے گھریلو ملازمہ کو ہدایت دی۔

"جی بیگم صاحبہ! ابھی پیک کردیتی ہوں۔"

"پلیز آپ یہ سب رہنے دیں ایمن نے کچھ نہ کچھ بنالیا ہوگا۔" اس نے تکلفانہ انداز میں کہا۔

"اچھا امی! میں گاڑی لے کر جارہی ہوں۔ رات ایمل کے ساتھ اسپتال میں ہی رہوں گی صبا آپی بھی رات وہاں ہی ہوں گی۔ آپ فکر مت کیجئے گا۔"

"او کے بیٹا! اللہ کے حوالے۔" امی نے کہا۔

......☆☆☆......

وہ راستا بتائے گئی، تقریباً بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہم دھرم پورہ بازار پہنچ گئے۔

"آپ گاڑی یہیں روک لیں، آگے تنگ گلیاں ہیں پیدل چلنا پڑے گا۔" ایمل نے کہا۔

میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی کھڑی کر دی۔ ہم گاڑی سے اترے اور گاڑی لاک کردی۔ چار گلیاں عبور کرنے کے بعد ہم ایک بوسیدہ لکڑی کے دروازے کے سامنے رکے۔ ایمل نے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے......؟" اندر سے سہمی ہوئی آواز آئی۔

"ہادی! میں ایمل ہوں۔" یکدم دروازہ کھلا۔

"آپی! امی اور آپ کہاں رہ گئی تھیں، امی کہاں ہیں؟" وہ حیرانگی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ایمن اور ایمان بھی سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

"کمرے میں چلو بتاتی ہوں۔" اس نے تینوں کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

کمرے میں تین چارپائیاں پڑی تھیں اور چند ایک برتن جو گھرانے کی کسمپرسی کا ثبوت تھے۔ ایک سائیڈ پر دو تین بڑے بڑے ٹرنک رکھے تھے۔ چارپائی کے ساتھ ہی دو پرانی کرسیاں اور ایک لکڑی کی میز رکھی تھی۔

"آپ پلیز بیٹھیں یہ گھر آپ کے شایانِ شان تو نہیں مگر......"

"ارے کیسی باتیں کررہی ہیں گھر انسانوں سے بنتے ہیں اور میرا خیال ہے یہ گھر بہت سے گھروں سے بہت اچھا ہے تم اپنی چھوٹی بہنوں اور بھائی کو دیکھو تو تینوں نے رو رو کر اپنا کیا حال کرلیا ہے۔ انھیں کھانا دو۔"

"آپی امی کہاں ہیں، یہ کون ہیں؟ بتائیں نا۔" ہادی ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

"امی کو چوٹ لگ گئی ہے وہ اسپتال میں ہیں اور یہ فروا ہیں یہی انھیں اسپتال لے کر گئی ہیں۔" یہ سنتے ہی ان تینوں نے رونا شروع کردیا۔

"آپی! ہمیں امی کے پاس لے کر جائیں۔" وہ تینوں بضد تھے۔

"پہلے تم لوگ کھانا کھالو آج تو رات ہوگئی ہے اب کل تم سب کو میں اسپتال لے جاؤں گی اب تم آنٹی کے پاس جا کر کیا کرو گے، وہ تو سو چکی ہوں گی۔" میں نے کہا۔

”ہم رات میں اکیلے رہیں گے آپی! ہمیں امی اور آپ کے بغیر ڈر لگے گا۔“ تینوں بچے سہمے ہوئے تھے۔

”ارے آپ تین ہیں اکیلے تو نہیں اور پھر یہ ہادی اتنا بڑا مرد......“ میں نے ہادی کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں آپ امی کے پاس چلی جائیں میں ہوں نا ان کے پاس‘ میرے ہوتے ہوئے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے‘ دیکھا ابھی میں نے دروازہ پوچھ کر کھولا تھا۔ ہم دروازے کو اندر سے تالا لگا کر سو جائیں گے۔“ ہادی نے بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”گڈ بوائے اوکے ہادی! اب تم دروازے کو اندر سے بند کرکے اچھی طرح تالا لگا دینا اور اب کسی کے لیے بھی نہیں کھولنا یہ میرا موبائل رکھ لو میں تم لوگوں سے رات کو بات کرتی رہوں گی۔“

......☆☆☆......

ہم دونوں دوبارہ اسپتال آ گئیں ایمل کی امی دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں۔ وہ نہ جانے کن خیالوں میں کھو گئی۔ میں اسے چند لمحے دیکھتی رہی۔

”ایمل! تم بہت کھوئی کھوئی سی رہتی ہو۔ میں تمھیں پچھلے دو ماہ سے اسٹاپ پر دیکھ رہی ہوں۔ کتابوں میں گم‘ اپنے آپ اور اردگرد سے بے خبر‘ لگتا ہے تمھیں لو اسٹوریز بہت پسند ہیں۔“

”لو اسٹوریز......؟“ اس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں نا تم فائل میں کوئی نہ کوئی ڈائجسٹ رکھ کر پڑھ رہی ہوتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”لوئر مڈل کلاس لڑکیوں کو تو غم دوراں سے فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ غم جاناں میں کھو جائیں میں تو اوپن یونیورسٹی سے بی اے کر رہی ہوں اس لیے جہاں موقعہ ملتا ہے کتاب کھول لیتی ہوں کیونکہ پیپر ہونے والے ہیں۔“ اس نے میری بات کا جواب دیا۔

”ایمل! کچھ اپنے بارے میں بتاؤ گی...... کبھی کبھی تم مجھے اس بند کتاب کی مانند لگتی ہو جس کے سرورق پر لکھا ہو کہ ”دستک دینا منع ہے“ میں نے کبھی تمھیں اپنی ساتھیوں سے بات چیت کرتے نہیں دیکھا جبکہ سب کچھ نہ کچھ آپس میں بول رہی ہوتی ہیں پھر یہ اداسی اور آدم بیزاری تم پر کیوں ہمہ وقت چھائی رہتی ہے‘ اپنے آپ سے بے خبر۔ تم پچھلے دو ماہ سے میری نظروں کے حصار میں ہو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں مجھے کم بولنے کی عادت ہے پتہ نہیں آپ کیا سننا چاہتی ہیں‘ میں سمجھ نہیں پائی‘ بہرحال آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے‘ میں اس کا بدلہ کبھی نہیں دے سکتی۔“ ایمل نے کہا۔

”مجھے آپ جناب سے مخاطب نہ کرو‘ ایمی وے اگر تم اپنی نجی زندگی کے بارے میں بتانا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں‘ میں مجبور نہیں کروں گی لیکن میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا‘ پلیز اس طرح کی بات کرکے مجھے ہرٹ نہ کرو‘ کوئی بھی روڈ پر زخمی ہوتا تو میں اس کی اسی طرح مدد کرتی‘ یہ کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ ہر انسان کا فرض ہے اور میں نے اپنا فرض پورا کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

......☆☆☆......

”میری بہت سی سہیلیاں تھیں اور جب میں گھر آتی تو امی‘ ابو کہتے‘ لو اب ان بولتی میناؤں کو چپ کرانا مشکل ہے میں ایمن‘ ایمان اور ہادی ایک‘ ایک بات نہ صرف ایک دوسرے سے شیئر کرتے بلکہ امی‘ ابو کو بتا کر ہمیں چین ملتا۔ ہم لوگ کراچی میں رہتے تھے۔ فیکٹری کی طرف سے ہمیں مکان ملا ہوا تھا‘ بہت خوشحال تو نہیں مگر اچھی گزر بسر ہو جاتی تھی۔ میرے ماموں اور ممانی‘ کزن سارہ اور صارم ہم لوگوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ میری ایک ہی خالہ تھیں ان کے بیٹے شجاع سے میری منگنی ہو چکی تھی یہ لوگ دسمبر میں کراچی آتے ہم لوگ خوب انجوائے کرتے۔ ہم لوگ بھی لاہور آتے تو ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ان دنوں بھی ہم لاہور میں ہی تھے جب کراچی میں سانحہ رونما ہوا جس نے ہمارا سب کچھ چھین لیا اور ہم تپتے سورج میں آبلہ پا چلنے کے لیے رہ گئے پتہ نہیں کس کی کوتاہی سے فیکٹری میں آگ لگی جس نے ہنستے بستے گھر اجاڑ دیے۔ فیکٹری کے دروازے کھل نہ سکے اور تمام لوگ کوئلہ بن گئے۔ ابو گھر میں تھے‘ سو تمام گھر جل کر راکھ ہو گیا اور ابو بھی جل کر کوئلہ بن گئے۔ پہچاننا مشکل ہو گیا اور ہم کھلے آسمان کے نیچے بے یار و مددگار ہو گئے......“

”سوری تمھاری بات کاٹ رہی ہوں وہ سنا تھا حکومت نے اور فیکٹری مالکان نے سب لوگوں کو معاوضہ ادا کر دیا تھا۔“ میں نے اس سے پوچھا۔

”وہ صرف اخباری خبریں تھیں ورنہ پورے پورے خاندان جل کر راکھ ہو گئے تھے اور جو ہماری طرح بچ گئے انھیں در در کی ٹھوکریں کھانے کے باوجود کچھ نہ مل سکا۔ ابو تو ایک دفعہ جل کر کوئلہ بن گئے مگر ہم بار بار جل کر راکھ ہو رہے ہیں مگر زندگی ہے کہ امتحان لے رہی ہے‘ ختم ہی نہیں ہوتی سوچتی ہوں کاش ہم لاہور نہ آتے تاکہ ابو کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ ہو جاتا۔“ اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

”اتنی مایوسی کیوں ایمل! اچھا‘ برا وقت گزر ہی جاتا ہے وقت سدا ایک سا نہیں رہتا‘ بس ہر قسم کے حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیے۔“ میں نے اسے دلاسہ دیا۔

”اب کراچی میں ہمارا کون تھا سو لاہور کے لیے رخت سفر باندھا کہ یہاں ہمارے اپنے تھے جو اس کڑے وقت میں ہمارا سہارا بنتے مگر ہماری یہ بھول تھی۔ کڑے وقت میں تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ رشتے دار کہاں ساتھ دیتے۔ جب ہم ماموں کے گھر آئے تو ہمارا اصل امتحان شروع ہوا‘ جب اٹھتے بیٹھتے ماموں اور ممانی نے مہنگائی کا رونا‘ رونا شروع کر دیا......“ اپنی بات کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوئی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اس نے پھر سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”ایک روز ماموں امی کے پاس آئے اور کہنے لگے۔ آپا! سارہ اور صارم کے تعلیمی اخراجات کے ساتھ سب بچوں کے تعلیمی اخراجات پورے کرنا بہت مشکل ہے۔ ایمل نے الیف اے کر لیا ہے بس اب اس کے لیے کہیں جاب ڈھونڈتا ہوں۔ امی نے کہا بھائی! جو تم مناسب سمجھو کرو اور چپ کرکے اپنے کمرے میں لوٹ آئیں۔ میں نے کہا امی! جب ہم نے خود کما کر ہی کھانا ہے تو بہتر ہے کہیں کرائے کا گھر لے لیں مگر امی نے کہا بیٹی! یہ دنیا بھیڑیوں کا گڑھ ہے ہم اس چھت کے نیچے محفوظ تو ہیں ہم چار اکیلی عورتیں اور ایک بچہ کہاں تک دنیا کا مقابلہ کریں گے۔ تم جاب کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھنا۔ تمھارے ابو تمھیں ایم اے کرانا چاہتے تھے۔ میں ان کا خواب پورا کروں گی۔ سلائی کڑھائی شروع کر دیتی ہوں۔ میرے ماموں فیکٹری کے مالک تھے مگر اب بہن اور بھانجے‘ بھانجیوں کے لیے ان کا دل تنگ پڑ گیا تھا۔ پہلے ماموں اور ممانی ہم سے بہت پیار کرتے تھے کراچی آتے تو فرمائشی کھانے بنواتے مگر اب سارہ اور صارم ہم سے سیدھے منہ بات بھی نہ کرتے اس کسمپرسی میں ہمیں کوئی اپنانے کو تیار نہ تھا۔ ممانی نے یہ کہہ کر کک کی چھٹی کرا دی کہ ایمل سارا دن روٹیاں توڑتی رہتی ہے کام کی نہ کاج کی اب یہ کام کرے گی اور مجھے وہ وقت یاد آیا جب ممانی نے امی سے کہا تھا کہ آپا ایمی سے کام نہ کروانا دیکھو تو اس کے ہاتھ کتنے خوبصورت ہیں خراب ہو جائیں گے‘ ویسے بھی تہمینہ کے گھر کام کرنے والوں کی کمی نہیں میری بیٹیا رانی تو راج کرے گی خالہ کے گھر مگر اب نہ خالہ کا اتا پتا نہ شجاع کی خبر جو کہتا تھا ایمی تم سے میرا گھر جگمگا اٹھے گا‘ کب آؤ گی تم‘ مگر اب ہم راہ کی دھول تھے ایک ہی ماہ میں سب کے رویے بدل گئے۔ ابو کی وفات نے باور کرا دیا کہ اب ہم گرد راہ بن چکے ہیں‘ جو آئے ہمیں اڑا کر چل دے۔ بدلتے رشتوں نے چند دنوں میں برسوں کے تجربات سے روشناس کرا دیا۔ کزن سے خادمہ بننے میں ایک ماہ لگا۔ ایک دن میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی کہ صارم آیا اور کہنے لگا۔ ارے تم تو دن بہ دن

نکھرتی جارہی ہو لگتا ہے لاہور کا پانی راس آگیا ہے میں پسینے میں شرابور ایک دم دوپٹے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دوپٹہ اٹھا کر خود پکڑ لیا۔ میں نے کہا دوپٹہ دو مجھے تو بولا ارے جانِ من دے دوں گا۔ میں نے کہا یہ تم کیا کہہ رہے ہو میں سارہ کی طرح تمھاری بہن ہوں تو کہنے لگا صرف سارہ بہن ہے میری تم نہیں تم مجھے بہن کہتے تھے یاد کرو وہ مائی ڈیئر ماضی کی بات ہے اب حال میں تو تم ...... میرا دوپٹہ دو ورنہ میں ماموں کو بتاؤں گی اور شجاع کو ...... ارے میری جان شجاع اور تم سے شادی اس نے مجھے کل ہی تو بتایا ہے کہ اس نے چھوٹی پھپھو کو بتادیا ہے کہ اب تم اس کے معیار کے مطابق نہیں رہیں اسے پڑھی لکھی امیر گھرانوں کی لڑکیوں کی کمی نہیں وہ ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والی سے شادی نہیں کرے گا اور میں نے اونچی آواز میں امی کو پکارا امی اور ممانی دونوں ہی کچن میں آئیں میں بے اختیار امی سے لپٹ گئی امی بنا کہے میری بات سمجھ گئی ممانی نے کہا یہ کیا ہو رہا ہے اور صارم تم نے ایمل کا دوپٹہ کیوں پکڑ رکھا ہے تو صارم نے بڑی معصومیت سے کہا میں تو اسے دوپٹہ دے رہا تھا کیوں کہ دوپٹے کے بغیر مجھے اچھا نہیں لگا تو اس نے مجھ سے الٹی سیدھی باتیں شروع کردیں کہ کیا بات ہے تم تو اب ہمیں لفٹ ہی نہیں کراتے جب میں نے کہا ایمل تمھارا دماغ ٹھیک ہے میں ابھی پھپھو سے بات کرتا ہوں تو آوازیں دینے لگی۔ آپا اسے سمجھاؤ یہ شریفوں کا گھر ہے اور صارم تم اپنے کمرے میں جاؤ میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی مگر میری امی نے بنا کہے سب کچھ جان لیا۔ میں نے کہا تو صرف اتنا امی! ہم اس چار دیواری میں بھی محفوظ نہیں پلیز امی! اس سے پہلے کہ یہ لوگ ہمارے کردار کی دھجیاں بکھیر دیں یہاں سے ہمیں لے چلیں آپ کی بچپن کی دوست فاطمہ خالہ ہیں نا وہ اب بھی ہم سے پیار کرتی ہیں ان سے کہیں کہ ہمیں کوئی چھوٹا سا گھر لے دیں۔ ہاں میں کچھ کرتی ہوں پہلے میں تہمینہ سے تمھاری رخصتی کی بات کرلوں میری بھولی امی! خالہ کے رویے سے کچھ نہیں سمجھا میری شادی کا خواب دیکھنا چھوڑ دیں مجھے میری ہی نظروں میں بے وقعت اور ارزاں نہ کریں۔ بس ایمل ایک دفعہ بات کرلوں اس کے بعد جو تم کہو گی ویسا ہی ہوگا پھر چند دنوں کے بعد امی کے اور میرے زیور بیچ کر ہم نے یہ چھوٹا سا گھر لے لیا اور خالہ فاطمہ کے شوہر نے ایک فیکٹری میں میری جاب کا بندوبست کردیا۔ امی نے بھی سلائی کڑھائی شروع کردی یوں اپنے گھر میں عزت کی روٹی کھا رہے ہیں۔ میں نے اپنے ابو کے خواب پورے کرنے ہیں۔ ہادی کو ڈاکٹر بنانا ہے۔ بہنوں کو پڑھا لکھا کر اچھی جگہ رخصت کرنا ہے۔ اپنوں کی ڈسی ہوئی ہوں اس لیے غیروں پر اعتبار نہیں کرتی۔ یہ ہے میری کہانی ہاں میری خواہش ہے کہ ایک دن میں اس دنیا میں اتنی کامیابی حاصل کرلوں کہ یہ رشتہ دار میری امی کے تلوے چاٹنے پر مجبور ہوں کیوں کہ جتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اتنا ہی حوصلہ بلند ہو رہا ہے۔"

اور میں اسے دیکھ کر رہ گئی کہ اے اللہ اس بلند حوصلہ لڑکی کے خیالات پورے ہوں پتہ نہیں آج کل لوگوں کا خون کیوں سفید ہوگیا ہے۔ رشتے دولت کے ترازو میں کیوں تولے جانے لگے۔ ایک دوسرے کا سہارا بننے کے بجائے کڑے وقت میں ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے ہیں۔ ہماری امت کے زوال کی نشانی ہی یہی ہے جب خود غرضی، نفرت وحقارت جنم لے اور رشتوں کا تقدس ختم ہو جائے۔ امیری غریبی کی تفریق پیدا ہو جائے تو پہلے خاندان اور پھر معاشرہ تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراطِ مستقیم پر چلائے اور خونی رشتوں کی پہچان کرائے۔

کھوپڑی کا چہرہ

انجم فاروق ساحلی

نفرت کی کوکھ سے نفرت ہی جنم لیتی ہے جب یہ کیفیت اور سوچ کسی کو اپنی لپیٹ میں لے لے تو وہ انسان کے درجے سے گر کر شیطان بن جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک شخص کا احوال' لوگوں کی نفرت نے اسے انسانیت کا دشمن بنا دیا تھا۔
تحیر اور تجسس سے لبریز ایک انوکھی پر اسرار کہانی

سیٹھ نثار کی کوٹھی اونچے ستونوں شان وشوکت کے لحاظ سے کسی محل سے کم نہیں تھی۔ ہر کام میں نفاست اور خوبصورتی کو ملحوظ رکھا گیا تھا۔ سیٹھ نثار خود بھی ادھیڑ عمر کا خوبصورت، اسمارٹ اور نفاست پسند شخص تھا۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں حسن اور خوبصورتی کو پسند کرتا تھا۔

صبح صبح سیٹھ نثار اپنی شاندار کوٹھی کے گیٹ سے نکل کر باہر سڑک پر آیا تو اس کا دربان اس کی شکل دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ وہ چیخ مار کر گیٹ کے باہر کیبن میں موجود دوسرے محافظوں کی طرف بڑھا۔

سیٹھ نثار کی کوٹھی کی تعمیر کے وقت جہانزیب بلاک میں رونق اور آبادی خال خال ہی تھی لیکن اب پچھلے دس برسوں میں چہل پہل بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ شور شرابے اور رش سے گھبراتا تھا اور پرسکون ماحول اس کی پسند اور اولین ترجیح تھی لیکن اس کوٹھی کی پہلی اینٹ چونکہ اس کی والدہ نے رکھی تھی اس لیے بچوں کے اصرار کے باوجود بھی وہ اس کوٹھی کو بیچ کر دوسری جگہ نہ جاسکا۔

کھٹ ...... کھٹ ...... کھوپڑی" سڑک کے کنارے ریڑھی پر امرود تولتے شخص کے ہاتھ سے ترازو نکل گئی۔

"ابے تجھے ہوا کیا ہے؟" گاہک نے جھنجلا کر اس کی کیفیت بھانپ کر اس کی نگاہوں کی سمت دیکھا تو اس کی بھی گھگھی بندھ گئی اور ٹانگیں کانپنے لگیں۔

سڑک کے دوسرے کنارے پر میز کرسی لگائے حجام نے سیٹھ نثار کو دیکھا تو اس کے ہوش اڑ گئے اور گرم پانی کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کرسی پر بیٹھے گاہک کے اوپر گرا تو وہ چیخ اٹھا۔

"حرامزادے جلا کر رکھ دیا تو نے ادھر کیا دیکھ رہا ہے؟" گاہک نے اٹھ کر مشتعل ہوتے ہوئے حجام کو دھکا دیا لیکن پھر سیٹھ نثار کو دیکھ کر زور سے اچھلا۔ بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی بچے اور عورتیں چیختے ہوئے بھاگنے لگے۔ دکاندار دکانوں کے شٹر گرانے لگے۔ انہوں نے زندگی میں ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ ایک لڑکا چھت پر پتنگ اڑا رہا تھا اس نے شور سن کر بازار کی طرف دیکھا تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ ایک عجوبہ منظر تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے سیٹھ نثار کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ ویلفیئر کے کاموں کی وجہ سے سیٹھ نثار کو اس علاقے کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ اس کی کوٹھی کا ایک دروازہ غریب غربا اور مساکین کے لیے تھا جہاں جمعہ کے روز بھوکے ننگے لاوارث لوگوں کے لیے دیگیں چڑھائی جاتی تھیں۔ لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔

اس وقت کسی نے اس کی پتنگ کو ہاتھ مار دیا ڈور تو پہلے ہی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی لڑکا بڑی حسرت سے اپنی پتنگ کو دیکھنے لگا جسے اڑانے کا ابھی

مزہ نہیں آیا تھا۔

❀⌘......❀......⌘❀

"کوئی بہروپیا ہے' لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے یہ بہروپ بھرا ہے۔" ایک سڑک پر کرکٹ کھیلتے لڑکوں کے کپتان نے بیٹ کو مضبوطی سے تھامتے ہوئے کہا۔ باقی لڑکے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے زندگی میں ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بازار میں گونجتی چیخیں سن کر وہ رک کر سیٹھ نثار کو دیکھنے لگے جس کے خوبصورت چہرے پر ایک انسانی کھوپڑی گردن پر پیوست تھی جس کی آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ ہونٹوں کا مقام بھی سرخ وسفید تھا۔ باقی رنگت بالکل سیاہ' ایک انسانی چہرے کی جگہ کھوپڑی دیکھنے والوں کی عقلیں چکرا گئیں۔

لوگ گروپ بنا کر سڑک کنارے کھڑے' دور جاتے سیٹھ نثار کو دیکھنے لگے۔ اس وقت ایک صحافی اطلاع ملنے پر وہاں پہنچ گیا اور سیٹھ نثار سے قریب ہوتے ہوئے تصاویر اتارنی شروع کر دیں۔ اس وقت سیٹھ نثار کے بیوی بچے اور ملازم چیختے چلاتے بالکل قریب آ گئے تھے۔ ایک عجیب وغریب اور سنسنی خیز نظارہ ان کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ حیرت وتشویش میں سر سے پیر تک سیٹھ صاحب کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔

اس وقت پولیس کی گاڑی آ گئی اور کانسٹیبلوں نے سیٹھ کو گھیرے میں لے کر بندوقیں تان دیں۔ انسپکٹر عمران نڈر بے باک اور دلیر آدمی تھا۔ وہ سیٹھ نثار کے سامنے رکتا ہوا بولا۔ "تم کون ہو؟"

"میں' میں سیٹھ نثار ہوں۔"

"آپ کے چہرے کو کیا ہوا ہے؟"

"ایک حادثے نے مجھے ایسا بنا دیا ہے۔ میرا چہرہ گھر پڑا ہے۔" سیٹھ نثار نے دردناک لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" انسپکٹر عمران زور سے چلایا۔

❀⌘......❀......⌘❀

سیٹھ داؤد کا ملازم شمسو دیسی انڈوں کی ٹوکری اٹھائے گھر جا رہا تھا۔ سیٹھ داؤد کی کوٹھی سیٹھ نثار سے چند گز دور تھی۔ دونوں دوست تھے اور سونے کے بڑے تاجر تھے۔

اچانک شمسو نے کچھ دور بازار میں افراتفری کے عالم میں مردوں اور عورتوں کو بھاگتے دیکھا۔ شمسو پہلے ٹھٹکا پھر تیز تیز چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بازار کے سرے پر پہنچا تو اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ وہ سیٹھ نثار کے خاندان کے ہر فرد کو پہچانتا تھا۔ گھر کے سب افراد سیٹھ نثار کو گھیرے اشارے میں باتیں کر رہے تھے۔ بعض کی آنکھوں میں آنسو تھے' سیٹھ نثار کے چہرے کی جگہ ایک انسانی کھوپڑی دکھائی دے رہی تھی۔ سیٹھ نثار کی بیوی زور زور سے چیخ رہی تھی۔ شمسو خوف سے تھر تھر کانپتا ہوا چہرے کو دیکھنے لگا۔

شمسو ہانپتا کانپتا بڑے گیٹ پر محافظوں کو حیران و پریشان چھوڑ کر سیٹھ داؤد کے سامنے ناشتے کی میز پر آ گرا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"ارے شمسو کیا بات ہے؟" سیٹھ داؤد نے ہمدردی سے پوچھا۔

شمسو بڑا وفادار اور پرانا ملازم تھا۔ "صاحب! صاحب' اب" اس کے منہ میں جملہ ادھورا رہ گیا۔

"بھئی کچھ بولو بھی کیا معاملہ ہے؟" سیٹھ صاحب کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

"صاحب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے' آپ کے دوست سیٹھ نثار کا چہرہ کھوپڑی کا چہرہ بن گیا ہے۔ سارے گھر کے لوگ اس کے گرد بازار میں

تعلیم

ہر ترقی یافتہ ملک میں اس کی اپنی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ مگر پاکستان میں ذریعہ تعلیم اردو نہیں انگریزی ہے۔ جس کی وجہ سے یہاں کا معیار تعلیم پست ہے کیونکہ طالب علم اپنا قیمتی وقت علوم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ کسی غیر زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ جاپان میں جاپانی' چین میں چینی' انگلستان میں انگریزی' فرانس میں فرانسیسی' جرمن میں جرمنی غرض یہ کہ ہر ملک کے اندر وہی زبان ذریعہ تعلیم ہے جس کو سب بخوبی سمجھتے ہیں سوائے پاکستان کے جہاں سب لوگ سمجھتے تو اردو ہیں لیکن یہاں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے اور اسی وجہ سے ہمارا معیار تعلیم پست ہے۔ تعلیم اسی زبان میں اچھی طرح دی جاتی ہے جس کو طالب علم آسانی سے سمجھ سکیں۔ ہمارے یہاں تعلیم اس زبان میں دی جاتی ہے جس کو سمجھنے میں دس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے پھر کہیں جا کر صحیح علم سیکھنے کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے زوال وپستی اور نالائقی کا واحد سبب یہی ہے کہ ہم نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہیں بنایا اور ہم اپنا قیمتی وقت علم سیکھنے کے بجائے انگریزی سیکھنے میں گنوا دیتے ہیں۔

سفیان اشرف......اوکاڑہ

روتے پیٹتے چل رہے ہیں۔" وہ ٹوٹے ہوئے الفاظ میں بمشکل کہہ سکا۔

"اور اگر جھوٹ ہوا تو۔" سیٹھ داؤد نے حیرت و بے یقینی کے عالم میں کہا۔

"تو......تو صاحب' پچاس جوتے ماریے گا' آپ تصدیق کر لیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" سیٹھ داؤد بڑبڑایا اور موبائل فون اٹھا کر اس کے بٹن پریس کرنے لگا۔ "ہیلو میں سیٹھ داؤد بول رہا ہوں۔" رابطہ ملتے ہی اس نے کہا۔

دوسری طرف سے دعا وسلام کرتے سیٹھ نثار کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"یار شمسو کہہ رہا ہے تمہارا چہرہ بدل گیا ہے۔"

"ہاں یہ اطلاع ٹھیک ہے۔" سیٹھ نثار نے دردناک لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟" سیٹھ داؤد زور سے اچھلا۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ شمسو اپنے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پکڑ کر صاحب کو پکڑانے لگا۔

اس وقت ایک دوسرا ملازم غلام رسول کاغذ میں پیک ایک بکس لے کر قریب آ گیا۔ "صاحب ڈاکیہ صبح صبح یہ دے گیا تھا۔"

سیٹھ داؤد نے حیرت اور تجسس کے عالم میں بکس پکڑ کر میز پر رکھا' پھر تحیر کے عالم میں اسے کھولنے لگے۔ جیسے ہی کاغذ ہٹا کر اس نے لیور دبایا ڈھکنا تیزی سے اوپر اٹھتا چلا گیا۔ اندر نظر پڑتے ہی سیٹھ داؤد خوف سے بری طرح اچھل پڑا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بکس کی اندر رکھی انسانی کھوپڑی کو دیکھنے لگا' جس کی آنکھوں کے گڑھوں میں تیز سرخ چمک تھی۔

ڈرتے ڈرتے شمسو اور غلام رسول آگے بڑھے اور بکس میں جھانکنے لگے۔ کھوپڑی دیکھتے ہی دونوں خوف سے چیخ اٹھے اور جھرجھری لے کر رہ گئے۔ سیٹھ داؤد نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا تھا اور ٹکٹکی باندھے کھوپڑی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے جسم کے مساموں سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹنے لگا۔ اس وقت اچانک وہ خوف سے لرز کر رہ گیا' اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا کھوپڑی کے منہ سے اسے آواز سنائی دے رہی تھی۔

''سیٹھ داؤد پرسوں شام تک 5 کروڑ کا سونا شہر سے باہر قصور بارڈر کے باہر آسیبی عمارت میں لے کر پہنچ جانا' تمہاری جگہ کوئی دوسرا فرد بھی آ سکتا ہے۔ اگر مطالبہ پورا نہ ہوا تو بکس میں موجود کھوپڑی تمہارے چہرے پر فٹ ہوجائے گی اور تمہارا چہرہ گردن سے کٹ کر بکس میں چلا جائے گا۔''

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے' اس طرح تو انسان کی موت واقع ہوجائے گی۔'' سیٹھ داؤد نے جی کڑا کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کا حلق خشک اور رنگ ہلدی کی مانند زرد ہورہا تھا۔ کھوپڑی کے منہ سے تیز آواز سنائی دی۔

''جس طرح اعضا بدلے جاتے ہیں اسی طرح موت سے قبل گردن بھی بدلی جاسکتی ہے۔ البتہ تمہاری روح تمہارے جسم میں ہی رہے گی۔ یہ سب سے بڑا ہمارا شیطانی کرشمہ ہے جو شیطان کی پوجا سے حاصل ہوتا ہے۔'' شمسو اور غلام رسول خوف سے زمین پر بیٹھتے چلے گئے۔

سیٹھ داؤد سکتے کے عالم میں ٹکر ٹکر کھوپڑی کو گھورنے لگا۔ پھر اس نے محویت سے چونک کر بکس کا ڈھکنا بند کردیا۔ بکس کو سامنے الماری میں رکھ کر تالا لگادیا۔ اس کی سانس زور زور سے چل رہی تھی جیسے لمبی چڑھائی چڑھ کر آیا ہو۔ اس نے انسپکٹر عمران کو اس صورت حال سے آگاہ کیا۔ جو فوراً بھاگم بھاگ آ پہنچا۔ سیٹھ داؤد نے اسے واقعہ بتایا۔ انسپکٹر عمران نے متفکرانہ انداز سے سیٹھ نثار کے چہرے کی تبدیلی کی تصدیق کردی' پھر بکس منگوا کر اسے کھول کر کھوپڑی کا ہر طرح جائزہ لیا' لیکن وہ خاموش اور بے جان ہڈیوں کا مرکب تھی۔ آنکھوں کے گڑھوں میں سرخ چمک بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اب انسپکٹر عمران نے سیٹھ داؤد کی حفاظت پر چار کانسٹیبل مقرر کیے اور خود شہر سے باہر آسیبی عمارت کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوگیا۔ سیٹھ داؤد نے شمسو کو ہدایت کی کہ وہ کھوپڑی کو شہر سے باہر دریا برد کر آئے لیکن کوئی ملازم اس کام کے لیے تیار نہ ہوا' آخر سیٹھ خود ہی ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی پچھلی نشست پر بکس رکھ کے شہر سے باہر دریائے راوی کے کنارے چلا آیا' اس نے ایک پتھر کو تسمے کی مدد سے کھوپڑی کے ساتھ باندھا اور اسے دریا برد کردیا اور مطمئن انداز میں گاڑی چلاتا ہوا گھر آ گیا لیکن جیسے ہی وہ اپنے بیڈ روم میں داخل ہوا بڑے زور سے اچھلا۔ وہ بکس جسے وہ دریا برد کر کے آیا تھا' وہ الماری کے کھلے دروازے سے اندر خانے میں رکھا نظر آرہا تھا۔ اس کے چھکے چھوٹ گئے' اور وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

اس نے انسپکٹر عمران اور قریبی دوستوں کو فون کرنے شروع کردیئے۔ سیٹھ نثار کو بھی بلوایا' انسپکٹر عمران ویران آسیبی عمارت کا جائزہ لے کر آ چکا تھا۔ اس نے دوبارہ حیرت انگیز واقعہ سن کر اور سیٹھ کے موبائل میں بکس اور پتھر کی تصویر دیکھ کر کھوپڑی کا پھر جائزہ لیا' لیکن لاحاصل وہ بے جان اور ساکت ہڈیوں کی کھوپڑی ہی تھی۔ اس نے تمام حاضرین سیٹھ کے دوستوں اور عزیزوں کو کھوپڑی چیک کرنے کی دعوت دی' سب نے کھوپڑی کو بے جان سمجھتے ہوئے خطرے کے امکان کو رد کردیا۔

لیکن سیٹھ نثار جو بعد میں آیا تھا' اسے دیکھ کر سبھی اچھل پڑے اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگے جو حادثے کا شکار ہوچکا تھا اور بہت دکھی اور غمگین دکھائی دیتا تھا۔ ''میرے پیارے دوست تم' پانچ کروڑ کا سونا ویران عمارت میں پہنچا دو ورنہ میری طرح اپنے خوبصورت چہرے سے محروم ہوجاؤ گے۔''

''میں بھی ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔'' سیٹھ داؤد نے متفکر لہجے میں کہا مگر اس وقت سیٹھ داؤد کی دادی کا پیر چھڑی ٹیکتا ہوا آ پہنچا جسے سیٹھ کا بڑا بیٹا بلا لایا تھا۔ پیر کو کھوپڑی دکھائی گئی۔ وہ کھوپڑی کو گھورتا ہوا کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارنے لگا۔ پھر سب پر اپنی دھاک بٹھاتا ہوا بولا۔

''اب گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں' یہ خطرناک کھوپڑی میں نے بے کار کردی ہے' بہت خطرناک جادوگر استعمال کررہا تھا۔ سیٹھ داؤد مطمئن سا ہوگیا۔ پیر صاحب کی کرامات مشہور تھیں۔ اور میرا چہرا کیسے ٹھیک ہوگا۔'' سیٹھ نثار نے ملتجیانہ انداز میں پوچھا۔

''تمہیں میرے آستانے پر چالیس دن تک دم کرانے آنا ہوگا۔ پڑے گا' پھر تمہارا چہرہ ٹھیک ہوجائے گا۔'' پیر نے حکیمانہ انداز میں کہا۔

''اس کھوپڑی کا اب کیا کیا جائے حضور؟'' سیٹھ داؤد نے پوچھا۔

''اسے اسی طرح بکس میں رہنے دو یہ چار دن بعد خود بخود ریت بن جائے گی پھر اس بکس کو دوبارہ دریا برد کرآنا۔'' پیر صاحب نے اپنی مہندی سے رنگی لال داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی شان سے کہا۔

❀⌘......❀......⌘❀

سیٹھ داؤد نے بستر پر انگڑائی لی اور پھر حسب معمول اٹھتے ہوئے سامنے دیوار میں موجود کھڑکی کھول کر صبح کے منظر کا جائزہ لیا۔

مارچ کا مہینہ تھا اور موسم بہار میں ہر درخت اور پودا نئے پتوں اور خوش رنگ پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سے موسیقی کا رس ٹپک رہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے درختوں سے سرگوشیاں کرتے پھر رہے تھے۔ پھولوں کی مہک اس کی ناک میں آنے لگی۔ وہ مسرت سے جھوم اٹھا پھر وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا غسل خانے میں آیا لیکن جیسے ہی اس نے دیوار میں نصب آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو اس کی مسرت خوف میں بدل گئی۔ وہ بڑے زور سے

اچھلا۔ اس کا چہرہ ایک سیاہ ڈراؤنی کھوپڑی میں بدلا ہوا نظر آیا۔ وہ آنکھیں مل مل کر خوف کے عالم میں اپنے چہرے کو بار بار دیکھنے لگا۔ پھر جھرجھری لے کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے برف ہونے لگے وہ کانپتا ہوا دوسرے کمرے میں آیا۔ اس نے الماری کھول کر بکس کا جائزہ لیا۔ اندر کھوپڑی غائب تھی اور اس کا چہرہ گردن تک کٹا ہوا رکھا تھا۔ ہوبہو اس کا چہرہ بال برابر بھی فرق نہ تھا۔ کھوپڑی اس کے چہرے کی جگہ لے چکی تھی۔ ''اب کیا ہوگا'' اس کے منہ سے نکلا اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس کا جی چاہ رہا تھا بندوق نکالے اور جا کر پیر کو گولی سے اڑا دے جو فیس لے کر ناکارہ ثابت ہوا تھا۔

❁⌘......❁......⌘❁

ریٹائرڈ کرنل جمشید صبح کے وقت ناشتہ کرنے کے بعد لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا' جب اس کا ملازم دینو ایک بکس لے کر آیا۔

''صاحب ڈاکیہ دے گیا ہے۔'' دینو نے نظریں پھیر کر بکس کی طرف اشارہ کیا۔

کرنل جمشید ایک بہادر اور دلیر انسان تھا' اس نے سیٹھ نثار اور سیٹھ داؤد کے متعلق پیش آنے والے واقعات کے متعلق پڑھا اور سنا تھا لیکن شعبدہ بازی سمجھ کر بھول گیا تھا۔ جادو اور غیبی طاقتوں پر اس کا یقین کم ہی تھا۔ اس نے خوف زدہ ملازم کو جانے کا اشارہ کیا اور اخبار پھینک کر بکس کو گھورنے لگا۔ پھر طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''اس کھوپڑی کا کھوپڑا کھول دوں گا۔'' ساتھ ہی ایک جھٹکے کے ساتھ بکس کا ڈھکن کھول دیا۔ اندر ایک انسانی کھوپڑی رکھی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سیٹھ نثار اور سیٹھ داؤد کی تصویریں گھوم گئیں لیکن وہ بالکل نہ ڈرا نہ گھبرایا بلکہ بچوں جیسی شوخی سے کھوپڑی کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔

اس وقت کھوپڑی کی آنکھوں کے گڑھوں میں سرخ روشنی چمکی اور اس کے ہونٹوں سے آواز سنائی دی۔ کرنل بری طرح چونکا لیکن پھر سنبھل گیا' وہ مضبوط اعصاب کا انسان تھا۔ آواز دوبارہ سنائی دینے لگی۔

''کرنل جمشید تمہارے پاس کافی خاندانی دولت ہے' تم بھی پانچ کروڑ کا سونا شہر سے باہر قصور بارڈر پر آسیبی عمارت میں پہنچا دو ورنہ حکم عدولی کی صورت میں یہ کھوپڑی تمہارے چہرے پر فٹ ہوجائے گی اور تم بدصورت اور قابل نفرت انسان بن جاؤ گے۔ پھر تمہاری محبوبہ تمہارے چہرے پر بوسے ثبت نہیں کر سکے گی سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔''

آواز تین مرتبہ کھوپڑی کے منہ سے سنائی دی۔ کرنل جمشید اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا' پھر اسے اپنے سائنسدان دوست ڈاکٹر شوکت کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر شوکت نے ہر طرح سے کھوپڑی کا جائزہ لیا' اس میں کوئی سائنسی میکنزم نہیں تھا۔ وہ بے کار سی شے تھی اس کے باوجود اس نے مزید چیکنگ کے لیے کھوپڑی کو...... ایک مشین میں بند کردیا۔ کرنل جمشید گھر لوٹ آیا لیکن وہ جیسے ہی اپنے کمرے میں پہنچا بڑے زور سے اچھلا' کھوپڑی سامنے میز پر رکھی دکھائی دے رہی تھی۔ بکس بھی قریب ہی کھلا پڑا تھا۔ خوف کی ایک لہر اس کے بدن میں دوڑ گئی لیکن وہ پھر بھی سنبھل گیا اور ڈرامائی انداز سے ٹکٹکی باندھے کھوپڑی کو دیکھنے لگا' پھر اس نے کھوپڑی کو اٹھا لیا۔

وہ چلتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ملازم اسے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کوٹھی کی پچھلی سمت نئی سڑک بن رہی تھی' بھاری بھرکم بلڈوزر چل رہا تھا۔ کرنل نے بلڈوزر کے آگے سڑک پر کھوپڑی رکھ دی اور اسے کچلنے کا حکم دیا لیکن ڈرائیور جو دونوں سیٹھوں کو دیکھ چکا تھا' وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا' کرنل نے اسے نیچے اتارا اور خود اس کی سیٹ سنبھال کر بلڈوزر کھوپڑی کے نزدیک لے آیا لیکن جیسے ہی اس نے ٹنوں وزنی بلڈوزر کھوپڑی پر چڑھایا' کھوپڑی سے سرخ شعلے بھڑک بھڑک کر نکلے اور حیرت انگیز طور پر بلڈوزر اچھل کر الٹنے لگا۔ کرنل نے بروقت چھلانگ لگا دی اور بچ نکلا۔ سڑک پر کام کرتے مزدور یہ منظر دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

کرنل نے آگے بڑھ کر نفرت سے ایک ٹھوکر کھوپڑی کو ماری لیکن پاؤں کھوپڑی تک نہ جا سکا۔ وہ غیر متوازن سا ہو کر لڑکھڑا گیا' پھر دانت پیستا ہوا کھوپڑی کو گھر کے صحن میں لا کر وزنی ہتھوڑا سر سے بلند کیا اور پوری طاقت سے دے مارا لیکن کھوپڑی کو کچھ اثر نہ ہوا حالانکہ ہتھوڑے کی چوٹ کھوپڑی کو چور چور کردینے کے لیے کافی تھی۔ کرنل کو پسینہ آگیا۔ کچھ سوچ کر وہ اسٹور روم میں جا کر الماری کا تالا کھولنے لگا۔ اس میں سے تیز اور خطرناک تیزاب نکالا اور صحن میں آ کر کھوپڑی کو ایک گڑھے میں ڈال کر اوپر سے بوتل میں بند تیزاب اس پر ڈالنے لگا۔ یہ تیزاب ایسا تھا کہ لوہے کو بھی پگھلا دیتا لیکن کھوپڑی کا کچھ نہ بگڑا البتہ گڑھے کی زمین سیاہ ہو کر پھٹتی ہوئی نیچے چلی گئی۔ کرنل کی سٹی گم ہوگئی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ زور سے گرجا گڑھے میں جھانکا تو دھک سے رہ گیا' کھوپڑی گڑھے سے غائب تھی۔

❁⌘......❁......⌘❁

کرنل جمشید صبح ہی صبح سو کر اٹھا اور اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو حیرت و خوف سے اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ ایک اجنبی کھردری بناوٹ پر تھا۔ جو ہڈیاں تھیں وہ دہشت سے کانپ اٹھا۔ فوری بھاگتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا پھر چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا اور اضطراب کے عالم میں اس نے بکس کو کھول کر دیکھا تو اندر اس کا چہرہ رکھا ہوا تھا' گردن سے جدا وہ غم و غصے سے کانپنے لگا۔

❁⌘......❁......⌘❁

نیلو ملتانی نے رات سوتے وقت پیر صاحب کا دیا ہوا تعویذ پہن لیا تھا' لہٰذا وہ بے فکر تھی کہ اس مردود جادوگر کا وار اس پر کامیاب نہ ہوگا۔ وہ آج سے بیس برس قبل بیس سال کی عمر میں ملتان سے یہاں اداکارہ بننے آئی تھی اسے اس کام میں تو کامیابی نہ ہوئی البتہ اب اس کے شہر میں کئی بیوٹی پارلر اور دو شادی ہال بنانے میں کامیاب ہوگئی تھی لیکن اس نے بہت سے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی بددعائیں بھی لی تھیں' اس نے بیوٹی پارلرز کی آڑ میں کچھ اور دھندہ شروع کر رکھا تھا اس میں پولیس اور اعلیٰ حکام بھی اس کے مددگار تھے۔

وہ بے فکری سے بستر سے اٹھی واش روم میں جیسے ہی اس نے آئینے پر نگاہ ڈالی اس کے منہ سے خوف بھری چیخ نکل گئی۔ یہ کس مردے کا چہرہ ہے' اس نے آنکھیں مل مل کر آئینے میں دیکھا چونک کر اپنے پیچھے بھی نظر ڈالی لیکن وہاں اس کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ غم و غصے سے اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''وہ پیر حرامزادہ جھوٹا اور بے کار نکلا' میں اسے گولی سے اڑا دوں گی۔ اس نے تو کہا تھا کہ جادوگر

کودو کروڑ کا سونا ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں مگر وہ جادوگر بہت ہی طاقتور اور خبیث ہے مگر میں اب کیا کروں گی دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ کاروبار کیسے چلے گا۔ افراتفری ہوجائے گی۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے کے سامنے سے گزری پھر ایک لمحہ رک کر اس نے غصے کے عالم میں میک اپ کی ساری شیشیاں، ڈبے پرفیوم وغیرہ ہاتھ مار کر فرش پر گرادیئے اس نے پہلی بار اپنا چہرہ سیاہ نقاب میں ڈھانپا اور اپنے تندرست اور ہٹے کٹے غنڈے جمی کو ساتھ لے کر پیر صاحب کے آستانے کی طرف روانہ ہوگئی۔ اس کی کار نیلم بلاک سے نکل کر رضا بلاک کے ایک خالی پلاٹ کی طرف روانہ ہوگئی، جہاں کھانے کے مزدوروں کے ہوٹل کے پاس اس سرخ داڑھی والے پیر نے ڈیرہ لگایا تھا اس کے مرید اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے اب نیلو ملتانی کو احساس ہوا کہ اس سے پارلر میں کام کے بہانے آ کے ملنے والی عورت جو پیر صاحب کی کرامت بیان کر رہی تھی، کہ اس نے دم کر کے جادوگر سے اسے بچالیا ہے۔ میں سونا ادا کرنے سے بچ گئی ہوں۔ نیلو ملتانی نے دور سے پلاٹ کا جائزہ لیا اور پھر دھک سے رہ گئی۔ اس کے منہ سے گالیاں نکلنے لگیں۔ ''سالہ حرامزادہ جہاں بھی مل گیا ٹانگیں توڑ کر ڈال دیں سڑک کے کنارے۔'' غنڈہ جمی بھی پیر کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔

پلاٹ میں ہوٹل غریب نواز اور تنور موجود تھا، لیکن پیر صاحب کا شاہی خیمہ اور جانور غائب تھے۔ نیلو ملتانی اور جمی نے تنور پر جاکر لوگوں سے پوچھ گچھ کی ادھر ادھر کے لوگوں سے بھی پیر کے متعلق دریافت کیا مگر سب نے یہی کہا کہ وہ شاید رات کو ہی کوچ کر گئے۔ نیلو اور جمی دانت پیستے ہوئے واپس آ گئے۔

اب نیلو ملتانی کو اس بزرگ کے الفاظ یاد آئے جس نے بازار میں ایک دفعہ اسے نصیحت کی تھی کہ برے کاموں سے باز آجا کسی دن پچھتائے گی اب وہ الفاظ بار بار اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ گھر جاکر اس نے اپنے ضمیر کی خلش سے نڈھال ہوکر برے کاموں سے توبہ کی اور پھر قرآن پاک شیلف سے اتارا جس کے اوپر گرد کی تہہ جم چکی تھی پھر اس نے اس کا کچھ ترجمہ پڑھا اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اتنے میں محلے کی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔

نیلو نے فوراً وضو کیا جو اس نے نماز کی کتاب میں بالترتیب دیکھ لیا تھا پھر جاء نماز بچھا کر نماز پڑھنے لگی جو اسے کسی نے ایک بار تحفے میں دیا تھا۔ نماز نے اس کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کردیا گھر کے اندر پریشانی تشویش اضطراب اور خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ نیلو کا چہرہ کھوپڑی میں تبدیل ہوچکا تھا اور اس کا اپنا چہرہ جادوگر کے بھیجے گئے شیشے کے بکس میں کٹا ہوا رکھا ہوا تھا۔

❋ ⌘ ..... ❋ ..... ⌘ ❋

نیلو ملتانی سر منہ ڈھانپے داتا گنج بخش ہجویریؒ کے دربار پر ہجوم میں راستہ بناتی ہوئی آگے بڑھتے بڑھتے مزار کے قریب پہنچنے لگی اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں آگے بڑھنے والے جوش وخروش کے عالم میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس ہستی پر لوگوں کا بڑا پکا ایمان تھا کہ یہاں صدق دل سے مانگی گئی دعائیں قبول ومنظور ہوتی ہیں۔ چاولوں کی دیگیں خرید کر بانٹنے والے مزار کو غسل دینے والے اگر بتیاں روشن کرنے والے ادھر ادھر متحرک دکھائی دے رہے تھے۔ ہر شخص دل کی مراد مانگنے کے لیے بے چین تھا۔

جسمانی آرائش

حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ''ہمارے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملاقات کی غرض سے تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو دیکھا جو گرد وغبار سے اٹا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس آدمی کے پاس کوئی کنگھا نہیں ہے جس سے یہ اپنے بالوں کو درست کر لیتا؟ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے آدمی کو دیکھا جس نے میلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا اس آدمی کے پاس وہ چیز (صابن وغیرہ) نہیں ہے، جس سے یہ اپنے کپڑے دھولیتا۔ **(مشکوٰۃ)**

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جس شخص کے سر پر بال اور داڑھی کے بال ہوں اس کو چاہیئے کہ ان کو اچھی طرح رکھے۔ **(ابو داؤد۔ مشکوٰۃ)**

مرسلہ: شہروز۔۔۔ کراچی

نیلو ملتانی لوگوں کے بیچ میں سے راستہ بناتے بناتے مزار شریف کے قریب چلی آئی اس نے صدق دل سے اپنے برے کاموں سے کی گئی توبہ کے الفاظ یہاں بھی دہرائے اور پھر چہرے کی درستگی کی صورت میں پچاس دیگوں کے نذرانے کی منت مانی، روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اس کا دل صاف ہوچکا تھا۔

اس لمحے اسے اپنے کانوں میں ایک آواز سنائی دی۔ ''نیلو بیٹا گھبراؤ نہیں اس خطرناک جادوگر کے دن گنے جاچکے ہیں، جلد ہی ایک بہادر مرد آہن اس کی چودھراہٹ اور شیطانی حربے بیکار کر کے رکھ دے گا اور دوسرے انسانوں کی طرح تمہارا چہرہ بھی درست ہوجائے گا۔ لیکن اپنا عہد نہ بھولنا، اپنی توبہ برقرار رکھنا ورنہ کوئی مصیبت بھی آسکتی ہے۔'' نیلو نے ایک بار پھر اپنا عہد دہرایا، پھر وہاں کے منتظم کو ایک دیگ کی رقم دے کر واپس لوٹ آئی۔

❋ ⌘ ..... ❋ ..... ⌘ ❋

انسپکٹر عمران کا کام تو محکمہ سراغ رسانی میں پراسرار جرائم کی بیخ کنی کرنا تھا لیکن چونکہ اس کے علاوہ کوئی اور افسر اس جیسا دلیر ذہین اور بہادر نہیں تھا چنانچہ انسپکٹر عمران کو کھوپڑی چہرہ والے کیس میں دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور پھر محکمے کی طرف سے بھی اسے یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ چونکہ فولادی اعصاب کا مالک ہے اس لیے اس پراسرار جادوگر کو تلاش کر کے گرفتار کرنے کا مشن اسے دے دیا گیا تھا۔

انسپکٹر عمران ایک بندر کی کھال پہن کر ایک درخت پر آسیبی عمارت کی نگرانی کر رہا تھا، ایک سیاہ لباس والا آدمی جس کا چہرہ کافی ڈراؤنا اور خوفناک تھا وہ ایک سیٹھ سے ۱۰ کروڑ کا سونا لے کر عمارت کی پشت کی جانب واقع سڑک پر کھڑی اپنی کار میں بیٹھ کر لاہور کے مضافات میں تعمیر شدہ پرانی عمارت سے نکل کر قصور کے بارڈر پر ایک گہرے وادی نما کھڈ میں واقع پرانی حویلی میں داخل ہوچکا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ وقت کا چالاک اور دلیر ترین انسان اس کی کار کی ڈگی میں چھپا بیٹھا ہے۔

❋ ⌘ ..... ❋ ..... ⌘ ❋

انسپکٹر عمران نے اپنے گلے میں موجود تعویذ کو

چوما اور چھت پر دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا' ایک منڈیر پھلانگ کر وہ ایک اور کھلی چھت پر آ گیا جس کے نیچے کھلے میدان میں ایک خوفناک نظارہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک بدصورت کالے چہرے والا بھیانک جادوگر ایک سنہری شاہی کرسی پر براجمان تھا۔ اس کی کرسی کے بازوؤں کے دونوں جانب دو سرخ سانپ ساکت وصامت بیٹھے تھے۔ اس کے سامنے لوٹا ہوا سونا ڈھیر کی صورت میں پڑا ہوا تھا۔ کرسی کے دونوں جانب بدشکل چڑیلیں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ جادوگر انہیں کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ ایک انسانی ڈھانچہ جادوگر کی کرسی کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیز سرخ چمک تھی۔ جیسے دو سرخ بلب جل رہے ہوں۔

جادوگر کے اوپر ایک بڑے سائز کا الو چکر کاٹ رہا تھا۔ جیسے اس کا وفادار ساتھی ہو جادوگر جذباتی اعلان کرنے لگا کہ عنقریب پورے شہر کا سونا میرے قدموں میں ہوگا' میں سونے کا بادشاہ کہلاؤں گا' اس شہر کے سرمایہ دار اور سیٹھ بڑے سنگدل اور بے رحم ہیں۔ میں نے آج سے کچھ عرصے پہلے کئی جگہ اس شہر میں ملازمتیں کیں لیکن ہر جگہ میری شکل وصورت اور رنگ کو طنز وتضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔ مون ریسٹورنٹ میں ملازم تھا وہاں سیٹھ نثار' سیٹھ داؤد اوران کے دو اور امیر دوست بھی آتے تھے دو کے پاس کتے بھی تھے' ایک کتا کالا اور خطرناک سا تھا اس کا جبڑہ کافی چوڑا اور وزنی تھا۔ صفائی کے دوران میں نے اسے میز کے پاس سے اٹھانے کی کوشش کی وہ بھڑک اٹھا اور مجھے کاٹنے کے لیے لپکا میں نے صفائی والا برش زور سے اس کے منہ پر مارا پھر برش سیدھا کر لیا۔ کتا برش کے وار سے چیخ اٹھا' سیٹھ اس بدمزگی پر بڑے غصے میں آئے اور مجھے مورد الزام ٹھہرایا کہ میں نے کتے کو چھیڑا اور پھر مارا ہے۔ حالانکہ میں بمشکل ایک میز کی آڑ میں ہو کر اس خونی کتے سے بچا تھا۔ چاروں دوستوں نے مجھے گالیاں دیں جوتے سے ٹھوکریں ماریں' مجھے بدشکل' بیوقوف' کالا منحوس کہا۔ میرے منہ پر تھوکا' یہ سب سونے کے تاجر تھے۔ ریسٹورنٹ کے مالک نے میری ایک نہ سنی اور مجھے دھکے دے کر سیٹھوں کے کہنے پر ریسٹورنٹ سے باہر نکال دیا۔ میں نے اس دن عہد کیا تھا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ کسی نہ کسی طرح لوں گا۔ میں ایک جادوگر کا شاگرد بننے میں کامیاب ہوگیا میں نے اس کی خدمت کی اور اس نے مجھے بڑے بڑے جادو کے عمل سکھائے۔"

یہاں تک کہہ کر جادوگر رک گیا اور اپنے سامنے طشتری سے ایک سرخ رنگ کے مشروب کا گلاس اٹھا کر پینے لگا' یہ انسانی خون تھا' اس کے ماتحت دم بخود بیٹھے تھے۔ اس وقت اس کی ناک سکڑنے لگی پھر اس کا چہرہ غضبناک ہوگیا' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

"آدم زاد چھت پر ہے۔" اس نے ڈھانچے کو چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ حکم دیا پھر جادوگر نے منہ سے پھونک ماری' اس کے منہ سے آگ کے لمبے لمبے شعلے نکلے اور رقص کرتے ہوئے چھت پر آ کر انسپکٹر عمران کے چاروں طرف حلقہ بنائے گھومنے لگے۔ گرمی کی شدت سے انسپکٹر عمران کے پسینے چھوٹ گئے۔

انسپکٹر عمران نے تعویذ کو چوم کر اللہ کا نام لیا تو آگ کے شعلے بھڑک بھڑک کر پیچھے ہٹنے لگے اور

ایک ستون کے گرد گھومنے لگے۔ اس وقت انسپکٹر عمران نے جادوگر کے ڈھانچے کو چھت کے سرے پر دیکھا جو اپنے بازو پھیلا کر لمبے لمبے دانت دکھاتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ انسپکٹر عمران تیزی سے چھت کے کنارے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ڈھانچہ قہقہہ مار کر اس کے پیچھے دوڑا۔ انسپکٹر عمران نے چھت سے چھلانگ لگادی۔ ڈھانچہ حیران ہو کر ٹھٹکا لیکن پھر تیزی سے کنارے کی طرف آیا۔ انسپکٹر عمران اسپرنگ والے جوتوں کی مدد سے زمین پر کود کر اچھلتے ہوئے سنبھل کر قریب آئی ہوئی گاڑی میں سوار ہوگیا۔ اسسٹنٹ شہباز کو ہٹا کر اس نے خود اسٹیئرنگ سنبھال لیا لیکن یہ دیکھ کر ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ کیونکہ ڈھانچہ چھلانگ مار کر چھت سے زمین پر آ گیا تھا اور پھر وہ کار کے تعاقب میں بھاگنے لگا۔ درمیانی فاصلہ کم ہونے لگا۔

کھڈ کی چڑھائی چڑھنے کے بعد ہموار سطح پر آ کے انسپکٹر عمران نے کار کی رفتار بہت تیز کردی۔ یہ اسپیشل گاڑی ملک کے نامور سائنس دان ڈاکٹر داؤد نے بنائی تھی اور اس میں کئی حیرت انگیز سسٹم موجود تھے۔ انسپکٹر عمران نے ڈھانچے کو بغور دیکھتے ہوئے ایک بم گاڑی کی عقبی نال سے پھینکا۔ جو سیدھا ڈھانچے کے قدموں میں گرا' ڈھانچے نے بم اٹھالیا اور اسے گیند سمجھنے لگا۔ اسی لمحے بم پھٹا اور ڈھانچے کے ٹکڑے اڑ گئے لیکن پھر اچانک بکھری ہوئی ہڈیاں تیزی سے کھسک کر قریب آئیں اور پھر حیرت انگیز طور پر یکجا ہوگئیں۔ انسپکٹر عمران اور شہباز ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ "انتہائی حیرت انگیز" شہباز کے منہ سے نکلا۔ اب ڈھانچہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ ان کے تعاقب میں آرہا تھا۔ اس کے منہ سے غضبناک غرّاہٹیں بھی خارج ہونے لگی تھیں اور آنکھوں کی روشنی بھی اور تیز ہوگئی۔ انسپکٹر عمران نے ڈھانچے کو گھورتے ہوئے ڈیش بورڈ سے ایک اور بٹن دبادیا جس کے نتیجے میں عقبی نال سے دھوئیں کا ایک بم ڈھانچے کے پاس پھٹا اور گاڑھا سیاہ دھواں کئی فرلانگ تک پھیل گیا۔

انسپکٹر عمران نے گاڑی دوسری سڑک پر ڈال دی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ جلد ہی ڈھانچہ پھر گاڑی کے تعاقب میں نظر آیا۔ دونوں فکرمند ہوگئے۔ انسپکٹر عمران نے ڈیش بورڈ کھولتے ہوئے ایک اور لیور دبایا تو گاڑی کی عقبی نال سے گاڑھا چکنا مادہ نکل نکل کر ڈھانچے کے راستے میں گرنے لگا' ڈھانچہ بار بار پھسلنے لگا اور منہ کے بل گرنے لگا۔ لیکن ڈھانچے کی اس حرکت نے انہیں حیرت زدہ کردیا۔ ڈھانچے نے اپنا منہ سڑک پر گرے ہوئے مادے کے سرے پر رکھ کر سارا گاڑھا اور چکنا محلول پی لیا۔ اب تو دونوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ ڈھانچہ پھر موت بن کے ان کے تعاقب میں تھا۔ اب ڈھانچے کی رفتار بہت تیز ہوگئی تھی۔ اور وہ بالکل قریب آ گیا تھا۔

اچانک سڑک کا موڑ کاٹتے ہی سامنے ایک مٹی کے تیل کا گودام آ گیا۔ گیٹ کسی وجہ سے کھلا ہوا تھا انسپکٹر عمران گاڑی اندر لے گیا پھر نیچے اتر کر دیواروں کے ساتھ لگے چند ڈرم انہوں نے منہ کھول کر ڈھانچے کے راستے میں زور سے لڑھکا دیئے۔ ڈرم گودام سے باہر آ کر سیدھے ڈھانچے کی طرف جانے لگے۔ انسپکٹر عمران نے پستول تانتے ہوئے اس ڈرموں پر فائر کیے جس سے آگ بھڑک اٹھی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اس وقت گودام کا مالک اور چوکیدار بھی وہاں آ گئے لیکن انسپکٹر شہباز نے انہیں پستول دکھا

کر بے بس کر دیا۔ ڈھانچا آگ کے شعلوں سے گھبرا کر واپس بھاگ گیا انسپکٹر عمران نے گودام سے ایک مشعل روشن کی مالک کو اپنا تعارف کروایا کارڈ دکھایا تو وہ مطمئن ہو گیا۔ دونوں کار میں بیٹھ کر آگ کا راستہ کاٹ کر دوسری طرف سے واپس روانہ ہو گئے۔

مشعل والا ہاتھ انسپکٹر عمران نے کھڑکی سے باہر نکال رکھا تھا۔ ڈھانچا آگ سے ڈرتا تھا چنانچہ اسے واپسی کا حکم مل گیا تھا۔

❋ ⌘ .... ❋ .... ⌘ ❋
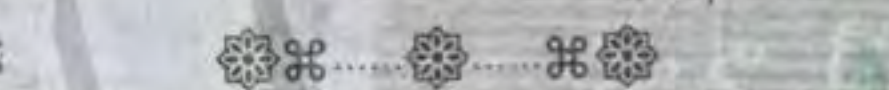
انسپکٹر عمران شہر سے باہر ایک بزرگ کے آستانے میں کئی گھنٹوں سے بھوکا پیاسا کھڑا تھا۔ جب بزرگ کا مراقبہ ختم ہوا تو اس نے انسپکٹر عمران کو شاباش دی اور اس کا مسئلہ سننے کے بعد اسے بتانے لگے کہ یہاں سے بیس میل دور ایک گاؤں میں ایک سیاہ حویلی ویران پڑی ہے جسے لوگ آسیب زدہ سمجھتے ہیں۔ وہاں ایک مرد حق اور شیطانی روحوں کا بڑا زبردست معرکہ ہوا تھا۔ آخر کار طلسمی کتاب جیت گئی۔ تمہیں اس حویلی کے تہہ خانے میں پہنچنا ہے وہاں مرد حق کی قبر کے پاس چبوترے پر طلسمی کتاب رکھی ہوئی ہے، جو تمہارا مسئلہ حل کر دے گی۔ وہ مرد حق میرے استاد تھے۔

انسپکٹر عمران ہدایت کے مطابق چل پڑا۔ اب اسے پتہ چل رہا تھا کہ روحانیت کتنی بڑی طاقت ہے۔ وہ سفر طے کر کے کالی حویلی میں آ گیا۔ جو غیر آباد اور کھنڈر سی تھی۔ دیواروں پر مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ گھٹن اور وحشت ماحول پر طاری تھی۔ جو عجیب سی بے چینی پیدا کر رہی تھی۔ وہ تہہ خانے کے بڑے کمرے میں سیڑھیاں اترتا ہوا داخل ہوا۔ وہ حیران رہ گیا۔ وہاں ایک خوبصورت سفید چبوترے پر ایک روشن کتاب اسٹینڈ پر رکھی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک قبر تھی وہ بھی نور سے چمک رہی تھی۔ نورانی قبر کے اندر ابدی نیند سوتے بزرگ کا جسم روشن دکھائی دے رہا تھا۔ انسپکٹر عمران کی حیرت گم ہو گئی وہ کمرے کو آٹھواں عجوبہ سمجھنے لگا۔

جب وہ چبوترے پر پہنچا تو حیرت اور خوف سے اچھل پڑا کیونکہ کتاب خود بخود کھلنے لگی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے کتاب کے روشن اوراق اڑ اڑ کر جلد سے الگ ہوتے ہوئے اس کا لباس بننے لگے۔ اس کا پورا جسم روشن لفظوں والے صفحات سے ڈھک گیا۔ کتاب کی جلد اس کے سر کی ٹوپی بن گئی۔ اب اسے بزرگ کی آواز سنائی۔

”حویلی کے باہر تمہاری سواری تیار ہے اس میں طلسمی صلاحیت بھی موجود ہے۔“ انسپکٹر عمران حیرت خوف اور دلچسپی سے اپنے لباس کو دیکھتا ہوا واپس سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ حویلی کے باہر اسے ایک شاندار بگھی (رتھ) کھڑی دکھائی دی۔ جس کے سیاہ گھوڑے بڑے پھرتیلے دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے بدن چمک رہے تھے۔ انسپکٹر عمران اچھل کر بگھی پر سوار ہو کر کوچوان کی جگہ پر بیٹھ گیا۔ بگھی جادوگر کے مسکن کی طرف بھاگنے لگی۔ اس کی رفتار بہت تیز تھی۔ سیاہ گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ انسپکٹر عمران اپنے آپ کو الف لیلہ کی کہانی کا کوئی کردار محسوس کر رہا تھا۔

انسپکٹر عمران نے بزرگ کی آواز سن کر سیاہ کوڑا اٹھا لیا۔ جس کے سرے پر نوکیلی سوئیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ پراسرار بگھی پر موت کا فرشتہ دکھائی دے

رہا تھا۔ جادوگر کے مسکن کے سامنے آ کے انسپکٹر عمران نے لگام کھینچ کر بگھی کو روک لیا اور مسلسل کوڑا لہرانے لگا۔ جس کے ساتھ ہی اس کے لباس سے رنگین لہریں نکل کر جادوگر کی عمارت سے ٹکرانے لگیں۔ عمارت پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اندر صحن میں جادوگر کی کرسی کانپنے لگی۔ وہ غضبناک ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے باہر بد روحوں اور بھوتوں کو حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔

خوفناک چہروں والی چڑیلیں بھوت، ڈھانچے کی کمانڈ میں عمارت کی دیواروں سے گزر گزر کر باہر نکلنے لگے۔ گیٹ بدستور بند تھا۔ بھوتوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں تھیں۔ ان کے چہرے ڈراؤنے اور منحوس تھے۔ وہ شدید غصے سے غراتے ہوئے بگھی کی طرف بڑھنے لگے لیکن پراسرار کوڑے کی زد میں آ کر بے بسی سے گھومنے لگے۔

انسپکٹر عمران سچے دل سے بزرگوں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ عمارت کے لرزنے میں شدت آ گئی۔ جیسے خزاں رسیدہ پتے کانپتے ہیں۔ اس وقت بھوت اور چڑیلیں بہت چھوٹے چھوٹے ہو کر اڑتے ہوئے آ کر ہنٹر سے چمٹ گئے۔ انسپکٹر عمران حیرت سے اچھل پڑا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس منظر کو دیکھنے لگا۔ اب حویلی کی دیواریں، محرابیں اور کونوں والے برج گرنے لگے۔

انسپکٹر عمران گیٹ کی طرف بڑھا۔ گیٹ کا فولاد اس کے لباس سے نکلنے والی ایک سرخ شعاع سے پگھل کر پانی کی طرح بہنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے دو تین انچ حجم کے بھوت اور چڑیلیں، ڈھانچے بھی آنکھیں پھاڑے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ وہ کوڑے سے چمٹے ہوئے حقیر چیونٹی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے تھے۔ انسپکٹر عمران بگھی پر سوار پگھلے

ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہو کر میدان میں آ گیا جس کے وسط میں لگے ہوئے فوارے سے خون ابلنے لگا۔

سامنے اندرونی عمارت کا دروازہ کھلا اور ایک روشن گولا تیزی سے لڑھکتا ہوا بگھی کی طرف آنے لگا۔ انسپکٹر عمران بے خوفی سے کوڑا گھما رہا تھا۔ روحانی قوت کی وجہ سے اسے تھکن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ عین اس وقت روشن گولہ قریب آ کے پوری قوت کے ساتھ رتھ کے گھوڑوں سے ٹکرا گیا۔ بگھی گھوڑوں سمیت الٹ گئی۔ انسپکٹر عمران اچھل کر دور جا گرا لیکن اس نے ہاتھ سے ہنٹر نہ چھوڑا۔ اس وقت وہ حیرت سے اچھل پڑا وہ روشن گولا ایک روشن چادر تھی۔ جو گول دائرے کی شکل میں جادوگر سے لپٹی ہوئی تھی۔ جادوگر باہر نکلا اور چڑیلوں، بدروحوں اور ڈھانچوں کا انجام دیکھ کر غصے سے کانپ اٹھا۔ جو بھیانک مگر باریک باریک مدہم آوازوں میں چیخ رہے تھے۔ کوڑے کے سرے کی سوئیاں ان کے جسموں میں اب چبھنے لگی تھیں۔ ”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ جادوگر غصے سے دہاڑا اور روشن شال کو پھندا بنا کر انسپکٹر عمران کی طرف لپکا لیکن اس وقت تاریخی محل نما حویلی کا ایک مینار اس طرف آ گرا اور جادوگر اس کے ملبے تلے دب گیا۔ وہ بری طرح پھنس گیا تھا۔ وہ زخمی ہو کر چیخنے لگا۔ اس کے جسم سے خون نکلنے لگا۔ اس عالم میں بھی اس نے روشن چادر کا پھندا انسپکٹر عمران کی طرف پھینکا، انسپکٹر عمران تیزی سے جھک گیا۔ اور پھندا اس کے سر سے گزر کر لوہے کے ایک جنگلے پر پڑ گیا جو ملبے کے ساتھ ہی گرا تھا۔ انسپکٹر عمران ایک لمحے کے لیے جنگلے کو دیکھ کر لرز گیا۔ مضبوط فولادی جنگلا چڑمڑ ہو کر ٹوٹ رہا تھا، جیسے پلاسٹک کا بنا ہوا ہو۔

اس وقت جادوگر اپنی قوتوں کو استعمال کرتے ہوئے ملبہ الٹ کر باہر نکل آیا۔ انسپکٹر عمران نے حاضر دماغی اور ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوڑا گھما کر جادوگر کے گلے میں ڈال دیا۔ بھوت اور چڑیلیں اس کے گلے کا ہار بن گئیں۔ جادوگر کئی منتر غصے کے عالم میں پڑھتا رہا، ہاتھ گھماتا رہا لیکن کچھ نہ کر سکا، اس کی صلاحیتیں سلب ہو چکی تھیں۔ انسپکٹر عمران نے اسے گھونسوں پر رکھ لیا۔ جادوگر انسپکٹر عمران کے قدموں سے لپٹ گیا۔ انسپکٹر عمران نے پولیس فورس اور پریس کو بلا کر صورت حال واضح کی اور بتایا کہ جادوگر کیوں دولتمندوں کا دشمن بن گیا تھا۔ سونے کے تاجروں نے اسے کالا بدشکل سمجھ کر دھتکارا اور مارا تھا۔ جادوگر نے بتایا کہ تاجروں کا اصل چہرہ مسخ کر دیا جاتا تھا، سر گردن سے الگ نہیں کیا جا سکتا، بکس میں ایک کٹے ہوئے چہرے کو متعلقہ آدمی کا میک اپ کر کے سجا دیا جاتا تھا۔

بزرگ کی دعا اور کرامت سے سب کے چہرے درست ہو گئے، سب نے خدا کا شکر ادا کیا اور تکبر سے توبہ کر لی۔ اخبار میں ساری تفصیل شائع ہوئی اور انسپکٹر عمران کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔

ذات قلندر

امجد جاوید

قلندر دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو شکر گزاری کے اعلیٰ ترین مقام تک پہنچ کر قرب الٰہیٰ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رب تعالیٰ بھی ان کی خواہش کو رد نہیں کرتا۔ دوسرے وہ جو ذات کے قلندر ہوتے ہیں۔ ان کا پیشہ بندر، ریچھ اور کتے نچانا ہوتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے مرد آہن کی ہے جو ذات کا قلندر تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچایا جو اپنے تئیں دنیا مسخر کرنے کی دھن میں انسانیت کے دشمن بن گئے تھے۔ انسانی صلاحیتوں کی ان رسائیوں کی داستان جہاں عقل دنگ رہ جاتی ہے اور فکر حیران۔ اس داستان کی انفرادیت کی گواہی آپ خود دیں گے۔ کیونکہ یہ محض خامہ فرسائی نہیں مقاصد کا تعین بھی کرتی ہے۔

تقریباً چند لمحوں تک نمریتا سے بولا ہی نہیں گیا۔ پھر جب بولی تو اُکھڑے ہوئے سانسوں میں آدھے ادھورے لفظوں میں کہا۔

”جس...... پال...... جلدی نکلو...... بھاری تعداد میں پولیس نیچے آ چکی ہے۔“

”ہم نکلیں گے کہاں سے؟“ جسپال نے سوچتے ہوئے اس سے پوچھا تو نمریتا نے انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اُوپر...... اُوپر، چھت پر سے...... آؤ۔“

یہ کہہ کر وہ بھاگتے ہوئے تیزی سے واپس پلٹ گئی۔ جسپال اس کے پیچھے بھاگا، وہ آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے چھت پر آ گئے۔ وہ ساری چھتیں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک تھیں۔ انہوں نے نیچے جھانکنے کی زحمت نہیں کی بلکہ عقب میں جو چھت تھی اس پر کود گئے۔ ایک کے بعد اگلی اور پھر اس سے اگلی چھت پر کودتے ہوئے وہ اپنی عمارت سے کافی دور نکل آئے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان کے لئے یہ تھا کہ وہ یہاں سے سڑک تک کیسے جائیں۔ تبھی جسپال نے ایک لمحے کو سوچا، پھر ادھر اُدھر تاکا۔ وہ جس چھت پر تھے اس کی سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں، تبھی جسپال نے کہا۔

”ہمیں اس طرح چھتیں کودتے ہوئے پولیس دیکھ سکتی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے نیچے اترتی سیڑھیوں کی جانب اشارہ کیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، گرو کا نام لیں اور......“ باقی فقرہ نمریتا نے اشارے سے مکمل کر دیا۔

”نکل۔“ جسپال نے کہا تو وہ دونوں سیڑھیاں اترتے چلے گئے۔ دوسری منزل پر کوئی نہیں تھا۔ اس لیے وہ اگلی سیڑھیاں بھی اتر گئے جو صحن میں کھلیں۔ وہاں سامنے ہی تخت پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی، اس کے قریب ایک جوان سی عورت کے پاس چھوٹا بچہ کھیل رہا تھا۔ ان دونوں کو اچانک یوں اپنے سامنے دیکھ کر جوان عورت کی چیخ نکل گئی۔ جسپال نے وہاں کھڑے ہو کر بحث کرنا فضول سمجھا۔ انہیں سمجھانا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا، جبکہ ان کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ جسپال نے نمریتا کا بازو پکڑا اور باہر کی جانب نکلتا چلا گیا۔ وہ عورت گھگھیانے والے انداز میں چور چور کا شور مچانے لگی

تھی۔ ڈیوڑھی میں جسپال نے نمرتا کو سمجھایا۔

"ہم دونوں یہاں سے نکلتے ہی مخالف سمت میں ہو جائیں گے۔ بالکل نارمل انداز میں۔"

"او کے......!" اس نے کہا پھر چند لمحے بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر نکل کر دروازہ پار کر گئے۔ ان کے سامنے ایک کھلا بازار تھا، جو کافی بڑا تھا اور اس پر خاصی ٹریفک رواں دواں تھی۔ وہی بازار کا مخصوص شور تھا۔ اس کے قریب سے سائیکل رکشہ اور موٹر رکشہ والے گزر رہے تھے مگر وہ تیزی سے سڑک کراس کر گیا۔ وہ سکون سے چلتے ہوئے اگلا موڑ مڑ گیا۔ وہاں سے بھی اس نے سڑک پار کی اور ایک جگہ کھڑے رکشوں میں سے ایک رکشہ منتخب کر کے اس کے پاس گیا۔

"ریلوے اسٹیشن چلو گے؟"

"جائیں گا بھائی۔" اس نے کہا تو جسپال سوار ہوتے ہوئے بولا۔

"چل پھر......! جانا ذرا جلدی، بندہ کہیں گاڑی ہی نہ چڑھ جائے، اسے واپس لانا ہے۔"

"تیز چلنے کے ایکسٹرا پیسے ہوں گے، ابھی پہنچا دیتا ہوں۔"

"اب چلو بھی...... جتنی جلدی پہنچاؤ گے اتنا خوش کر دوں گا۔" جسپال نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ چل پڑا۔ جالندھر کی چند سڑکوں کو چھوڑ کر باقی ساری ایسی ہیں جن پر اگر رکشے میں سفر کیا جائے تو سارے جوڑ ہل جائیں۔ رکشے والا تیزی سے رکشہ چلائے جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کن راستوں سے کدھر جا رہا ہے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ سوچنا چاہ رہا تھا کہ پولیس اس تک کیسے پہنچی، مگر دماغ اس کا ساتھ نہیں دے پا رہا تھا۔ اس نے اس سوچ کو ایک طرف رکھا اور سامنے دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب رکشہ رکا تو اسے سامنے جالندھر اسٹیشن کی عمارت دکھائی دینے لگی۔ وہی انگریز دور کی عمارت تھی جس پر ہندی اور پنجابی کے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے۔ جسپال نے رکشے سے اتر کر بڑا نوٹ جیب سے نکالا اور پھر اسے دیتا ہوا بولا۔

"لو جی، باقی پیسے دے دو۔"

وہ چاہتا تو سارے ہی پیسے اسے دے کر جا سکتا تھا لیکن وہ کسی کو بھی شک نہیں ہونے دے رہا تھا کہ اسے کوئی کسی حوالے سے یاد بھی رکھے۔ باقی پیسے لے کر اس نے بغیر گنے جیب میں ڈال لیے اور پھر عمارت کی جانب چل پڑا۔ عمارت کے اندر جا کر اسے احساس ہوا کہ ٹکٹ لینے والی جگہ تو اسے دکھائی دے گئی ہے لیکن اسے ابھی چندی گڑھ کی گاڑی مل بھی جائے گی یا انتظار کرنا پڑے گا؟ یہ معلومات اسے کہاں سے لینا تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تا کہ کسی سے پوچھ سکے، تبھی اسے ایک قلی دکھائی دیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اس کا فون بج اٹھا۔

"میں منالی ہوں جسپال......! تمہاری دوست...... رکو میں آ رہی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ جسپال نے فون بند کر کے ادھر ادھر دیکھا، سامنے ہی سفید شلوار قمیص اور بڑے سارے آنچل کے ساتھ، کھلے بال اور اس پر مرکوز آنکھوں کے ساتھ وہ خوابیدہ دکھائی دینے والی لڑکی چلتی چلی آ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے سادہ سا لباس پہن رکھا تھا مگر وہ اس میں خوب جچ رہی تھی۔ وہ اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی، پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی پھر چند لمحوں بعد اس سے الگ ہو کر بولی۔

"تم پریشان ہو گے کہ پولیس تم تک کیسے پہنچ

گئی۔ اس کی وجہ تمہارا یہ سیل فون ہے۔ وہ اب بھی کچھ دیر بعد تم تک پہنچ سکتی ہے، لہٰذا اسے مجھے دو۔"

جسپال اس کے معصوم چہرے سے نگاہیں ہٹا ہی نہیں پا رہا تھا، اس نے اپنا سیل فون یوں اس کی جانب بڑھا دیا جیسے کوئی معمول اپنے عامل کا حکم مانتا ہے۔ اگلے ہی لمحے ایک نوجوان ان کے قریب آیا تو منالی نے وہ فون اسے دے دیا۔ پھر بڑی ادا سے بولی۔

"اب وہ تمہیں جالندھر ہی میں تلاش کرتے رہیں گے، کیونکہ تمہارا فون ادھر ہی رہے گا۔ رابطے ختم، چندی گڑھ سے نئے رابطے ہوں گے۔"

"ٹرین جائے گی کب......؟" جسپال نے رعب حسن سے مغلوب ہوتے ہوئے کہا۔

"ابھی کچھ دیر میں...... آؤ......" اس نے جسپال کا ہاتھ پکڑا تو اسے لگا جیسے کسی ریشم کے گالے نے اسے چھوا ہے، وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ سامنے پلیٹ فارم پر لوگ گاڑی کی آمد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرین پلیٹ فارم پر آن رکی۔ وہ ایک ڈبے میں سوار ہو گئے۔ وہ اے سی کمپارٹ تھا۔ اس نے جسپال کو سامنے بیٹھنے کو کہا اور خود بھی بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد ٹرین نے وسل دی تو جسپال کو احساس ہوا، تبھی اس نے پوچھا۔

"کیا ہم دونوں ہی ہیں......؟"

"کچھ لوگ ہیں ہمارے ساتھ...... فکر نہ کرو، پرسکون ہو جاؤ۔" لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ دو نوجوان ان کے پاس آئے، ان کے پاس کچھ سامان تھا۔ وہ انہوں نے رکھا اور واپس پلٹ گئے۔

"کچھ کھاؤ پیو گے جسپال؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو منالی اسی سامان کی طرف اٹھ گئی، ٹرین چل پڑی تھی۔

❀

دوپہر ہو چکی تھی۔ پیرزادہ وقاص کی طرف سے کافی سے زیادہ بندے آ گئے تھے۔ ان میں سے چند واپس چلے گئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اس بوڑھے اور دونوں لڑکیوں کو بھی لے گئے تھے۔ میں نے وہاں ڈیرے کے فون سے شاہ زیب سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن اس نے وہ فون ہی نہیں اٹھایا جو ڈیرے کے نمبروں سے آ رہا تھا۔ اس سے مجھے یہ یقین ہو گیا کہ شاہ زیب کو ڈیرے پر قبضے کے بارے میں علم ہو چکا ہے۔ وہیں ڈیرے پر کافی مال ڈنگر بندھے ہوئے تھے۔ میں نے وہ سارے کھول دیئے، اس کا مطلب تھا کہ وہ جس کے بھی ہاتھ لگتے، چار دن ان کا فائدہ ضرور لیتے، اگر واپسی کا مطالبہ نہ کیا گیا تو وہ مویشی انہی کے ہو جانے تھے۔ میں نے چاچے بیرو سے بکرے ذبح کرنے کو کہا تھا، اس لیے دوپہر کے وقت اچھا خاصا کھانا سب لوگوں کے لیے تیار ہو گیا۔ ہم سبھی نے ایک ہال میں کھانا کھایا، پھر میں جانی شوکر اور طلحہ مانڈی، شاہ زیب والے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے، باقی سب اپنی اپنی پوزیشن پر بیٹھ گئے، تبھی جانی شوکر نے کہا۔

"جمالے......! ایک بات کہوں، لیکن اس کا جواب تم بہت سوچ سمجھ کر دینا۔"

"ہاں بولو۔!" میں نے اس کے لہجے پر چونکتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں سرداروں کا یہ ڈیرہ ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے، تمہارا کیا خیال ہے، اس میں شاہ زیب کی بے عزتی نہیں ہے کہ ہم اس کے ڈیرے پر قبضہ کر کے بیٹھے ہیں۔"

"بالکل! بڑی عزتی ہے، علاقے میں تو شور مچ گیا

ہوگا کہ جمالے نے سرداروں کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ آج اس نے ڈیرے پر قبضہ کیا ہے، کل وہ حویلی پر قبضہ کرلے گا۔" طلحہ مانڈی نے دیدے پھیرتے ہوئے کہا تو میں نے جانی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"شاہ زیب چاہے سامنے نہ آئے' لیکن وہ اپنے بندوں کی مدد سے اور پولیس کی مدد سے ڈیرے پر سے قبضہ ضرور واپس لے گا۔ آج نہیں کل' ہم زیادہ دیر تک اس پر قبضہ نہیں جما سکتے اور پھر وہ بندے جو یہاں سے بھاگ کر گئے ہیں ان میں پتہ نہیں کون زندہ ہے' کون مرگیا ہے' وہ بھی اپنے ہی گلے پڑیں گے۔ میرے خیال میں ہم جتنی جلدی یہاں سے نکل سکیں' نکل جائیں' کہیں ہم بھی اس چوہے دان میں نہ پھنس جائیں۔"

"بات تو تیری ٹھیک ہے' ہم نکل جاتے ہیں لیکن یہاں سے نکلنے کے بعد جائیں گے کہاں؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"بہتیرے ڈیرے ہیں' ابھی شام ہونے میں آدھا دن پڑا ہے۔ سرداروں کی گاڑیاں ہیں' ان پر انہی کا اسلحہ لادتے ہیں اور کہیں بھی ٹھکانہ بناتے ہیں۔"

"چل ٹھیک ہے۔ پھر تھوڑی دیر کیوں' ابھی نکلتے ہیں۔" میں نے کہا اور پیرزادہ وقاص کو فون کرکے موجودہ صورت حال کے بارے میں بتایا تو وہ بولا۔

"شام تک اس علاقے میں رہو' میرا مطلب ہے گاؤں اور اس کے اردگرد' شام پڑتے ہی چوہدری شاہنواز کے ڈیرے پر یا سیدھے میرے پاس میران شاہ آجانا' میں یہ تھوڑا سا وقت وہاں گزارنے کے لیے کیوں کہہ رہا ہوں؟ اس کی وجہ ہے' پورے علاقے میں تیری دھاک بیٹھ گئی ہے' کہ جمال سرداروں کے سامنے کھڑا ہوگیا ہے اور سمجھو کہ آج کے دن سے تم دہشت کی علامت بن گئے ہو۔ شاہ زیب کو احساس ہونا چاہیے کہ تم اسی علاقے میں ہو۔ اس پر خوف طاری رہے اور اپنے بچاؤ کے لیے بھاگتا پھرے۔"

"میں ساری بات سمجھتا ہوں پیرزادہ' ٹھیک ہے۔ اب اسے صرف میرے اشارے پر ناچنا ہوگا" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ نجانے کیوں مجھے اس کی باتیں اچھی نہیں لگی تھیں۔ ایک احساس ہوا کہ جیسے وہ اب مجھے صرف اور صرف اپنا مہرہ خیال کررہا ہے اور مجھے اپنے طور پر چلانے کی کوشش کررہا ہے' اتنی بات تو میں سمجھتا تھا کہ پورے علاقے میں یہ خبر تو جنگل کی آگ کی مانند پھیل گئی ہوگی میں یہی سوچنے لگا۔

"کیا سوچنے لگے ہو؟" جانی شوکر نے پوچھا تو میں اپنے خیالات سے باہر آ گیا۔

"کچھ نہیں' چلو اٹھو نکلو......" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم سب ڈیرے کے صحن میں آگئے۔ سارا اسلحہ نکال کر ایک فور وہیل گاڑی میں رکھ دیا۔ سبھی لوگ باہر آگئے۔ میں نے چند ہینڈ گرینڈ اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ چاچا بیرو یہ سب دیکھ رہا تھا۔ تبھی میں نے اس سے کہا۔

"چاچا...... باہر آجا۔"

وہ چپ چاپ باہر آگیا اور پھر اس کچے راستے پر چل دیا جو پکی سڑک پر جاتا تھا۔ جو حویلی کے سامنے سے ہوکر قصبے کو جاتی تھی۔ جس کے دوسری طرف ہمارا گاؤں نور نگر تھا۔ میں نے انتہائی تیزی کے ساتھ مختلف کمروں میں ہینڈ گرینڈ پھینکنا شروع کردیے۔ اس وقت میں ڈیوڑھی میں تھا جب پہلا گرینڈ پھٹا۔

میں بھاگ کر جیپ میں سوار ہوا تھا۔ باقی لوگ دور نکل گئے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی جیپ چل دی۔ تبھی یکے بعد دیگرے وہاں دھماکے ہونے لگے۔ سڑک پر جاکر میں نے ایک نگاہ ڈیرے پر ڈالی تو وہ کھنڈر بن چکا تھا' اور کئی کمروں سے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مجھے یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ دھماکے گاؤں میں ضرور سنے گئے ہوں گے۔ ہم سڑک پر رُکے تو میں نے طلحہ مانڈی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"اب تم جاؤ واپس......"

"کیا اب ہماری ضرورت نہیں رہی؟" وہ حیرت سے بولا۔

"میرے خیال میں نہیں...... پیرزادہ کو میرا شکریہ کہنا اور بتانا کہ جلد ہی میں اسے ملنے کے لیے آؤں گا۔ آج رات کے بعد کسی وقت......" میں نے اس سے کہا۔

"جیسے تیری مرضی جمالے...... مگر ابھی خطرہ ٹلا تو نہیں ہے۔" طلحہ مانڈی بولا۔

"اب میرے لیے ہر وقت خطرہ ہی خطرہ ہے۔ کب تک سہارے تلاش کروں گا۔" میں نے کہا تو اس نے چند لمحے میری طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر اپنے لوگوں کے پاس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر سڑک کی مخالف سمت چل دیا۔ جانی شوکر اپنی بائیک پر تھا' وہ آگے چل پڑا۔ میں جیپ لے کر اس کے پیچھے چلا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم سڑک پر چلتے ہوئے وہاں آگئے جہاں حویلی کو راستہ مڑتا تھا۔ وہاں گیٹ پر خاصی ہلچل تھی' مگر وہ لوگ خاصے دور تھے۔ ظاہر ہے ان میں شاہ زیب نہیں تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ میرا رُخ اب گاؤں کی طرف تھا' جانی شوکر پہلے ہی گاؤں میں مڑ چکا تھا۔

میں نے جاتے ہی چھاکے کے گھر کے آگے گاڑی روکی۔ وہ واپس آچکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی میرے ساتھ آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"یہ جیپ تو سرداروں کی ہے۔ یہ دھماکے تو نے ہی کیے ہیں نا۔" اس نے تصدیق کرنے والے انداز میں پوچھا تو میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں......! ان کا ڈیرہ جلا دیا میں نے۔"

"اب حویلی......؟" اس کی آنکھوں میں چمک بڑھ گئی۔ تبھی میں نے پوچھا۔

"دیکھتے ہیں' پر تو مجھے اماں اور سوہنی کے بارے میں بتا۔"

"یہاں سے چل۔ دلبر کے ڈیرے پر۔"

"پیچھے دیکھو۔ اسے بھی سنبھالنا ہے۔" میں نے اس کی توجہ اسلحہ کی طرف دلائی تو وہ دیکھ کر بولا۔

"اس کو سنبھال لیتے ہیں تو اُدھر چل۔"

میں نے جیپ ادھر بڑھادی' تب وہ مجھے بتانے لگا۔

"ہم رات کے آخری پہر لاہور پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی اس کوٹھی میں نہیں گئی' جہاں پہلے رہتی تھی' بلکہ ماڈل ٹاؤن میں چلی گئی ہے۔ جہاں پہلے ہی کوئی ماضی کی فلمی اداکارہ رہتی ہے۔ اس نے مجھے وہاں کا سارا پتہ ٹھکانہ سمجھایا ہے' اپنا نمبر دیا ہے جس سے اب رابطہ ہوسکتا ہے۔ میرے خیال میں وہ وہاں پر محفوظ ہے۔"

"تو کہتا ہے تو میں یقین کرلیتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی ہنس دیا۔ ہم اسی خوشگوار موڈ میں دلبر کے کنویں پر جا پہنچے۔ جہاں معمول کے مطابق کافی سارے لوگ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ نعرے مار کر اٹھ بیٹھے۔ انہوں نے

تاش ایک طرف پھینک دی تھی۔ وہ خوشی کا اظہار اس لیے کررہے تھے کہ میں نے شاہ زیب کو دن میں تارے دکھا دیئے اور اسے ناچنے پر مجبور کردیا۔ وہ میرا گھر تو جلا بیٹھا اب بزدلوں کی طرح اپنا علاقہ اور حویلی چھوڑ کر بھاگا ہوا ہے۔

فتح ہمیشہ وقتی ہوتی ہے اس کا دورانیہ چاہے جتنا طویل ہو کیونکہ اس میں ہمیشہ شکست کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ تاہم جدوجہد میں نہ صرف لذت ہے بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی مقصد شامل ہوتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی جستجو میں انسان کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ یوں فتح اور کامیابی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ اس وقت وہ لوگ میری فتح اور جرات مندی کی باتیں کررہے تھے لیکن میں محسوس کررہا تھا کہ یہ سب فضول ہے۔ میرا مقصد سردار شاہ دین کو ختم کرنا تھا۔ وہ کردیا لیکن اس کے بعد میں جو کچھ بھی کررہا تھا' یہ مجھے کسی اور ہی راستے پر لیے جارہا تھا۔ کچھ دن بعد تک جب میں پولیس کے ہاتھ نہیں آؤں گا تو مجھے اشتہاری قرار دے دیا جائے گا اور پھر اپنی آخری چانس تک میں خود کو بچاتے گزار دوں گا۔ اشتہاری کی موت کبھی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وڈیرے' جاگیردار اور یہ سردار یہی تو کرتے ہیں' جو بندہ بھی علاقے میں سر اٹھاتا ہے' اسے اپنی بستر چھاؤں میں لے کر اشتہاری بنا دیتے ہیں۔ یہ کوئی مثبت رویہ نہیں لیکن اس منفی رویے سے ان کی حاکمیت' قائم رہتی ہے۔ اب میں بھی اپنی جان بچانے اور شاہ زیب کو مارنے کی فکر میں تھا' پھر اس کے بعد ایک طویل جنگ تھی جو کسی نہ کسی کے ساتھ کرتے رہنا تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" چھاکے نے پوچھا۔

"یہی کہ اب شاہ زیب تک کیسے پہنچا جائے؟"

"اس کا پتہ بھی چل جائے گا۔ فی الحال اپنا کوئی ٹھکانہ تو بنائیں۔" میں نے کہا۔

"چند دن تو یونہی گزارنا پڑیں گے۔ جب تک دوبارہ گھر نہیں بن جاتا' اتنے دن تو شاہ زیب کو تلاش کرنے میں بھی لگ جائیں گے۔" چھاکے نے مجھے سمجھایا تو میں نے کہا۔

"اچھا یار! کوئی بندہ بھیدے کے گھر جائے' میں اپنے پرانے کپڑے اسے دیتا رہا ہوں۔ کوئی صاف جوڑا تو لے آئے۔"

میرے کہتے ہی ایک نوجوان سا لڑکا اٹھا اور بائیک پر سوار ہوکر گاؤں کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد وہاں خیال آرائی ہونے لگی کہ شاہ زیب کہاں ہوسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سب کا یہی خیال تھا کہ جب تک شاہ زیب والا معاملہ حل نہیں ہوجاتا' کہیں مستقل ٹھکانہ نہ رکھا جائے' بلکہ جہاں تک ممکن ہوسکے کسی کو ٹھکانے کے بارے میں علم ہی نہ ہو اور پھر اتنی بھیڑ بھی اپنے ساتھ نہ رکھے' وہ سب پورے خلوص سے مشورہ دے رہے تھے اور میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے' میں نے یہی سوچا کہ میں رات کے وقت نور نگر کے علاقے میں رہوں گا اور دن کے وقت کسی جگہ چھپ کے وقت گزاروں گا۔ مجھے صرف شاہ زیب کو ختم کرنا تھا۔ تب تک میرا نور نگر میں کوئی کام نہیں تھا۔ سو میں نہا دھو کر قصبے کی طرف نکل جانے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ وہ رات سہیل کے پاس گزاروں۔

میں نے وہیں ڈیرے پر نہا کر کپڑے بدلے اور تروتازہ ہوگیا۔ اس وقت میں وہاں سے اٹھنے کے لیے پرتول رہا تھا کہ دور سے مجھے ایک موٹر سائیکل

سوار نوجوان آتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے ہمارے گاؤں کا ایک بزرگ تھا جنہیں ہم نے پنچائیت کا رکن بنایا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے ہمارے قریب آتے چلے جارہے تھے۔ مجھ سمیت وہاں پر موجود ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ یہ یہاں کیوں آرہے ہیں۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ڈیرے پر موٹر سائیکل روکی اور وہ بزرگ ہمارے درمیان آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے بٹھالیا تو سبھی ہمہ تن گوش ہوگئے۔

"دیکھ پتر جمال! ہم جانتے ہیں کہ شاہ زیب نے خواہ مخواہ تم سے دشمنی بنائی ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی رہی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں تمہارا نقصان ہوا اور تم دن بدن جرم کی راہ پر چلتے چلے جارہے تھے۔ اس کے بعد ہوگا، کیا تم اشتہاری بن جاؤ گے اور تم موت کے خوف سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔"

"لیکن اب میں کروں بھی کیا؟ میں اپنے آپ کو بھی نہ بچاؤں' میری ماں کدھر ہے؟ اس کا جواب ہے آپ کے پاس؟ اب میرے یا شاہ زیب کے درمیان دشمنی چل پڑی ہے' ہم میں سے کوئی ایک ختم ہوگا تو اس کا انجام ہوگا ورنہ نہیں۔"

"اس کی درمیانی راہ بھی نکل سکتی ہے۔ یہ دشمنی کسی کے ختم ہوئے بغیر بھی ختم ہوسکتی ہے۔" بزرگ نے بڑے خلوص سے کہا۔

"کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"بیٹا مجھے غلط مت سمجھنا' میں تمہیں ایک مشورہ دیئے جارہا ہوں' اس پر خوب سوچ لینا' پھر بات کرنا' میں نہیں کہتا کہ تم شاہ زیب سے معافی مانگ لو' بلکہ شاہ زیب نے اپنے باپ کے قتل کا الزام اگر تم پر لگایا ہے تو اس کا سامنا کرو' تم نے اگر یہ گناہ نہیں کیا تو پھر نہیں کیا' یہ ثابت کردو۔"

"بابا......! آپ پرانی باتیں کررہے ہیں' میں جس رات حوالات میں تھا' اس رات شاہ زیب کے لوگوں نے میرے گھر کو جلایا' میں نے تو اسی نیت سے خود کو پولیس کے حوالے کیا تھا' مگر وہاں کیا ہوا؟ میری گرفتاری تک نہیں ڈالی گئی اور اگلے دن مجھے ماورائے عدالت ہی قتل کرنے کی سازش بنائی گئی تھی۔ انہوں نے یہ طے کرلیا کہ مجھے جان سے مارنا ہے تو پھر یونہی سہی۔ جن لوگوں نے میرے گھر کو جلایا تھا' ان سے تو میں نے بدلہ لے لیا۔ اب بس شاہ زیب باقی ہے۔"

"ڈیرے پر جو تم نے گولی چلائی ہے نا' اس میں دو بندے مرگئے ہیں' یہ قتل تمہارے سر ہوگئے ہیں۔ سردار شاہ دین کے قتل میں جو ہم سمجھتے ہیں کہ تم پر الزام ہے' اس سے تو بچ جاتے لیکن اب ان میں تم پولیس کو مطلوب ہوگئے ہو اور دن بدن تم اس دلدل میں پھنستے چلے جاؤ گے۔"

"اب پھر کیا ہوسکتا ہے؟" میں نے اس بزرگ کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ جواب تک اس نے نہیں بتایا تھا۔

"دیکھو! تم خود کو پولیس کے حوالے کردو' تم قانونی جنگ لڑو' میں نہیں چاہتا کہ تم پولیس کے ہاتھوں کسی مقابلے میں مارے جاؤ' کیونکہ اس وقت پولیس نے پورے نور نگر کو گھیرا ہوا ہے' پولیس کو اسی وقت اطلاع ہوگئی تھی جب تم نے ڈیرے پر قبضہ کیا تھا۔ انہیں معلوم ہے کہ تم اس علاقے میں ہو' نہ جانے انہیں یہ بھی معلوم ہو کہ تم اس ڈیرے پر موجود ہو۔ وہ گھیرا تنگ کریں گے' تم نکلنا چاہو گے اور وہ جو شاہ زیب چاہتا ہے' وہ ہوجائے گا۔"

"اور اگر جمالا یہاں سے نکل جائے تو......" چھاکے نے کافی حد تک غصے میں کہا۔

”نکل گیا تو نکل گیا‘ کیا پھر خطرہ ٹل جائے گا۔ رسک ہے نا میر اپتر‘ جمالے کے ساتھ ان سب میں سے کسی کی جان بھی جاسکتی ہے۔“ بزرگ نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”بابا.....! تو ہمیں ڈرانے آیا ہے یا پولیس کا پیغام لے کر‘ تیرا مقصد کیا ہے؟“ چھاکے نے پوچھا۔

”دوپہر سے پولیس گاؤں میں ہے‘ اردگرد کے علاقے کے کچھ معززین بھی وہیں موجود ہیں۔ آج یا کل جو بھی ہوا اس کی پورے علاقے کو خبر ہو چکی ہے پہلے جو کچھ ہوا‘ وہ کیا تھا اس بارے میں ہم نہیں جانتے‘ لیکن اس بار اگر تو گرفتاری دے دیتا ہے تو یہ گرفتاری یونہی نہیں ہوگی‘ بہت کچھ طے کر کے یہ گرفتاری دی جائے گی۔ شاہ زیب کا گند، اب ہمی نے سمیٹنا ہے۔“

”مطلب‘ جمال جائے اور پولیس کو گرفتاری دے دے.....“ چھاکے نے چونکتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے‘ ورنہ خواہ مخواہ میں خون خرابہ ہوگا اور اس کا حاصل کچھ بھی نہیں ہے۔“ بزرگ نے متانت سے کہا۔

”وہ کیا طے کریں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”یہ تُو بتادے۔ پھر بیٹھ کر اچھا ہی کریں گے۔ اب اس علاقے میں مزید خون ریزی برداشت نہیں ہو سکتی۔“ بزرگ نے سکون سے کہا۔

”ٹھیک ہے‘ میں سوچ کر بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ بزرگ اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہم سب چوک میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ایک گھنٹے تک تیرا انتظار کریں گے آ جاؤ تو ٹھیک نہ آئے تو پھر ہمارے ہاتھ میں کچھ نہیں رہے گا۔“

”میں مشورہ کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ چلا گیا کچھ دیر تک ہر بندہ اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ ان سب کا خیال تھا کہ مجھے گرفتاری نہیں دینی چاہیے‘ اشتہاری ہوتا ہے تو ہو جائے‘ کیا شاہ زیب پھر اپنی خباثت نہیں دکھائے گا؟

”دکھائے گا‘ کیوں نہیں دکھائے گا‘ جمالے کی موت ہی اب اسے اس علاقے میں لے کر آئے گی‘ اب نجانے کہاں بیٹھ کر وہ پولس کو مہرے کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔“ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”تو بس پھر ٹھیک ہے‘ تو نکل یہاں سے‘ پولیس کو ہم الجھا لیتے ہیں۔ پورے علاقے میں ناچتی رہ جائے گی۔“

”لیکن یہ بھی تو سوچو کیا ہم علاقے کی مخالفت مول لے لیں گے۔ ایک شاہ زیب کی مخالفت ہے‘ اب وقت ہے کہ اگر علاقے کے معززین کی ہم بات مانتے ہیں تو کم از کم وہ ہماری پشت پر ہوں گے‘ ہماری محبت میں نہ سہی‘ شاہ زیب کی مخالفت ہی میں سہی‘ اگر ہم نے انہیں بھی ناراض کر لیا تو ہمارا اس علاقے میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے ایک بار علاقے والوں کی مان کر دیکھ لیں۔“ میں نے سب کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تو گرفتاری دے دے گا۔“ ایک نے پوچھا۔

”وہ تو ہے‘ ورنہ پولیس والی ذہنی اذیت تو چلتی ہی رہے گی‘ وہاں جاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ اب تو میری مرضی ہے نا کہ وہ میری گرفتاری لیتے ہیں یا نہیں۔ لاشوں کو تو ہتھکڑی پہنانے سے رہے۔“ میں نے دور تک سوچتے ہوئے کہا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو جمالے۔“ چھاکے نے میری

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
''تو چلو پھر چلتے ہیں۔''
''نہیں، تم سب لوگ ادھر رہو گے، میں جاتا ہوں اکیلا! اگر میں گرفتار ہو گیا تو تھانے میں ملنے آ جانا' ورنہ شام تک میری قبر کا بندوبست کر لینا۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں ان سب کے گلے ملا' بائیک لی اور گاؤں کی جانب چل پڑا۔
سچائی اور مردانگی میں حقیقت سے انکار نہیں کیا جاتا' چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔ سازش کرنے والے وقتی کامیابی تو لے سکتے ہیں لیکن ان کے لیے دائمی شرمندگی اور شکست مقدر بن جاتی ہے' مرد وہی ہوتا ہے جو حقیقت کا سامنا کرے' سازشوں سے وقتی کامیابی لینے والے اپنے آپ کو مرد کہلانے کے حق دار نہیں۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا کہ میں راہ فرار اختیار نہیں کروں گا' بلکہ حقیقت کا سامنا کروں گا۔ یہ حقیقت تھی کہ میں نے سردار شاہ دین کا قتل کیا۔ اس کے لیے میں نے خود کو پولیس کے حوالے بھی کر دیا تھا۔ میں نے خون کا بدلہ خون سے لے لیا تھا جو کبھی انہوں نے میرے باپ کو مارا تھا اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر خود کو اس قتل سے مبرا قرار دلوا لیا۔ آج یہی کچھ میں ان کے ساتھ کر رہا تھا' وہ طاقت کے بل بوتے پر آج بھی مجھے گھیر رہے تھے اور میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہی کے ہتھیاروں سے انہی کو مات دوں گا۔ میں کب تک بھاگتا؟
گاؤں کے چوراہے میں برگد کے درخت تلے لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ بہت سارے پولیس والے اور گاؤں کے عام لوگوں کے علاوہ چارپائیوں پر علاقے کے معززین بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک چارپائی پر وہی ڈی ایس پی موجود تھا جو مجھے گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ گاؤں کے بزرگ اور پیرزادہ وقاص بھی وہیں موجود تھا۔ میں نے سب کو سلام کیا اور ایک طرف پڑی خالی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ میری آمد پر جو ہلچل مچی تھی' اس پر سکوت طاری ہو گیا تھا۔ تبھی پولیس انسپکٹر اٹھا اور اس نے اونچی آواز میں سب گاؤں والوں کو اور پولیس والوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا کہا' جلد ہی چند لوگ وہاں رہ گئے تو ایک بزرگ معزز آدمی نے کہا۔
''ڈی ایس پی صاحب' جمال آ گیا' میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی سچائی کا پہلا ثبوت ہے ورنہ اگر یہ مجرم ہوتا تو اب تک بھاگ گیا ہوتا۔''
''میں مانتا ہوں چوہدری صاحب! اس نے جو کچھ بھی کیا ردعمل کے طور پر کیا۔ شاہ زیب نے اس پر الزام لگایا لیکن ایک بھی ثبوت نہیں دیا۔ میں نے اس لیے اس کی گرفتاری نہیں ڈالی تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ اسے خواہ مخواہ پھنسایا جا رہا ہے۔ اس نے کسی دوسرے آپشن پر بات ہی نہیں کی تھی۔ اب شاہ زیب لاہور میں ہے اور وہاں سے اعلیٰ حکام کے ساتھ مل کر ہم پر دباؤ ڈلوا رہا ہے کہ ہم اسے گرفتار کریں۔ اب یہ ہماری مجبوری ہے' جمال اگر ہمارے ساتھ چلتا ہے تو ہم اس کے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔''
''یہ نہ ہو کہ اب بھی آپ اس کی گرفتاری نہ ڈالیں اور جس طرح شک تھا کہ......'' ایک معزز نے کہا تو ڈی ایس پی فوراً بول اٹھا۔
''نہ......نہ......اس بار قانون کے مطابق سب کچھ ہو گا۔ اب تک شاہ زیب نے کوئی ثبوت نہیں دیا کہ یہ الزام اس نے کیوں لگایا۔ یہ بالکل اسی طرح ہی ہے جیسے کوئی بندہ اٹھ کر یہ کہہ دے کہ شاہ زیب نے خود اپنے باپ کو قتل کیا' میں کہہ رہا ہوں نا کہ آپ

اور جمال ہمارے ساتھ تعاون کرے گا تو ہم بھی پوری طرح تعاون کریں گے اور مجھے یقین ہے کہ ہم اس کا ریمانڈ نہیں لے پائیں گے' بلکہ اس کی ضمانت ہو جائے گی۔ یہ میرا وعدہ رہا کہ قانونی طور پر میں جمال کو اپنی صفائی کا پورا پورا موقع فراہم کروں گا۔''
''اب یہی طے ہے نا کہ جمال پر صرف اور صرف سردار شاہ دین کے قتل کا الزام ہے' اور باقی جو کچھ ہوا......؟'' بزرگ نے پوچھا۔
''ڈیرے پر جو کچھ ہوا' اس کی اطلاع ہے ہمیں' لیکن وہاں پر ان اشتہاریوں نے تین لوگوں کو اغواء کر کے رکھا ہوا تھا۔ باقی میں اور جمال ساری بات طے کر لیں گے۔'' ڈی ایس پی نے شاید عوامی طور پر یہ بات کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے لگا تھا۔
''ٹھیک ہے' میں گرفتاری دیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پیرزادہ وقاص کی طرف دیکھا' وہ ہلکے سے مسکرا دیا تھا۔ میں نے اٹھ کر اپنے بازو پھیلا دیئے' ایک کانسٹیبل نے میری کلائیوں میں ہتھکڑی ڈال دی' پھر میری تلاشی لی' کوئی قابل اعتراض شے نہ پا کر وہ مطمئن ہو گئے' میں خود چلتا ہوا کچھ فاصلے پر کھڑی گاڑی میں جا بیٹھا۔
اس وقت شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا جب مجھے تھانے میں لا کر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہاں تین اور لوگ تھے جو میرے لیے اجنبی تھے' اس بار میں باقاعدہ گرفتار ہو کر حوالات میں بند تھا۔ میں اب اس پورے قانونی عمل سے گزرنا چاہتا تھا' اب جو ہونا تھا وہ ہو کر رہتا اور میں اس کے لیے پورے طور پر تیار تھا۔

* * *

شام کے سائے پھیل کر اندھیرا چھا گیا تھا۔ جب چندی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر ٹرین رکی۔ جسپال اور منالی دونوں کے پاس سامان نہیں تھا' وہ ان کے ساتھ والے نوجوان لے گئے تھے۔ اس لیے وہ دونوں ایک ساتھ اٹھ کر بوگی سے باہر آ گئے' اگرچہ جالندھر سے چندی گڑھ تک دونوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ خاصا جھوٹ سچ بول کر تکلف کی دیوار گرا دی تھی۔ وہ رعب حسن جو منالی کو دیکھ کر جسپال پر طاری ہو گیا تھا اب وہ کافی حد تک کم ہو چکا تھا۔ وہ اس سے ایک قدم آگے تھی۔ اسٹیشن پر اترنے سے پہلے اس نے اپنا پہناوا بھی بدل لیا تھا۔ اس وقت وہ جالندھر والی منالی لگ ہی نہیں رہی تھی۔ ٹائیٹس کے جیسی نیلی جین اور تنگ سی شرٹ' پنسل ہیل' کھلے گیسوؤں میں وہ بھرپور لڑکی دکھائی دے رہی تھی' جس میں بلا کی کشش ہو' جسپال نے فوراً ہی اس سے نگاہیں ہٹا لیں اور چندی گڑھ کے جدید اسٹیشن کو دیکھنے لگا' اس کی عمارت کو جدید طرز پر بنایا گیا تھا اور نیلے رنگ کو کافی حد تک بولڈ رکھا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم سے نکلتے ہوئے وہ دونوں شانہ بہ شانہ چلتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن سے باہر آ گئے' جسپال کافی حد تک محتاط تھا' مگر اسے کہیں بھی کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا جو اس کی طرف متوجہ ہو۔ منالی جیسے ہی ایک جگہ کھڑی ہوئی اسی لمحے ایک مہنگی کار اس کے پاس آن رکی' جس کا دروازہ منالی نے خود کھولا اور جسپال کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ خود بیٹھی اور کار چل دی۔ کچھ دور جانے کے بعد جسپال نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔
''بھارت کے دوسرے شہروں سے زیادہ یہ شہر جدید دکھائی دے رہا ہے۔''
''نیا بنا ہے نا...... بنایا ہی جدید انداز میں ہے' اس

کا تاثر یہ دیا گیا ہے جیسے کوئی فارن کا شہر ہو' تم دیکھ لو گے اس کا یہ تاثر ہے کہ نہیں۔'' منالی نے عام سے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے کہا' وہ بھی بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

''ہاں تھوڑا تاثر تو اس کا مختلف ہے۔''

''یہ میرا شہر ہے جسپال' میں اس شہر کو خوب سمجھتی ہوں' ابھی کچھ دیر بعد دیکھو گے یہاں بڑے بڑے شاپنگ مالز ہیں۔ یہاں کے امیر ترین علاقوں میں سے ایک علاقہ سیکٹر سترہ ہے' جو یہاں کا مشہور ترین سیکٹر ہے' اس میں وہ شاپنگ مال ہے جو تمہاری منزل ہے' یعنی جسبیر سنگھ کا شاپنگ مال۔'' منالی نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''آج تم مجھے ہی جالندھر سے لینے گئی تھی۔'' اس نے ایک دم سے موضوع بدل دیا۔

''نہیں' جالندھر جاکر معلوم ہوا' مجھے آج صبح وہاں بلایا گیا تھا اور پھر تمہارا ٹاسک میرے ذمے لگادیا جو کل دوپہر سے پہلے ہوجائے گا۔''

اس کے یوں کہنے پر جسپال سمجھ گیا کہ ڈرائیور اس کے اعتماد کا ہے' سو اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ ٹرین میں انہوں نے بہت باتیں کرلی تھیں' سو ان کے درمیان خاموشی رہی' منالی اپنے طور پر سوچتی رہی اور وہ شہر کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ ایک پوش علاقے میں جا پہنچے۔ وہ بڑا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ ایک بنگلہ نما کوٹھی کے سامنے کار رکی ہی تھی کہ گیٹ کھل گیا۔ وہ کار سمیت اندر چلے گئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں گیا تو اسے لگا جیسے وہ کسی یورپی ملک کے گھر میں آ گیا ہو۔ منالی اسے سیدھا کمرے میں لے گئی۔

''یہاں آرام کرو' میں ابھی آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گئی۔ اس وقت وہ فریش ہوچکا تھا جب منالی دوبارہ کمرے میں آئی' وہ پہلے سے زیادہ فریش دکھائی دے رہی تھی۔

''جسپال! آؤ چلیں۔ کھانا بھی باہر کھائیں گے اور تمہارے لیے تھوڑی شاپنگ بھی کرلیں۔''

''میرے لیے شاپنگ کرنی ہے تم نے؟'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اپنا لباس دیکھو' میلا ہو رہا ہے' اور پھر جسبیر کے شاپنگ مالز سے کوئی سوٹ خریدنا تو اور بھی اچھا ہے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ منالی کی متانت اس کے حسن میں اضافہ کا باعث بن رہی تھی۔ پورچ میں ڈرائیور کار لیے موجود تھا۔ وہ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھے تو گاڑی چل پڑی۔

وہ ایک بڑا شاپنگ مال تھا۔ پارکنگ میں کار کھڑی ہوئی تو وہ دونوں پیدل ہی چل پڑے۔ اندر ایک جہان آباد تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سارا چندی گڑھ یہیں شاپنگ کرنے آ گیا ہے۔ وہ سب سے پہلے گارمنٹس ڈیپارٹ کی طرف گئے' جہاں سے جسپال نے اپنے لیے کافی کچھ خریدا' پھر ایک سیل فون شاپ پر جاکر سیل فون لیا' تبھی جسپال نے منالی سے پوچھا۔

''اس کا کنکشن.....؟''

''ہے میرے پاس' جو کہیں بھی رجسٹر نہیں ہے۔ ایسے کنکشن رکھنے پڑتے ہیں۔'' اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

''اوکے.....!'' جسپال نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ دکان سے ہٹ کر بولی۔

''جسبیر عموماً صبح نو بجے کے بعد یہاں آتا ہے۔ یہاں اوپر پہلی منزل پر اس کا آفس ہے' ابھی چلتے ہیں اور آفس دیکھ آتے ہیں' تم بھی یہ ساری لوکیشن دیکھ لو' پھر بیٹھ کر ڈسکس کرتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔''

''اوکے۔'' جسپال نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا اور یوں ہوگیا جیسے وہ وہاں تفریح کی غرض سے آیا ہو۔ وہ دونوں وہاں پر تقریباً دو گھنٹے تک رہے' اس درمیان انہوں نے وہیں سے فاسٹ فوڈ لیا۔ وہیں کھا کر وہ واپس گھر آ گئے۔

وہ دونوں بیڈ پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ جس پر منالی لکیریں کھینچ کر اسے سمجھا رہی تھی۔

''یہ پارکنگ ہے لیکن جسبیر کی گاڑی یہاں سے ہٹ کر کھڑی ہوتی ہے یہاں پر۔'' اس نے کاغذ پر ایک جگہ پنسل رکھتے ہوئے کہا۔ ''پھر وہ اس گیٹ سے اندر جاتا ہے' اس دوران اس کے ساتھ تقریباً چار گارڈ ہوتے ہیں۔ ان میں سے دو نیچے رہ جاتے ہیں اور دو اس کے ساتھ لفٹ میں سوار ہوکر اوپر جاتے ہیں۔ یہ لفٹ لابی میں کھلتی ہے' جو تم نے دیکھی' سامنے اس کا آفس ہے' دو گارڈ یہاں رک جاتے ہیں۔ یہ اس کے ساتھ والا کمرہ ہے' جہاں اس کا ماتحت عملہ ہوتا ہے۔ جسبیر دن کے ایک بجے تک یہاں رہتا ہے' اور پھر اس طرح واپس ہوکر اپنے گھر چلا جاتا ہے۔''

''منالی..... یہاں شاپنگ مال کی بجائے اس کا گھر.....'' جسپال نے کہا تو وہ تیزی سے بولی۔

''نہیں.....! وہ جس علاقے میں رہتا ہے' وہاں سیکیورٹی کا بہت زبردست بندوبست ہے۔ ایک تو وہ علاقہ سیکیورٹی کے حوالے سے بہت مضبوط ہے' دوسرا ادھر حکومتی عمارتیں ہیں' سیکرٹریٹ ہے' اس تک وہاں پہنچنا اگرچہ ناممکن نہیں ہے لیکن ادھر پلاننگ بہت لمبی کرنا ہوگی' یہ شاپنگ مال والا آسان ہے یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ نکلنا بہت آسان ہے' جدھر مرضی نکل جاؤ۔''

''ہاں.....! یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''سو.....! یہ تین پوائنٹ ہیں' نمبر ایک پارکنگ سے گیٹ تک' نمبر دو لابی میں لفٹ سے نکلتے ہی اور تیسرا اس کے آفس میں' ان تینوں میں سے کوئی ایک پوائنٹ دیکھو' کیونکہ یہ سب تم نے کرنا ہے' میں پھر اسی مناسبت سے نکلنے کا بندوبست کروں۔''

منالی نے کہا تو اس نے ایک دو لمحے سوچا اور پھر حتمی انداز میں کہا۔

''لابی میں ٹھیک رہے گا۔''

''اس کی وجہ.....؟'' منالی نے پوچھا۔

''نیچے مزاحمت زیادہ ہوگی' وہ چاروں گارڈ ہی نہیں' کھلی جگہ ہونے کے باعث لوگ زیادہ متوجہ ہوجائیں گے' پھر نکلنا مشکل ہوجائے گا' کیونکہ آفٹر آل یہاں بندے زیادہ چاہیے ہوں گے' رش ویسے ہی نگاہوں میں آ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے' اور لابی کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہاں اتنا زیادہ رسک نہیں ہے۔ دو طرف سے نکلنے کے لیے راستہ ہے اور وہاں پر زیادہ لوگوں کی مدد کی ضرورت بھی نہیں ہوگی' میں اکیلا ہی بہت ہوں۔ میں نے اگر جسبیر کو ماردیا تو کسی طرف سے بھی نکل جاؤں گا اور اگر میں مارا گیا تو آپ سب لوگ محفوظ رہیں گے۔''

''یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے۔'' منالی نے جسپال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''بالکل.....!''

''اوکے.....! اب سکون سے سوجاؤ' اگر تمہیں نیند آ گئی تو ٹھیک اور نہ آئے تو مجھے کال کرلینا' میں

آج رات تمہارے ساتھ اسی کمرے میں رہتی' لیکن مجھے کام کرنے ہیں کچھ......" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔

"اوکے گڈ نائٹ۔" جسپال نے کہا اور بیڈ پر سیدھا ہوگیا۔

اس وقت صبح کے آثار نمودار ہوگئے تھے' جب جسپال کی آنکھ کھلی' وہ عادت کے مطابق کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ وہ اپنے ذہن میں پوری پلاننگ کر چکا تھا' وہ مطمئن تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں سب کچھ دہرایا اور تیار ہونے کے لیے باتھ روم میں گھس گیا۔ اس وقت وہ تیار ہو کر ایک صوفے پر بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا' جب منالی اندر آئی' اس کے چہرے پر حد درجہ ملاحت اور خوشگواریت تھی۔ اس نے دیسی ہی نیلی جین' چیک دار شرٹ اور جاگر پہنے ہوئے تھے' اس نے بالوں کی پونی باندھی ہوئی تھی' اس کے چہرے پر شاندار مسکراہٹ تھی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔" جسپال نے اسے دیکھ کر بے ساختہ کہا۔

"اور تم بھی بہت ہینڈسم لگ رہے ہو۔ آؤ ناشتہ کریں۔" اس نے کہا تو جسپال نے ٹی وی بند کیا' پھر اس کے ساتھ باہر چل دیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آگئے' جہاں میز پر ناشتہ لگا ہوا تھا۔ ناشتے کی میز پر وہ دونوں ہی تھے۔ پرسکون ماحول میں ہلکی پھلکی گپ شپ میں انہوں نے ناشتہ ختم کیا۔

"دیکھو نو بجنے میں تقریباً ایک گھنٹہ پڑا ہے' اب ہمیں نکلنا چاہیے۔"

"تو پھر چلو۔" جسپال نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تقریباً بیس منٹ بعد وہ جسبیر کے شاپنگ مال پہنچ گئے۔ گاڑی پارکنگ میں لگاتے ہی منالی نے کہا۔

"میں نے یہاں فیلڈنگ لگا دی ہے' وہ سامنے دیکھو' سبز اور پیلے رنگ کی ٹوپی پہنے ایک نوجوان لڑکا' وہ اپنا آدمی ہے' جس کے بھی ایسی کیپ ہوگی' وہ ہمارا بندہ ہے' ضروری نہیں کہ باہر نکلتے وقت تم پارکنگ میں آؤ' وہ سامنے سڑک کے پار درخت کے ساتھ گاڑی کھڑی ہے' اس تک جانا وہ تمہیں پہچانتے ہیں' بے دھڑک اس گاڑی میں بیٹھ جانا' اب ہم اندر چلتے ہیں' اندر جا کر ہمارے راستے الگ ہو جائیں گے' میں صرف تمہیں کور دوں گی۔"

"ساری پلاننگ تم نے کرلی' مگر میرے پاس یا تمہارے پاس اسلحہ نام کی کوئی شے نہیں' فائر کس سے ہوگا؟" جسپال نے مسکراتے ہوئے پوچھا' تو منالی ہنستے ہوئے بولی۔

"یہ سیکیورٹی گیٹ پار کرو' بتاتی ہوں۔"

وہ دونوں سیکیورٹی گیٹ کے قریب پہنچ گئے' ارد گرد محتاط گارڈ کھڑے تھے' وہ سکون سے گزر گئے۔

"ہاں بولو......!" اس نے پوچھا۔

"اگر اسلحہ لے کر آتے تو یہیں پکڑے جاتے' اب وہ دیکھو سامنے اسنیکس کی دکان ہے' وہاں تک چلو' وہاں سب کچھ مل جائے گا۔" منالی نے کہا اور چہکتی ہوئی اس کے ساتھ یوں چل دی جیسے اسے دنیا کی پروا ہی نہیں ہے۔ وہ دونوں وہیں ایک طرف جا بیٹھے۔ چند لمحے بعد ان کے لیے آرڈر لینے ایک لڑکی آگئی۔ منالی نے اسے آرڈر دیا' اسی دوران ایک لڑکا تیزی سے چلتا ہوا آیا اور ان کے قریب آکر پھسل گیا۔ وہ شاپنگ مال کا ملازم تھا' گرتے گرتے وہ جسپال سے ٹکرا گیا تھا۔ تبھی جسپال کو محسوس ہوا کہ کوئی بھاری سی چیز اس کی گود میں آن پڑی ہے' لڑکا شرمندہ سا ہو کر اٹھ گیا' اور آگے چلا گیا۔ جسپال نے ٹٹول کر محسوس کیا' اس میں پسٹل تھا۔

"آگیا......" جسپال نے دیکھے بغیر منالی سے کہا۔

"دو پسٹل ہوں گے' اب اٹھو اور واش روم کی طرف چلو' وہیں جا کر چھپاتے ہیں۔" منالی نے کہا اور اٹھ گئی۔ وہاں جا کر تنہائی کے لیے انہیں چند منٹ لگے۔ جسپال نے تیزی سے پسٹل نکالے' ایک منالی کو دیا دوسرا خود کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ دو فاضل میگزین تھے جو ایک منالی کو دے دیا۔ جب وہ واش روم سے باہر نکلے تو واپس سیدھے اس اسنیکس کی دکان پر گئے' ان کا آرڈر آچکا تھا۔ انہوں نے وہ کھانا شروع کر دیا۔ نو بج چکے تھے' منالی نے اپنا فون میز پر رکھ لیا تھا' اچانک اس کا فون بجا تو منالی تیزی سے بولی۔

"جسپال ...... جسبیر آگیا ہے' اسے لابی تک تقریباً پانچ منٹ لگیں گے' تم پہنچو۔"

جسپال کو جیسے کرنٹ لگ گیا' وہ تیزی سے اٹھا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیوں والی لفٹ کی جانب بڑھا' ایک منٹ میں وہ دوسری منزل پر تھا' وہ پرسکون انداز میں لابی کی طرف بڑھنے لگا' راہداری میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ جس وقت وہ لابی تک پہنچا' اس نے پسٹل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا' عملے والے کمرے میں چند لوگ تھے' مگر وہ سکون سے کام میں مصروف تھے۔ اب کسی بھی لمحے لفٹ کا دروازہ کھلنے والا تھا اور وہ اس کے لفٹ ہوتا۔ وہ سائیڈ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوا' لفٹ رکی' دروازہ کھلا اور جسبیر آگے اور اس کے گارڈ پیچھے پیچھے باہر آگئے' جسپال نے پہلے ایک گارڈ کے سر پھر دوسرے گارڈ کا نشانہ لیا۔ دونوں ہی ڈکارتے ہوئے ڈھیر ہوگئے' حواس باختہ آنکھوں میں حیرت لیے پھٹی پھٹی نگاہوں سے وہ جسپال کو دیکھ رہا تھا' اس نے بمشکل کہا۔

"ک...... کک...... کون ہو تم......؟"

جسپال نے جواب نہیں دیا' بلکہ اس کے ماتھے پر پسٹل رکھ کر فائر کر دیا۔ یقیناً جسبیر کے بچنے کی امید نہیں تھی۔ لیکن جاتے جاتے اس نے ایک اور فائر کر دیا۔ جسپال جس راہداری سے آیا تھا' اس کی مخالف سمت راہداری میں بھاگ کھڑا ہوا۔ راہداری سے نکلتے ہی وہ نارمل ہوگیا اور سیڑھیوں کی لفٹ کی جانب بڑھا۔ تب تک سارے شاپنگ مال میں ہل چل مچ چکی تھی۔ اس نے ایک دم سے نیچے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ سیدھا بڑھا اور باہر والی دیوار میں لگا شیشہ توڑ دیا۔ وہ زمین سے تقریباً بارہ سے چودہ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہ شیشے کی دیوار میں سے باہر نکلا اور پھر اس دیوار کے ساتھ لٹکتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ جس وقت اس کے پاؤں زمین پر لگے اوپر سے فائر ہوا' وہ تیز رفتاری سے بھاگا۔ نجانے کہاں سے دو لڑکے نکل کر آئے وہ اوپر کی طرف فائر کرنے لگے۔ ایک دم سے گولیاں برسنے لگی تھیں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ شاپنگ مال سے سڑک کی طرف بھاگ رہے تھے۔ تقریباً دو منٹ میں وہ درخت کے نیچے کھڑی گاڑی تک پہنچ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ تھی' ان کے بیٹھتے ہی گاڑی چل دی۔ وہ سیکٹر سترہ سے نکل پڑے تھے۔ تقریباً دس منٹ کے وقفے میں وہ مارکیٹ پہنچ گئے۔ انہوں نے وہاں گاڑی کھڑی کی' وہ فائر کرنے والے لڑکے اتر کر ایک طرف چل دیئے' جسپال اور ڈرائیور ایک دوسری گاڑی میں بیٹھے اور چل پڑے۔ اس بار ڈرائیور کا انداز بہت پرسکون تھا۔

”اب کدھر نکلنا ہے؟“ جسپال نے اضطراری انداز میں پوچھا۔
”فی الحال ہم سپر ہائی وے پر جائیں گے تب تک میڈم کا فون آجائے گا۔“ ڈرائیور نے کہا اور پوری توجہ سڑک پر لگا دی۔ تبھی اچانک انہیں سڑک پر پولیس کی گاڑیاں تیزی سے جاتی ہوئی دکھائی دیں۔ جسپال چونک گیا کہ شہر میں ہلچل مچ گئی ہے۔ اس دوران منالی کا فون آ گیا۔
”جسپال! اگرچہ ہم نے مقصد تو حاصل کرلیا ہے مگر یہ ہماری غلط فہمی تھی کہ وہ لوگ محتاط نہیں ہوں گے۔“
”کیا ہوا؟“ وہ چونکا۔
”میں ابھی تک شاپنگ سینٹر میں پھنسی ہوئی ہوں۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ دیوار توڑ کر نکلے ورنہ دھر لیا جانا تھا۔ اب پولیس پورے شہر میں ناکہ بندی کرچکی ہوگی۔“
”ہوا کیا؟“ اس نے تیزی سے پوچھا۔
”مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے وہ لوگ تمہاری یہاں آمد کے بارے میں جانتے تھے۔ جالندھر اسٹیشن پر رابطہ نہیں کٹا، ہم نگاہوں میں تھے۔“ منالی نے کہا۔
”پھر تیرے لیے تو بہت مشکل ہوجائے گی۔ میں واپس آرہا ہوں۔“
”ہرگز نہیں، بلکہ فون ڈرائیور کو دو۔“ اس نے تیزی سے کہا، میں نے فون اسے دے دیا۔ وہ چند منٹ سنتا رہا، پھر فون بند کرکے جسپال کو دے دیا۔
”میڈم کہہ رہی ہے کہ جس قدر جلدی اس شہر سے نکل سکتا ہوں، نکل جاؤں، جیسے جیسے وقت گزرے گا یہاں سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجائے گا۔“
”تو پھر......؟“ اس نے پوچھا۔
”دیکھتے ہیں کدھر نکلتے ہیں؟“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کردی اور پھر ایک ذیلی سڑک پر ڈال لی جہاں سے کچھ آگے جاکر بسوں کا ایک اسٹاپ تھا، ڈرائیور نے گاڑی وہاں آگے روکی اور جسپال کو اشارہ کرکے نیچے اتر آیا۔ دونوں پیدل چلتے ہوئے واپس اسٹاپ پر آگئے۔
”چندی گڑھ سے اپنی سواری میں نکلنا بہت مشکل ہوجائے گا۔ ہر جگہ اپنی شناخت دینا پڑے گی۔ یہاں بس میں بیٹھ کر شہر سے نکلتے ہیں۔“
”اوکے!“ جسپال نے سمجھتے ہوئے کہا اور اسٹاپ پر آکر کھڑا ہوگیا۔ چند لمحوں بعد اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“
”اپنی دنیا کے لوگوں کا کیا نام ہوگا، آپ جو مرضی پکار لو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔
”پھر بھی یار! اب ہمارا ساتھ تو ہے نا......“
”رانا چرن، نام ہے میرا، اب آپ جو چاہو بلالو۔ اس نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ حالانکہ اس میں شرمندگی والی کوئی بات نہیں تھی۔
انہیں وہاں کھڑے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک طرف سے چند لوگ آکر کھڑے ہوگئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، تقریباً دس منٹ میں وہاں سات آٹھ سواریاں ہوگئیں۔ تبھی چندی گڑھ کی طرف سے بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ لوکل بس تھی اور جب وہ ان کے قریب آکر رکی تو رانا چرن نے تیزی سے کہا۔
”یہ بس سیسر تک جائے گی، قریب ہی شہر ہے چھوٹا سا۔“
”یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ کدھر جانا ہے۔“ جسپال نے الجھتے ہوئے کہا تو اسی تیزی سے بولا۔
”سیسر راجستھان میں ہے، وہاں پہنچتے ہی ادھر کی پولیس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ بس وہاں پہنچنے کی دیر ہے۔ جلدی بیٹھیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بالکل آخر میں سوار ہونے والی سواری کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں بس میں سوار ہوگئے، جس میں پہلے ہی سے بہت رش تھا۔ جسپال کو لگا جیسے وہ کہیں پنجرے میں پھنس گیا ہے، لیکن پولیس سے بچنے کے لیے یہ جائے پناہ اچھی تھی۔ اسے بیٹھنے کے لیے کہیں سیٹ دکھائی نہ دی تو وہ سکون سے کھڑا ہوگیا۔ وہ بیٹھ کر ہی منالی کو پیغام بھیج سکتا تھا۔

❀

حوالات کی سلاخوں کے پیچھے رات جیسے تیسے گزر گئی۔ میرے ساتھ جو تین بندے تھے، وہ ایک دن پہلے تک ایک دوسرے سے اجنبی تھے، شام تک وہ یوں ہوگئے تھے جیسے برسوں سے یارانہ ہو۔ تقریباً دو گھنٹے بعد میں ان کے ساتھ گھل مل گیا۔ انہیں تاش کھیلنے کے لیے چوتھے بندے کی ضرورت تھی، وہ میری صورت میں ان کے پاس آگیا تھا۔ حوالات کے مدقوق پیلے بلب کی روشنی میں رات گئے تک تاش کی بازیاں چلتی رہیں۔ پھر پتہ نہیں کب سوئے تھے کیونکہ صبح جب آنکھ کھلی تو روشنی ہر جانب پھیل چکی تھی۔ تھانے کا گیٹ کھلا تو بھیدہ میرے لیے ناشتہ لیے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے ہی سہیل تھا، میرے ساتھی حوالاتیوں نے جب تک کھانا کھایا، تب تک میں نے بھی ناشتہ کیا پھر بھیدے سمیت سہیل سے کی باتیں کرتا رہا۔ بھیدہ سہیل کی وجہ سے پہلے جھجکتا رہا تھا پھر جب وہ پہچان گیا کہ وہ بھی جگری دوست ہے تو اس نے مجھے چھاکے کا پیغام دیا۔
”وہ نا چھاکے نے ایک اڑتی اڑتی خبر سنی ہے، وہ تمہیں بتانا تھی۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔
”کیا ہے خبر؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔
”ڈی ایس پی سے معاہدہ تو یہی ہوا ہے نا کہ آج تم عدالت میں پیش ہوگے تو تمہاری ضمانت ہوجائے گی، پیرزادہ وقاص تمہاری ضمانت دے گا، ریمانڈ نہیں ہوگا۔“
”ہے تو ایسی ہی......“ میں نے کہا۔
”لیکن راتوں رات ڈی ایس پی تبدیل ہوگیا ہے۔ نیا جو ہے وہ شاہ زیب کے ہاتھ کا بندہ ہے اس سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ وہ کیا کرے۔“ بھیدے نے تو مجھے چونکا دیا۔
”اگر ایسا ہوگیا تو معاملہ بہت خراب ہوجائے گا۔ یہ جو نیا ڈی ایس پی آیا ہے اور شاہ زیب کا بندہ ہے۔ اسے ایویں ہی راتوں رات تبدیل نہیں کروایا گیا۔ اب اتنی کوشش کرکے جو اسے یہاں لگوایا ہے تو ---“ میں نے تشویش زدہ لہجے میں کہا تو سہیل نے سوچتے ہوئے کہا۔
”اب یہ دیکھ لو شاہ زیب نے بڑے وقت پر پتہ کھیلا ہے۔ پہلے وہ ریمانڈ کے چکر میں تمہیں ادھ موا کریں گے، پتہ نہیں کیا کیا جرم تیرے گلے میں ڈالیں گے، اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہوجائے گا، جب تم جج کے سامنے پیش ہوگے، بس دو چار گھنٹے ہی ہیں، ابھی سب پتہ چل جائے گا۔“
”مطلب پیرزادہ وقاص کوشش کرے گا، لیکن یہ کوشش پوری نہیں ہوگی۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا، پھر دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”اب کیا کیا جائے، قسمت ہی میں ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی، برداشت کریں گے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“
”تو فکر نہ کر، میں تم سے پہلے عدالت میں ہوں گا، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔“ سہیل نے مجھے تسلی دی، جو

بہرحال دل کو تسلی دینے والی بات تھی۔ اصل معاملہ تو تب کھلنا تھا جب میں جج کے سامنے پیش ہوتا۔ ابھی تک تو قیاس آرائیاں ہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں برتن لے کر واپس چلے گئے میں آئندہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا؟

تقریباً سات بجے کے قریب قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی تھانے کے اندر آگئی۔ ہم چاروں ہی تھے۔ ہمارے ساتھ پانچ کانسٹیبل اور انسپکٹر منیر باجوہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور میں ذہنی طور پر تیار ہوگیا کہ مجھے واپس پلٹ کر اسی حوالات میں آنا ہے، میں قصبے کی حوالات میں تھا اور نزدیک ترین شہر، جس میں سیشن جج بیٹھتا تھا وہ تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ جس سڑک پر ہم نے سفر کرنا تھا' اس کے دائیں طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے اور بائیں جانب ریلوے ٹریک، جس کے آگے جنوب تک چولستان کا وسیع و عریض علاقہ تھا۔ موسم خاصا گرم ہو چکا تھا۔ قصبے سے نکلتے ہی ایک حوالاتی نے کان پر ہاتھ رکھ کر ماہیا گانا شروع کردیا۔ جس سے میں ان سوچوں سے باہر نکل آیا کہ مجھ پر کیا کیا الزامات لگائے جائیں گے جس کی وجہ سے میری ضمانت نہیں ہو پائے گی۔ ویسے بھی یہ خام خیالی ہی تھی کہ قتل کے ملزم کو فوراً ضمانت پر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ وہ ماہیا گاتا رہا اور دوسرے اس سے محظوظ ہوتے رہے لیکن میں اپنی ہی سوچوں کی بھول بھلیوں میں کھویا رہا۔ مجھے تھانے اور کچہری کی دشوار گزار اور تھکا دینے والی راہوں سے گزرنا ہوگا۔ میں دراصل ان سے نہیں گھبراتا تھا' میں صرف ان سازشوں سے ڈرتا تھا کہ پتہ نہیں کب اور کس وقت ماورائے عدالت میرے لیے کوئی حکم جاری ہو جائے۔ اصل میں ہمارے ملک کا جو تفتیشی نظام ہے یا پھر جزا و سزا کے لیے فیصلے کیے جاتے ہیں' اس میں اس قدر لچک ہے کہ سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ کیا جاسکتا ہے۔ سفید چمڑی والے جو نظام چھوڑ کر گئے تھے' کالے انگریزوں نے اس کو اب تک مسلط رکھا ہوا ہے' جس میں انسانی تذلیل زیادہ ہے۔ انہی سوچوں میں الجھتے ڈوبتے ہم ضلعی عدالت میں جا پہنچے۔ ہمیں کوتوالی میں رکھا گیا۔ ہم اس انتظار میں تھے کہ ہمیں آواز پڑے اور ہم جج کے سامنے پیش ہوں۔ نیا ڈی ایس پی اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ اور اسے آنے کی ضرورت بھی نہیں تھی' منیر باجوہ ہی کافی تھا کچھ دیر بعد وہ گھوم کر میرے سر پر آن کھڑا ہوا' کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا' پھر طنزیہ لہجے میں بولا۔

"بہت مان تھا نا تجھے خود پر' دیکھ یہاں عدالت میں تیرے لیے کوئی بھی نہیں آیا' بڑا پیرزادہ پیرزادہ کرتا تھا' وہ اب نہیں آئے گا۔"

"چلو نہیں آتا تو نہ آئے' وہ کون سا میرے مامے کا پتر ہے۔" میں نے تنک کر کہا۔

"وہ تیرے مامے کا پتر بن بھی نہیں سکتا' کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگوا تیلی' جاگیرداروں کے یار جاگیردار ہی ہوتے ہیں۔ رات اس نے شاہ زیب سے سودے بازی کرلی ہے' تجھے اس نے ایک مہرے کے طور پر استعمال کرکے پھینک دیا۔" اس نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے نفرت سے سر کو جھٹکا۔

"چل میں تو مہرہ کی طرح استعمال ہوگیا' تو ان کی خدمت داری نوکروں کی طرح کر رہا ہے یا وفاداری......" میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کو سمجھ کر ٹوکتے ہوئے بولا۔

"بکواس نہ کراوئے' میں افضل رندھاوا نہیں' جو تیرے ساتھ یاری نبھاتے ہوئے معطل ہو کر بیٹھا ہے' میں منیر باجوہ ہوں' جانتا ہوں کس بندے کو کس طرح انگلی پر نچایا جاتا ہے۔"

"جب تک تیرا ڈی ایس پی نہیں بدلا تھا' اس وقت تک تو کس کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا؟" اس بار میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اوئے بات سن اوئے' میں نے تھانیدار ہی رہنا ہے' شاہ زیب نے ایم این اے بن جانا ہے اور پیرزادے کا معاہدہ ہوا ہے کہ وہ ایم پی اے بنے گا لیکن تیرے جیسے حوالات میں ریمانڈ پر مار کھاتے ہیں اور پھر جیلوں میں سڑتے ہیں۔ تو ضمانت کے خواب نہ دیکھ' کم از کم چودہ دن کا ریمانڈ میں نے لینا ہے اور تیری ساری اکڑ نکالنی ہے۔ یہ خواہش میں بڑے دنوں سے اپنے دل میں لیے پھرتا ہوں۔"

"یار! تو نے جو کرنا ہے کرلینا' عورتوں کی طرح دھمکیاں کیوں دے رہا ہے۔ ویسے کتنے قتل ڈالنے کو کہا ہے شاہ زیب نے اور اس کے لیے کتنی رقم دی ہے؟" میں نے اسے چڑانے کے لیے کہہ دیا۔

"یہ تو تجھے جج صاحب کے سامنے جا کر معلوم ہوگا نا' کیا ہوتا ہے تیرے ساتھ اور پھر چودہ دن تو میرے ہاتھوں میں ہے۔" اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ نجانے کیوں اس وقت مجھے انسانی نفسیات بڑی عجیب سی لگی' بزدل' گھٹیا اور منافق انسان ہمیشہ اس وقت کھلتا ہے جب سامنے والا انسان اسے بے بس دکھائی دے۔ میں جو خود کو اس قانونی عمل سے گزارنے کے لیے خود کو پیش کر چکا تھا' اور میرے ذہن کے کسی کونے میں یہ بھی تھا کہ اگر سردار شاہ دین کا قتل مجھ پر ثابت بھی ہو جاتا ہے تو میں جیل بھگتنے کے لیے تیار تھا۔ میں اتنا تو جانتا تھا کہ پھانسی تک لے جانے والے ثبوت ان کے پاس نہیں ہوں گے' لیکن ابھی کچھ بھی نہیں ہوا تھا اور منیر باجوہ اپنے دل کی ناجائز خواہش مجھے بتا رہا تھا۔ ایک بار تو میرے دل میں اٹھی کہ یہاں سے بھاگ جاؤں' میں نے اپنے طور پر جائزہ لے لیا تھا کہ چاہے میں ہتھکڑی میں ہوں ان کے چنگل سے نکل کر بھاگ سکتا ہوں۔ مگر یہ جلد بازی تھی' میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ مجھے کس طرح پھنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوپہر سے ذرا پہلے ہمیں آواز پڑی تو منیر باجوہ مجھے ہتھکڑی سمیت عدالت میں لے گیا۔ میں حیران تھا اور کسی حد تک مجھے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ پیرزادہ وقاص وعدہ کرنے کے باوجود بھی عدالت نہیں آیا تھا۔ چلو وہ نہ آتا تو کم از کم اس کا کوئی وکیل ہی ہوتا۔ تھوڑی بہت کوشش تو ہوتی' مگر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میں اکیلا تھا' نور نگر کے یا اس علاقے میں سے کوئی بندہ وہاں موجود نہیں تھا جن لوگوں نے معاہدے کے ساتھ میری گرفتاری دلوائی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اب میری قسمت مجھے کہاں لیے جا رہی ہے' سو میں نے اپنے آپ کو قسمت اور حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

میں جب عدالت سے باہر آیا تو اس وقت میں انتہائی خطرناک مجرم تھا۔ مجھ پر سردار شاہ دین کے قتل سے لے کر کئی دوسرے قتل بھی تھے۔ شاہ زیب نے بڑی اچھی پلاننگ کی تھی۔ ایسے وقت پر پیرزادہ وقاص سے سمجھوتہ کرلیا تھا جب مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ اس دوران جو ثبوت پیش کیے گئے وہ سبھی "ریڈی میڈ" تھے۔ ضمانت تو اب کیا ہونی تھی' اب تو مقدمہ ہی چلنا تھا۔ نجانے کب تک حوالات مقدر میں تھی اور

پھر جیل کی زندگی، پھانسی ہوتی یا عمر قید، جو بھی تھا، اس فیصلہ کے انتظار میں کتنا وقت بیت جانا تھا۔ اس دوران رہائی کی امید تو کی جاسکتی تھی لیکن نصیب میں رہائی کے لیے مجھے جنگ لڑنا تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ اب یہ پیسے اور تعلقات کا کھیل ہے۔ مہنگا وکیل اور ریڈی میڈ گواہوں کے بل بوتے پر مقدمے کا رخ کہیں سے کہیں کیا جاسکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے مجھ پر مایوسی چھا گئی تھی، لیکن اگلے ہی لمحے نجانے کیوں مجھے اماں کی دعاؤں پر بھروسے کا خیال آ گیا تو میرے اندر ایک دم سے حوصلہ بھر گیا۔ کیا ہوا جو وقتی طور پر منافقین جیت گئے ہیں، مجھے بہر حال ان سے لڑنا ہے اور اس وقت تک لڑنا ہے جب تک میری آخری سانس ہے۔ اس جنگ کی نوعیت کسی قسم کی بھی ہو اور میدان جنگ کیسا بھی ہو۔ عدالت کی غلام گردشوں سے نکل کر قیدیوں کی گاڑی تک آتے ہوئے مایوسی کا دریا پار کر گیا تھا اور اب میں حوصلے کے میدان میں تھا۔ میرے ساتھ تینوں حوالاتی تھے۔ وہ بھی آ گئے تو ہمیں گاڑی میں سوار کرایا گیا۔ انسپکٹر منیر باجوہ ہمیں اپنی نگرانی میں سوار کرا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ مجھے بے چین کر رہی تھی۔ جس وقت میں نے گاڑی میں داخل ہونے کے لیے قدم اٹھایا تو اس نے انتہائی حقارت سے کہا۔

''او چل جلدی کر بیٹھ، واپس چل کر تیرے اندر سے بدمعاشی کو نکالنا ہے، دیکھتے ہیں تو میری خاطر تواضع کس قدر برداشت کرتا ہے۔''

میں ایک دم سے بھنا گیا۔ مگر اس وقت مجھے خود پر قابو پانا ہی تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ گھٹیا لوگ ہوتے ہیں جو کسی کو گھیر کر بڑھکیں مارتے ہیں، میں اس وقت اکیلا تھا، میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی اور میں نہتا تھا۔ وہ مجھے غصہ ہی اس لیے دلا رہا تھا کہ میں کوئی ایسا کروں کہ وہ میرے جرائم کی فائل میں ایک نئے ورق کا اضافہ کر دے۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ میں نے خود پر قابو پایا اور گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ان تینوں حوالاتیوں کے ملنے والے آئے تھے، وہ انہیں کافی کچھ کھانے پینے کو دے گئے تھے جبکہ میرے لیے کوئی نہیں آیا تھا انہوں نے مجھے کافی کچھ کھانے پینے کو دیا۔ میں نے سب طرف سے ذہن کو جھٹک کر کھانے پینے کی طرف توجہ کر دی جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہنا ہے، بھوکا تو نہ رہا جائے۔ دوپہر کے بعد ہم وہاں سے چل دیئے۔ اچھی خاصی دھوپ تھی اور موسم صاف تھا۔

اس وقت ہمیں سفر کرتے ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ ہم شہر اور قصبے کے درمیان میں تھے جب ہماری گاڑی آہستہ ہوئی۔ ٹریفک کے دوران ایسا ہوتا ہے کہ کبھی تیز اور کبھی آہستہ ڈرائیونگ کی جاتی ہے میں یہی سمجھا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ بلکہ جان بوجھ کر اس کے آگے ایک ایسی گاڑی لائی گئی تھی کہ گاڑی کو آہستہ ہو جانے پر مجبور کیا جائے۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا۔ تبھی اچانک ایک فائر ہوا اور قیدیوں والی گاڑی کا پچھلا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔ گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دم سے شدید فائرنگ ہونے لگی، جو تقریباً آدھے منٹ تک رہی، پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ ان تینوں حوالاتیوں سمیت میں بھی جالی میں سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اچانک میری نگاہ جانی شوکر پر پڑی، اگرچہ اس نے چہرے کو کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا لیکن میری نگاہوں سے تو وہ نہیں چھپ سکتا تھا۔ میرے بدن میں بجلی کی

ہر دوڑ گئی۔ میں تڑپ کر باہر جانے والے راستے پر آ گیا۔ وہ دس بارہ لوگ تھے اور ان میں سب سے آگے چھاکا کھڑا تھا جو سپاہیوں سے کہہ رہا تھا۔

''ہماری تم لوگوں سے دشمنی نہیں ہے، جو ہتھیار پھینک کر ایک طرف ہو جائے گا، اسے کچھ نہیں کہیں گے فوراً ہٹ جاؤ۔''

انہوں نے گاڑی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔ میں باہر نکلا لیکن میرے ساتھ والے حوالاتی باہر نہیں آئے، وہ وہیں دبکے بیٹھے رہے۔ میں تیزی سے باہر نکلا اور چھاکے کے پاس جا پہنچا، اس نے کوئی بات کیے بغیر پسٹل مجھے دے دیا تو ایک طرح کی قوت میرے اندر بھر گئی۔

''چل نکلتے ہیں۔'' چھاکے نے کہا تو میں نے منیر باجوہ کی طرف دیکھتے ہوئے چھاکے سے کہا۔

''ذرا ٹھہرو، تھوڑا ادھار چکا لوں۔''

''تم نکل جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہتا۔'' وہ مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

''تو کچھ نہ کہہ لیکن مجھے تو کچھ کہنا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے بولٹ مارا اور اس کی ران پر نال رکھ کر فائر کر دیا۔ وہ دھم سے زمین پر گر گیا۔ میں نے دوسرا فائر اس کی دوسری ران میں کیا تو وہ تڑپنے کے ساتھ اونچی آواز میں چیخنے لگا۔ تب میں اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا ''میں تجھے ماروں گا نہیں کیونکہ زندہ رہے گا تو دوبارہ ملاقات ہو گی۔''

میں انہیں ویسے ہی چھوڑ کر چھاکے کے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔ انہوں نے دو کاریں اور موٹر سائیکل لے کر یہ کارروائی کی تھی۔ ہم نے وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا، بلکہ وہاں سے نکلتے چلے گئے۔

''مجھے رات ہی معلوم ہو گیا تھا ان کی خباثت کا اس لیے میں نے سوچا کہ جب وہ پوری طرح اپنی خباثت دکھا لیں تو میں ایسا کروں۔'' چھاکے نے مجھے بتایا

''ہم واپسی نور نگر تو نہیں جاسکیں گے۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''نہیں، تجھے سوہنی کے پاس بھیج دینا ہے، تو چند دن وہاں رہ کر سکون کر، پھر دیکھتے ہیں۔'' چھاکے نے یوں کہا جیسے وہ پہلے ہی سوچ چکا ہو، میں خاموش ہو گیا۔ ہمیں سفر کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ اچانک ہم پر فائر ہونا شروع ہو گئے، اس افتاد پر ہم چونک گئے کہ یہ کون ہے، پولیس والے اتنی جلدی ہمارے پیچھے نہیں آسکتے تھے، میں نے گھوم کر دیکھا، ہمارے پیچھے فور وہیل جیپیں تھیں۔ ایک فور وہیل کی چھت سے سر نکالے ایک بندہ فائر کر رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' چھاکے نے تذبذب میں کہا۔ اب کس کو کیا معلوم کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔ جانی شوکر اگلی گاڑی میں تھا اور موٹر سائیکل اس سے آگے۔ اچانک ہماری کار کا ٹائر برسٹ ہو گیا، اور کار ہچکولے کھانے لگی۔ اس کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ ڈرائیور نے بہت مشکل سے اسے قابو میں کیا لیکن پھر بھی وہ ایک کیکر کے درخت میں جا لگی۔ اچانک ہی سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ خود کو بحفاظت پا کر میں تیزی سے باہر نکلا تب تک جانی شوکر اور اس کے ساتھی حملہ آوروں کی فائرنگ کا جواب دینے لگ گئے تھے۔ وہ سڑک میدان جنگ بن گئی تھی۔ میری پشت پر ریلوے لائن تھی۔

فور وہیل گاڑیاں وہ پار نہیں کرسکتی تھیں۔ اس لیے میں نے چھلانگ ماری اور ریلوے ٹریک کے دوسری

طرف چلا گیا۔ وہاں تپتی ہوئی زمین پر لیٹ کر میں نے چھت سے سر نکالے حملہ آور پر فائر کر دیا۔ گولی اس کے سر میں لگی تھی اور وہ لڑھکتا ہوا گاڑی میں غائب ہو گیا۔ ایسا ہی میں نے پچھلی گاڑی والے کے ساتھ کیا۔ وہ بھی لڑکھڑاتے ہوئے گاڑی کے اندر غائب ہو گیا۔ میں نے دیکھا' چھاکا اور ڈرائیور بھاگ کر جانی شو کر والی گاڑی میں چلے گئے ہیں۔ وہ ایک سمت سے شدید فائرنگ کرنے لگے تو حملہ آور کی طرف سے بھی اس طرح کی شدت ہونے لگی۔ میرے میگزین میں چند گولیاں تھیں' جنہیں میں حکمت عملی ہی سے استعمال کر سکتا تھا۔ میں شست لیے لیٹا ہوا تھا کہ کوئی میری رینج میں آئے۔ میں کسی طرح بھی چھاکے وغیرہ کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ میرے ذہن میں یہی خیال آ رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اس فائرنگ میں کمی ہو تو پتہ چلے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں؟ بلاشبہ ان کا تعلق ہمارے انہی دشمنوں سے تھا جو مجھے گھیر کر مارنا چاہتے تھے اور وہ شاہ زیب کے علاوہ کون ہو سکتا ہے۔ میں نے شست لے کر چار گولیاں اس طرح چلائیں کہ ان کی گاڑیوں کے دو دو ٹائر برسٹ کر دیئے۔ ان کی گاڑیاں ناکارہ ہو گئی تھیں اور وہ وقتی طور پر پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ اچانک میری نگاہ سڑک پر دور سے آتی ہوئی پولیس گاڑیوں پر پڑی' ممکن ہے۔ وہ انہی کی اطلاع پر آئی ہوں یا منیر باجوہ وغیرہ کے' وہ کسی نزدیکی تھانے سے تھیں یا کیا تھا' بہرحال پولیس کی گاڑیاں دندناتی ہوئی آ رہی تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ وہ حملہ آوروں کی سمت کی طرف سے آ رہی تھیں۔ عقل مندی کا تقاضا تو یہی تھا کہ چھاکا لوگ وہاں سے بھاگ جائیں' ورنہ جو لاشیں گرتی سو گرتیں' باقی گرفتار ہو جاتے' اور انہوں نے یہی عقل مندی کی وہ فائرنگ کرنا چھوڑ کر ایک دم سے سرپٹ بھاگ نکلے۔ اب میرا وہاں بیٹھے رہنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ میں جنوب کی طرف نشیب میں اُترا اور تقریباً بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا۔ میرے سامنے دور تک ریتلی زمین تھی جس میں جابجا جھاڑیاں تھیں۔ میں اس پر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ مجھے جھاڑیوں کا جھنڈ سا دکھائی دیا۔ میں اس میں ستانے اور سانس لینے کے لیے چھپ کر بیٹھ گیا۔ مجھے جب ذرا سا ہوش آیا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میں تقریباً کلومیٹر سے زیادہ سفر طے کر آیا تھا اور کچھ لوگ ریلوے ٹریک پر پھر رہے تھے۔ دور دور تک وہاں ریتلی زمین تھی جس میں چھوٹی بڑی جھاڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا، میں دہاں دبک کر بیٹھا رہا اور ان لوگوں کو دیکھتا رہا' کچھ دیر بعد وہ وہاں دکھائی نہیں دیئے لیکن میں نے رسک نہیں لیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میری طرح بھی کہیں چھپے اس تاک میں تو نہیں کہ اگر میں یہاں ہوں تو باہر نکلوں گا۔ مگر شام تک کچھ ایسا نہیں ہوا۔

سورج مغرب کی آغوش میں ڈوبنے کو بے تاب تھا کہ میں وہاں سے نکلا۔ میں بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ مجھے کسی بستی کی تلاش تھی۔ وہاں سے میں کوئی نہ کوئی مدد لے سکتا تھا۔ پھر میں یہ سوچنے لگا کہ انہیں کیا جھوٹ سچ کہہ کر مطمئن کروں گا کہ وہ میری مدد کرنے کو تیار ہو جائیں۔ مجھے بہرحال کسی بستی کو تلاش کرنا تھا اس لیے چلتا گیا۔ اس وقت میرے حواس قابو میں آنے لگے، جب میں نے کچھ دور ایک بستی کے آثار دیکھے۔ میں تیزی سے اس طرف بڑھ گیا۔

اس وقت اندھیرا چھا چکا تھا' جب میں اس بستی کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے دیکھا' گاؤں کے ایک طرف لکڑیاں گاڑ کر اور جھاڑیوں کی مدد سے دائرے کی صورت میں باڑ لگائی ہوئی تھی۔ اس میں گائیں اور کچھ اونٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے ذرا ہٹ کر بستی تھی۔ ان مویشیوں کے پاس کوئی نہ کوئی بندہ ضرور ہوگا' یہی سوچ کر میں اس جانب بڑھ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک نوجوان سا لڑکا دھوتی باندھے اوپری جسم سے ننگا تیزی سے مویشیوں کے سامنے چارہ رکھ رہا تھا۔ اس سے ذرا دور ایک دوسرا شخص گائے کا دودھ دوھ رہا تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ تبھی چارہ ڈالنے والے کی نگاہ مجھ پر پڑی تو وہ ٹھٹک کر میری جانب دیکھنے لگا' پھر اونچی آواز میں پوچھا۔

"کون جوان ہے تو......؟"

"میں مسافر ہوں' کچھ دیر آپ لوگوں کے پاس ٹھہرنا چاہتا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' آ جاؤ' پر دھیان سے تمہارے راستے میں کتا بندھا ہوا ہے۔" اس نے کہا' تو میں کتے سے بچ کر آگے بڑھا' وہ کتا بھی کوئی بلا چیز تھا' کافی بڑا منہ تھا اس کا اور اچھا خاصا قد' لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ ایک اجنبی کو قریب پا کر وہ ذرا بھی نہیں بھونکا تھا۔ یہی سوال جب میں نے اس نوجوان سے کیا تو وہ بولا۔ "ابھی بندھا ہوا ہے اور ہم ارد گرد پھر رہے ہیں' اس لیے یہ خاموش ہے۔ کتے بھی نسلی ہوتے ہیں۔ بھرتو بیٹھ......" اس نے ایک چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اس پر بیٹھ گیا تو چند منٹ بعد پانی لے کر میرے پاس آ گیا۔ دوسرا آدمی آرام سے دودھ دھوتا رہا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا تو اس نے مجھ سے پوچھا۔ "کھانا کھائے گا؟"

"اگر زحمت نہ ہو تو کھلا دو' میں بہرحال آپ سے مدد چاہوں گا کہ کسی نہ کسی طرح مجھے میرے قصبے پہنچا دو۔"

"کون سی جگہ ہے تو......؟" اس نے سمجھنا چاہا تو میں نے اسے سمجھا دیا۔ تبھی وہ بولا۔ "وہ تو یہاں سے کافی دور ہے......"

"چلو آپ مجھے کسی نہ کسی طرح سڑک تک پہنچا دو' جس طرف سے میں آیا ہوں۔" میں نے التجائیہ انداز میں کہا تو اس وقت وہ بندہ جو دودھ دوھ رہا تھا' اٹھتے ہوئے بولا۔

"یار ابھی تو آیا ہے' ذرا سا سانس لے' کھانا وانا کھا' پھر پہنچا دیتے ہیں۔ اتنی جلدی کیا ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے پرسکون ہوتے ہوئے کہا۔ میں کافی حد تک تھک چکا تھا لیکن ان کا دوستانہ رویہ دیکھ کر میری ساری تھکن جاتی رہی تھی۔ تبھی مجھے ایک دم سے احساس ہوا کہ میرے پاس پسٹل ہے' کہیں اسی وجہ سے یہ متنفر نہ ہو جائیں۔ تب میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "بھائی......! یہ میرے پاس اکلوتا ہتھیار ہے' چاہو تو آپ اسے اپنے قبضے میں لے سکتے ہو۔" یہ کہہ کر میں نے پسٹل نکال کر چارپائی پر رکھ دیا۔

"تو اس کا مطلب ہے تو کوئی شریف آدمی نہیں ہے' خیر......! تو اب اگر ہمارا مہمان بن ہی گیا ہے تو رکھ اسے اپنے پاس' تیرے لیے روٹی لاتے ہیں تو پھر بات کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دونوں وہاں سے نکلتے چلے گئے۔ میں حیران تھا کہ انہوں نے اتنی جلدی مجھ پر اعتماد کر لیا تھا۔ مگر میری یہ خام خیالی تھی' اس کا مجھے بہت بعد میں احساس ہوا۔ اس وقت میں اس بات پر حیران تھا اور سیدھا ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا مجھے بہت

سکون محسوس ہوا۔ اس لیے لیٹتے ہی میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں چنگیر اور برتن پکڑے کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں پانی تھا' اس نے میرا منہ ہاتھ دھلوایا اور پھر کھانا میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے سیر ہو کر کھایا۔ اس دوران وہ مجھ سے پوچھتے رہے کہ میں کون ہوں؟ اور کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے انہیں ساری بات سچ بتا دی۔

"دیکھ میرے بھائی......! جو تو نے کہا ہے اگر یہ سچ ہے تو پھر تو رات یہیں رہ' صبح میں خود تجھے سڑک پر چھوڑ آؤں گا' لیکن اگر تو نے جھوٹ بھی بولا ہے تو ہمیں کوئی نقصان نہیں۔ صبح تجھے سڑک تک پہنچا ہی دیں گے اس لیے کہ تو اب ہمارا مہمان ہے۔" بڑے بھائی نے کہا جو دودھ دھو رہا تھا۔

"میں نے پہلے سوچا تھا کہ آپ لوگوں سے جھوٹ سچ کہہ دوں گا' لیکن سچ بولنے کا حرج بھی کوئی نہیں ہے۔ اب جو چاہو' آپ لوگ میرے ساتھ سلوک کر سکتے ہو۔"

"ہم ان ویرانوں میں یونہی نہیں بیٹھے' ورنہ ہم روز لٹ جاتے' تیری طرح کوئی آتا اور پسٹل دکھا کر ہمارا مال ہم سے چھین کر لے جائے۔ ہم اپنا بندوبست رکھتے ہیں۔ تم ہماری بستی میں اپنی مرضی سے آ گئے ہو لیکن یہاں سے جاؤ گے ہماری مرضی سے۔ خیر......! اگر تجھے جانے کی اتنی جلدی نہ ہو تو کل دوپہر کے وقت تجھے تیرے قصبے تک پہنچا سکتے ہیں۔" ان میں سے بڑے نے کہا۔

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں گاڑی آتی ہے دودھ لینے کے لیے' وہ جب واپس جائے گی تو اس میں تجھے بٹھا دیں گے' وہ اس قصبے میں جاتی ہے۔" بڑے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جیسے آپ لوگوں کی مرضی' آپ کا اتنا بڑا احسان ہے کہ آپ نے رات یہاں ٹھہرنے دیا۔ ویسے میں پیدل بھی واپس چلا جاؤں گا۔" میں مایوسانہ انداز میں بولا۔

"نہیں یار' تجھے سڑک تک چھوڑ دیں گے۔" ان میں سے چھوٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔ تبھی ذرا فاصلے پر بنی جھونپڑی کی چھت پر سے ایک بندہ اتر آیا۔ وہ ان کا تیسرا بھائی تھا' اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اترا تو چھوٹا وہی گن لے کر اوپر چلا گیا۔ مجھے ان کی خود اعتمادی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ میں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا تھا۔ اس لیے مجھے لیٹتے ہوئے پھر نیند آ گئی لیکن یہ نیند بڑی کچی تھی' کچھ دیر بعد یونہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا جیسے بے چینی اندر بھر گئی ہو۔ ممکن ہے اجنبی جگہ ہونے کے باعث ایسا ہو رہا ہو یا شاید کچھ دیر پہلے جو تھوڑی سی نیند لی تھی اس باعث ہو۔ بہرحال میں کچی پکی نیند میں پڑا رہا۔

رات کا نجانے وہ کون سا پہر تھا' جب مجھے لگا کہ ماحول روشنی سے نہا گیا ہے۔ ایک لمحے کو تو یوں لگا جیسے دن چڑھ آیا ہے مگر جیسے ہی میں اپنے حواسوں میں آیا تو مجھے سمجھ آئی' کسی گاڑی کی تیز روشنی باڑے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کتا بڑے الرٹ انداز میں ان کی طرف دیکھ کر یوں کھڑا تھا جیسے ابھی جھپٹنے کے لیے چھلانگ لگا دے گا۔ ایسی ہی ایک فور وہیل دوسری طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ میں ابھی صورتحال سمجھ ہی رہا تھا کہ بڑا بھائی تیزی سے باڑے میں آیا اور مجھ سے بولا۔

"یار! تو نے جو کہا وہ سچ ہے' اس کی تصدیق ہو گئی ہے۔ ایسے سچے بندے کا ہر طرح سے ساتھ دینا چاہیے لیکن کیا کروں' ہماری ہی بستی کے ایک بندے

نے اپنے بھولپن کی وجہ سے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے' اور میں نے ان سے جھوٹ بول دیا ہے کہ تم آئے تھے لیکن شام ہی کے وقت تم چلے گئے تھے۔ میں جانتا ہوں وہ تصدیق کیے بغیر نہیں ٹلیں گے۔ اس لیے تم نکل جاؤ یہاں سے۔"

"نکل جاؤں......؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ پھر میں نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "مگر وہ ہیں کون؟"

"وہ شاہ زیب ہی کے لوگ ہیں' انہوں نے ہی حملہ کیا تھا' وہی اپنے ساتھ پولیس لگا کر لائے تھے۔ اس وقت اگر وہ یہاں آئے ہیں تو ہمارے علاقے کے بڑے زمیندار پیر سائیں کے بندوں کو ساتھ لائے ہیں۔ ہم پیر سائیں کو انکار نہیں کر سکتے۔ ہم تمہیں چھپا بھی نہیں سکتے کہ پھر بعد میں شکوہ آئے گا...... تم نکل جاؤ۔" اس نے یوں کہا جیسے ابھی رو دینے کو ہو۔

"اگر ہم پیر سائیں کے پاس چلے جائیں تو......" میں نے یونہی ایک خیال کے تحت کہا۔

"وہ تجھے پکڑ کر شاہ زیب کو دے دے گا' کیونکہ وہ تم سے پہلے ان کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ تُو دیر نہ کر اور نکل جا' زندگی رہی تو صبح تک تجھے کوئی نہ کوئی بستی مل جائے گی۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے پسٹل اٹھا کر اڑسا' جوتے پہنے اور اس طرف چل دیا جدھر بڑے بھائی نے اشارہ کیا تھا۔ وہاں باڑ میں سے ایک چھوٹا سا راستہ تھا۔ اس طرف اندھیرا تھا۔ میں اس طرف ہی سے نکلا تھا کہ کافی سارے لوگ باڑ کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں خاموشی سے دبک کر بیٹھ گیا۔ بلاشبہ انہیں یقین نہ آیا ہوا اور وہ تصدیق کرنے باڑے کی طرف آ گئے تھے۔ اس لمحے بڑا بھائی تیزی سے جھونپڑی میں چھپ گیا۔ اب میرا وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا' اپنی ہمت مجتمع کی اور جدھر میرا منہ ہوا ادھر چل پڑا۔ میں نے اپنے تئیں سڑک کی طرف جانے والے راستے ہی کو اپنایا تھا' میں تیز تیز قدموں سے چلتا چلا گیا۔ راستے میں جھاڑیاں ہیولوں کی مانند لگ رہی تھیں۔ اگرچہ میں سمجھتا تھا کہ انسانی ذہن جب خوف زدہ ہو تو وہ اپنے ہی بنائے ہوئے ہیولوں سے ڈرتا رہتا ہے۔ میرا ابھی کچھ ایسا حال تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے ابھی کسی جھاڑی کی اوٹ سے کوئی بندہ برآمد ہوگا اور مجھ پر جھپٹ پڑے گا' اس کے علاوہ مجھے صحرائی جانوروں سے بھی محتاط رہنا تھا' میں بڑھتا چلا جا رہا تھا' چاندنی رات ہوتی تو شاید میں اتنا نہیں گھبراتا' لیکن موت کا خوف اور زندگی بچانے کا حوصلہ مجھے آگے ہی آگے بڑھائے لیے جا رہا تھا۔

نجانے میں نے کتنا سفر کیا تھا۔ میرے حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے' اور زبان خشک ہو چکی تھی۔ مشرق کی جانب سے صبح کی سرخی نمودار ہو گئی تھی اور میری ٹانگیں تھکن کی وجہ سے جواب دے رہی تھیں۔ اندھیرا ہونے کے باعث مجھے کوئی بستی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں رکنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں رکا تو شاید میں گرتے ہی بے ہوش ہو جاؤں گا۔ میں بے تابی سے سورج کے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی میں کبھی بھی مجھے سورج دیکھنے کی اتنی بے تابی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ کو سنبھالتا ہوا چلتا چلا جا رہا تھا۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے

میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی ختم ہو رہی ہے۔ دھند لکا سا پھیل رہا تھا۔ اردگرد کا منظر تھوڑا واضح ہونے لگا تو مجھے ایک اونچا ٹیلا دکھائی دیا۔ میں اس پر چڑھنے لگا' تاکہ دور دور تک دیکھ سکوں کہ کوئی بستی ہے یا پھر کوئی زندگی کے آثار ہیں تو میں اس طرف جا سکوں۔ میں ٹیلے پر چڑھ گیا۔ اس وقت مجھے سخت مایوسی ہوئی جب دور دور تک لق دق صحرا تھا اور جھاڑیاں تھیں۔ ایک دم سے میرا حوصلہ جواب دے گیا' اور پھر مجھ میں اٹھنے کی سکت ہی نہ رہی۔ میں اپنی ماں کو نہ چاہتے ہوئے بھی یاد کرنے لگا۔ اس کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن زبان کو حرکت نہیں دے پا رہا تھا۔ میں رونا چاہتا تھا' مگر رو نہیں پا رہا تھا۔ اچانک میری ماں کی اوٹ سے سوہنی کی جھلک دکھائی دی۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ میری ماں کا خیال رکھنا۔ میں اس سے کہہ نہیں پایا۔ مجھے بہت افسوس ہو رہا تھا' کافی دور کھڑا اچھا کا میرے پاس آنا چاہتا تھا' پر وہ نہ جانے کیوں نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن بڑھ نہیں سکتا تھا۔ میں بے حس و حرکت ہو گیا تھا۔ ہلنے کی سکت بھی نہیں بچی تھی۔ میں چیخ کر انہیں اپنے پاس بلانا چاہتا تھا' پر میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ہوا کی سائیں سائیں کچھ زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ رنگ برنگے ستاروں کی کہکشاں لگ گئی' وہ بلبلوں کی طرح ادھر ادھر پھیل رہے تھے۔ اس دوران اماں' سوہنی اور چھا کے معدوم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھنا چاہتا تھا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی میں نیند میں ڈوبتا چلا جا رہا ہوں۔ پھر مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔

❀

جسپال اور رانا چرن سیٹ مل جانے پر بیٹھ گئے تھے۔ تبھی جسپال نے منالی کو سیل فون پر پیغام کے ذریعے بتایا کہ وہ کس صورت حال میں ہیں جس پر منالی نے جواباً پیغام بھیج دیا تھا کہ فی الحال وہ "سیر" پہنچیں' وہاں سے پھر آگے جانا ہے یا امرتسر کی طرف جو بھی ہوگا' وہ طے کر کے بتاتے ہیں۔ تاہم پولیس پورے زور و شور سے تلاش کر رہی ہے۔ اس کے لیے وہ جدید ترین آلات کی بھی مدد لے رہے ہیں۔ اس قتل کا شور اس لیے بھی نیوز چینل پر زیادہ ہے کہ یہ رویندر سنگھ ایم ایل اے کے دوسرے بیٹے کا قتل تھا۔ ابھی تک خود رویندر سنگھ کا بیان جاری نہیں ہوا تھا' کیونکہ وہ دہلی سے چندی گڑھ آ رہا تھا۔ حالات بہت کشیدہ تھے۔ وہ ایک دوسرے سے پیغام رسانی کر رہے تھے کہ اچانک رانا چرن یوں تڑپا جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"کیا ہوا؟" جسپال نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ......وہ دیکھو سامنے سڑک پر......" اس نے سرگوشی میں کہا تو جسپال نے سڑک پر دیکھا جو کار انہوں نے کچھ دیر پہلے اسٹاپ پر چھوڑی تھی' وہی کار سڑک پر تھی۔ اس کے ساتھ پولیس کی گاڑیاں جا رہی تھیں۔ بلاشبہ وہ ان کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہ بعید نہیں تھا کہ وہ بس رکوا کر اس کی تلاشی لینے لگتے۔ پولیس درست سمت میں ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ اگلے اسٹاپ پر یا کہیں بھی تلاشی ممکن تھی۔ یہ انتہائی خطرناک صورت حال تھی۔ پولیس گھیر رہی تھی اور وہ گھیرے میں آ جانے والا تھا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ چلتی ہوئی بس سے چھلانگ لگا دیتا۔ کیا اسے فوراً بس چھوڑنا ہوگی' یا پھر صبر سے کام لیتے ہوئے بے نیاز بنے رہنا چاہیے؟ کیا وہ اسے پہچان لیں گے؟ تبھی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے کیا کرنا ہے؟

"سکون سے بیٹھے رہو۔" جسپال نے آہستگی سے کہا اور منالی کو پیغام بھیج دیا کہ صورت حال کیا ہے۔ چند لمحوں بعد اس کا فون آ گیا۔

"صورت حال تو خطرناک ہو گئی ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑ دو۔ مجھے وہاں سے نکلتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی ہے' میں کچھ دیر بعد گھر پہنچ رہی ہوں' میں پھر بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔"

"تب تک......" اس نے محتاط انداز میں کہا جسے منالی سمجھتے ہوئے بولی۔

"کسی طرح سیر تک پہنچ جاؤ' ویل اینڈ گڈ' آگے بہت ہیں سنبھالنے والے' اگر ضرورت محسوس کرو کہ تمہیں بس چھوڑنا ہے تو چھوڑ دینا۔ میں تم سے رابطہ میں ہوں' سیل فون کی حفاظت کرنا' اوکے۔"

"اوکے......!" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ رانا چرن اس کی طرف تجسس بھرے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ جسپال نے اس کا ہاتھ تھپکا' جس کا یہی مطلب تھا کہ وہ پرسکون رہے اس نے دھیرے سے سیٹ کے ساتھ پشت لگا لی۔ گویا اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ بس اپنی مخصوص رفتار سے چلتی چلی جا رہی تھی۔ جسپال کی پوری توجہ سڑک پر تھی۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے اور وہ پوری طرح تیار تھا کہ اگر پولیس نے کہیں بھی بس روک کر تلاشی شروع کر دی تو وہ پولیس کا سامنا کرنے کے لیے رکے گا' بھاگے گا نہیں۔ اس کی پوری کوشش ہوگی کہ شک نہ ہونے دے۔ لیکن اگر انہوں نے شک کی بناء پر بھی اسے پکڑ لیا تو صورتحال کے مطابق اپنے آپ کو بچانے کی پوری کوشش کرے گا۔

انسان خود کو جتنا مرضی مظلوم سمجھے' بدلے یا انتقام میں جس حد سے بھی گزر جائے' ردعمل میں جتنی مرضی شدت ہو' جرم آخر جرم ہوتا ہے۔ اس کا احساس انسان کے اعصاب پر حاوی ضرور ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص گناہ کی نیت سے جرم نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی توجیہ' بہانہ یا وجہ تلاش کر لی جاتی ہے' تبھی پوری شدت سے جرم کر لیا جاتا ہے' لیکن جس طرح اچھے کام کی ایک روحانی خوشی ہوتی ہے' اسی طرح جرم کرنے کا بھی احساس منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔ جسپال اس وقت اسی اثر سے گزر رہا تھا۔ پھر وہی ہوا جس کا وہ منتظر تھا۔ ایک طویل قطار لگی ہوئی تھی اور پولیس تلاشی لے رہی تھی۔ اب یہ وقت نہیں تھا کہ وہ منالی سے ہدایات لیتا پھرے۔

"ہم پنجاب اور راجستھان کی سرحد پر ہیں۔ اور یہاں پولیس کی بہت بڑی چوکی ہے۔" رانا چرن نے بڑبڑاتے ہوئے اسے بتایا' جس پر جسپال خاموش رہا۔ وہ خود کو آنے والے وقت اور حالات کے لیے تیار کر رہا تھا۔ بڑی اور چھوٹی گاڑیوں کی دو قطاریں تھیں' جنہیں بڑی تیزی سے چیک کیا جا رہا تھا۔ تبھی دو پولیس والے اس بس میں بھی آ گئے۔ انہوں نے سبھی سواریوں پر ایک نگاہ ڈالی' ان کا انداز انتہائی مشکوک تھا' جسپال نے انہیں اکتاہٹ بھرے انداز میں دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ پولیس والے ابھی تک گاڑی ہی میں تھے کہ ایک تیر طرار لڑکا بس میں آیا' اس کے پاس ہینڈی کیم تھا' اس نے آناً فاناً سب کی تصویریں بنائیں اور اتر گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں پولیس والے بھی اتر گئے۔ بس رینگنے لگی' کچھ ہی دیر بعد وہ چوکی پار کر گئے تھے۔ تقریباً دو کلومیٹر چلنے کے بعد بس ایک ڈھابے پر رک گئی۔ اگرچہ یہ اتنا لمبا سفر نہیں تھا کہ کچھ کھانے پینے

کی ضرورت محسوس ہو۔ مگر یہ ڈرائیور کی مرضی تھی۔ اس نے گاڑی روک دی۔ وہ دونوں اترے اور ایک الگ تھلگ میز کے قریب کرسیوں پر جا بیٹھے۔

"ہم اس وقت راجستھان میں ہیں۔ پنجاب پولیس کا اثر یہاں پر نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم خطرے سے باہر ہیں، ممکن ہے یہاں خفیہ والے پھر رہے ہوں۔" رانا چرن نے کہا تو جسپال نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"سیسر یہاں سے تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جب تک اس بس نے یہاں سے چلنا ہے میں اس وقت تک آپ کو سیسر پہنچا سکتا ہوں۔" وہ کافی حد تک شوخ انداز میں بولا۔

"وہ کیسے؟" اس نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"یہاں بسوں کے علاوہ کاریں بھی کھڑی ہیں۔ لاک کیسا بھی ہو میں کھول لیتا ہوں۔ آپ بس سڑک تک چلیں، میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔ ہم نکل چلیں گے۔ سیسر میں جا کر چھوڑ دیں گے۔" رانا چرن نے فخریہ انداز میں کہا اور اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کر دی۔ اس دوران ویٹر چائے کا آرڈر لے گیا۔

"یار ہمیں رسک لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ منالی ہمیں کچھ بتائے گی، اس کا مطابق ہمیں آگے چلنا ہے۔ تم ذرا صبر کرو، میں دیکھ لوں گا تمہاری مہارت......" جسپال نے کہا اور منالی کے نمبر ملانے لگا۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہو گیا۔ تبھی وہ پریشان لہجے میں بولی۔

"بس میں وہ...... تم سے رابطہ کرنے والی تھی۔ میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی وہ......"

"منالی...... تم ہوش میں ہو، کیا پریشانی ہے؟"

"ابھی تو کوئی پریشانی نہیں، بس میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم سیسر پہنچ جاؤ تو پھر آگے کسی کے سپرد کر دوں...... میں اسی رابطے میں لگی ہوئی تھی۔ کب تک پہنچ رہے ہو سیسر؟" اس نے پوچھا۔

"یار......! میں تو چاہتا ہوں ابھی اور اسی لمحے پہنچ جاؤں لیکن اب تو یہ بس ڈرائیور پر منحصر ہے کہ وہ ہمیں کب لے کر جاتا ہے۔"

"تم لوگ وہاں سے جلدی نہیں نکل سکتے۔ یہ رانا کو کہو کوئی تکڑم لڑائے، تم بہت جلدی یہاں سے نکل جاؤ، یہی اچھا ہے۔" وہ تیزی سے اس طرح بولی جیسے وہ بے حد پریشان ہے۔

"تم بتاؤ، بات کیا ہے، پریشانی......" جسپال نے کہنا چاہا تو اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"رانا سے بات کراؤ میں اسے کہتی ہوں۔"

جسپال نے فون رانا کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چند لمحے بات سنتا رہا، پھر فون بند کر کے جسپال کو واپس دے دیا۔ اس کے چہرے پر بہت حد تک سنجیدگی آ چکی تھی۔ اس نے جسپال کی بات نہیں سنی، بلکہ اسے کہا۔

"جسپال! میرے بعد اٹھ کر سڑک کے کنارے پہنچ جانا، میں آتا ہوں۔"

"بات کیا ہوئی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"بعد میں بتاتا ہوں۔" اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا اور اٹھ گیا۔ جسپال تذبذب میں ٹہلنے والے انداز میں اٹھ گیا اور چلتا ہوا بس کی اوٹ سے سڑک کی جانب بڑھ گیا۔ ڈھابے سے سڑک تک کا فاصلہ کوئی دو سو گز تھا۔ اسے وہاں تک پہنچنے میں پانچ منٹ سے بھی کم وقت لگا۔ اس نے گھوم کر دیکھا، رانا ایک گاڑی کی ڈرائیونگ سائیڈ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ وہ نئے ماڈل کی ہنڈا تھی۔ چند لمحوں بعد وہ اس میں بیٹھ چکا تھا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا کہ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی، پھر تیزی سے گھومتا، سڑک کی جانب بڑھتا چلا آیا۔ گاڑی اس کے قریب رکی تو وہ اس میں بیٹھ گیا۔ رانا نے پیر پر ہی رفتار بڑھا دی، گاڑی نئی تھی، اس لیے اس کی پک اپ بھی زیادہ تھی، کچھ دیر بعد وہ تیز رفتاری سے کافی دور تک نکل آئے۔

"اب بتاؤ، منالی پریشان کیوں تھی؟"

"شاپنگ مال کے سی سی کیمروں میں تمہاری ساری کارروائی ریکارڈ ہو گئی ہے۔ اس میں صرف تمہی نہیں، منالی بھی واضح ہے، پولیس اسے بھی تلاش کر رہی ہے۔"

"منالی کو اب گھر آ کر پتہ چلا......؟" جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں......! دراصل تمہاری تصویر اور نام اس وقت مختلف چینلز پر چل رہے ہیں۔ تمہیں پہچان لیا گیا ہے۔ اس لیے اب چند دن کے لیے تجھے کسی محفوظ ترین ٹھکانے پر رہنا لازمی ہو گا۔" رانا نے کافی حد تک تشویش زدہ لہجے میں کہا تو اس نے اپنے اندر شدت محسوس کی۔ ایک دم سے جو خوف اس کے اندر موجود تھا، وہ نجانے کہاں غائب ہو گیا۔ وہ بے خوف ہو گیا۔ جب تک وہ چھپا ہوا تھا اس کے ساتھ خوف بھی بندھا ہوا تھا۔ اب اگر چینلز نے اسے دنیا کے سامنے لا کھڑا کیا تھا تو پھر خوف کس بات کا، آمنے سامنے کی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ منالی کا فون آ گیا۔

"کیا تم پولیس سے محفوظ ہو؟" جسپال نے اس سے پوچھا۔

"مجھے زیر زمین جاتے اتنا وقت نہیں لگتا، میں اگلے دس منٹ میں خود کو سنبھال لوں گی۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ جب تک تم سیسر نہیں پہنچ جاتے اس وقت تک میری ذمے داری میں ہو۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ میری تصویر اور......" اس نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولی۔

"میں بلاوجہ تمہیں ذہنی دباؤ میں نہیں لانا چاہتی تھی، اب اس لیے بتایا کہ ممکن ہے وہاں تمہیں کوئی پہچان لے اور مصیبت بن جائے، خیر چھوڑو ان باتوں کو، وہ رویندر سنگھ ایئرپورٹ پر پہنچ چکا ہے اور رپورٹر اس سے بات کر رہے ہیں سنو۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فون ٹی وی کے قریب کر دیا۔ کوئی بھاری آواز میں ٹھیٹ پنجابی زبان میں اکھڑے ہوئے لہجے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "مجھے ابھی اس قاتل کی تصویر دکھائی گئی ہے، یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پورے پلان کے ساتھ مجھے اور میرے خاندان کو مارنے کی کوشش تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ صرف ایک بندے کا کام نہیں ہے، اس میں غیر ملکی مداخلت اور شدت پسند تنظیموں کا پورا پورا ہاتھ ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمیں سیاست سے الگ کرنے کی سازش ہے۔ میرے دو بیٹوں کو قتل کیا گیا۔ پولیس آفیسر بھی قربان ہو گئے اور ایک بیٹا اسپتال میں موت وحیات کی کشمکش میں ہے۔ میں حکومت سے مانگ کرتا ہوں کہ بڑے پیمانے پر اس گروہ کو تلاش کیا جائے، چوبیس گھنٹے کے اندر اس قاتل کو پکڑا جائے ورنہ میں احتجاجاً پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا دوں گا۔ میرے ساتھ میرے سیاسی دوست بھی ہیں۔ میں اسے حکومت کی نااہلی سمجھوں گا کہ وہ قاتل کو چوبیس گھنٹوں میں گرفتار کر کے قانون کے حوالے نہ کر سکی۔ کیا ہماری سیاسی اور قومی خدمات کا یہ صلہ دیا گیا ہے کہ ایک بوڑھے باپ کو اپنے جوان بیٹوں کی لاشیں اٹھانا پڑیں۔"

"کیا آپ کے بیٹے کی آخری رسومات گاؤں میں ہوں گی، یا یہیں چندی گڑھ میں۔" کسی نے سوال کیا۔

"نہیں..... یہیں چندی گڑھ میں۔ کل اسی وقت میں پارلیمنٹ کے سامنے ہوگا، اگر قاتل نہ پکڑا گیا تو، میرا تب تک احتجاج جاری رہے گا۔"

اس کے ساتھ ہی شور مچ گیا تو منالی کی آواز ابھری۔

"وہ ائرپورٹ سے نکل گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، میں شہر کے قریب پہنچ کر تمہیں بتاتا ہوں۔" جسپال نے کہا تو وہ بولی

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، تمہارا نام نہیں گیا ہے، سی سی کیمرے کی تصویر میں تم اتنے واضح نہیں ہو، ٹیک کیئر۔"

"او کے۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے اندر ایک سکون اور طمانیت اتر آئی تھی۔ پہلی بار اس نے رویندر سنگھ کی آواز اس انداز میں سنی تھی، جب وہ ٹوٹا ہوا تھا، پہلی بار اس کی آواز میں طنطنہ تھا، اس بار وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند لگ رہا تھا۔ اس کی پھوپھو سکھ جیت نے بھی اپنے پریوار کے قتل پر ایسا ہی دکھ محسوس کیا ہوگا۔ وہ ایک دم ماضی میں پہنچ گیا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتیں تو اپنے دشمن کو ٹوٹتا ہوا دیکھ کر کس قدر پرسکون ہوتیں۔ مگر ابھی انتقام پورا نہیں ہوا تھا، وہ رویندر سنگھ کے چہرے پر دہشت اور خوف کی وہ پرچھائیں دیکھنا چاہتا تھا، جس کی اسے خواہش تھی۔ وہی لمحات اس کی پوری زندگی کا حاصل تھے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ رانا چرن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"جیسر شہر آ گیا ہے، منالی کو بتا دے....."

اس نے فوراً فون ملایا اور صورت حال کے بارے میں بتایا، جسپال نے فون لاؤڈ کر دیا تھا۔ رانا بھی سن رہا تھا۔ اس نے شہر کے باہر ہی ایک جگہ کی نشاندہی کی کہ وہاں انہیں فور وہیل جیپ میں دو آدمی ملیں گے، اس نے جیپ کا نمبر بھی بتا دیا۔ وہ جدھر لے جائیں، چپ چاپ ان کے ساتھ چلے جائیں۔ چند لمحوں بعد اس نے فون نمبر اور جیپ کا نمبر بھی بھیج دیا۔ جسپال نے فوراً ہی اس نمبر پر رابطہ کیا تو دوسری طرف سے ذرا مختلف لہجے لیکن پنجابی ہی میں جواب ملا، ان کا رابطہ ہو گیا تو جسپال کافی حد تک مطمئن ہو گیا۔

شہر میں داخل ہونے سے ذرا قبل ایک بڑا سا را چوراہا تھا۔ وہ اسی چوراہے پر کھڑے تھے۔ وہ دونوں قد آور نوجوان تھے۔ ایک ذرا صحت مند تھا، اور دوسرا پتلا سا، دونوں کے نقوش تیکھے تھے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے ان کی کار کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ ان کے عقب میں وہی فور وہیل جیپ کھڑی تھی۔ انہوں نے گاڑی قریب لے جا کر ایک طرف کھڑی کر دی او ران کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے ہاتھ ملایا، پھر صحت مند نوجوان بولا۔

"میں راؤ وریام سنگھ اور یہ راؤ ہرنام سنگھ..... اب آپ کا کوئی بال باکا نائیں کر سکتا۔ چلو گاڈی میں بیٹھو۔" یہ کہہ کر وہ ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھ گیا، دوسرا آگے والی پسنجر سیٹ پر براجمان ہو گیا جب کہ جسپال اور رانا پچھلی نشست پر سکون سے بیٹھ گئے، جیپ چلی تو ہرنام بولا۔

"مجا آ گیا جی آپ کو دیکھ کے..... ٹی وی پر تو آپ کا پھوٹو بڑا مدھم نجر آوے تھا۔ جوان ہو تو ایسا جی..... پلس کو ہلا کے رکھ دیا۔ حکومتیں ڈھونڈ رہی ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب ہم نے جانا کہاں ہے؟" جسپال نے پوچھا۔

"دو گھنٹے دے دو ہمیں بس..... صورت گڑھ میں اپنا گھر ہے، باپو آپ کا انتجار کر رہا ہے، بڑی شدت سے آپ کے بغیر روٹی نہیں کھانے والے..... آپ سکون کرو....." وریام نے کہا تو وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔ اعصاب کو شل کر دینے والے حالات میں ذرا سکون ملا تو اس کی آنکھیں بند ہونی شروع ہو گئیں۔ اس نے فون رانا کو تھمایا اور آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔

جسپال کی جس وقت آنکھ کھلی تو گاڑی کے باہر کا منظر بدل چکا تھا۔ وہ بہترین شاہراہ تھی۔ جس کے دونوں طرف ریت تھی۔ بہت کم آبادی تھی۔ وہ کچھ دیر دیکھتا رہا، پھر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے جاگتا دیکھ کر ہرنام نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"جاگ گئے جی، بڑی گہری نیند سوئے جی، لگتا ہے کافی تھکن تھی۔"

"ہاں.....! ایسا ہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے پوچھا۔ "ہم کہاں تک آ گئے ہیں؟"

"یہی گھر سے پندرہ بیس منٹ کے فاصلے پر، آپ دو گھنٹے سوئے ہیں۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تبھی جسپال نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا.....! میرے خیال میں جس وقت منالی نے آپ سے رابطہ کیا ہوگا، اس سے لے کر آپ تک ملنے میں آدھا گھنٹہ لگا ہوگا۔ آپ اتنی جلدی یہاں کیسے پہنچ گئے۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم کسی منالی کو نہیں جانتے اور نہ ہی ہماری اس سے بات ہوئی ہے۔" وریام نے کہا تو جسپال کو ایک دم سے جھٹکا لگا۔ جبکہ وہ سامنے منہ کیے روانی سے کہتا چلا جا رہا تھا۔ "باپو نے فون کر کے آپ لوگوں کے بارے میں بتایا، ہم یہاں "اوگاڑی" (بقایا) لینے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ اپنا بزنس پورے راجستھان میں ہے۔ ہم نہ ہوتے تو آپ کو ہمارے ملازمین لے جاتے۔"

"منالی نے اگر بات نہیں کی تو....." اس نے پوچھا تو وریام درمیان ہی سے بولا۔

"یہ باپو ہی جانے۔"

اس کے یوں کہنے پر جسپال نے رانا کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر بھی کافی حد تک پریشانی کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔ اب وہ پتہ نہیں کون تھے، دوست یا دشمن، وہ انجانے میں کس کے ہتھے چڑھ چکے تھے۔ اگر وہ دشمن ثابت ہوتے تو بچاؤ بہت مشکل تھا۔ انجانی جگہ اور انجانے لوگ، لیکن نجانے کیوں اس کا دل مطمئن تھا، اگر وہ دشمن ہوتے تو اسے یوں سکون سے سونا نصیب نہ ہوتا اور اس کے پاس جو پسٹل تھا، وہ اب تک چھین لیا گیا ہوتا۔ وہ گاڑی میں نہیں کہیں بندھا ہوا پڑا ہوتا۔ وہ اس شش و پنج میں تھا کہ صورت گڑھ شہر آ گیا۔ سامنے ہی سائن بورڈ پر لکھا ہوا تھا، اس نے انگریزی میں پڑھ لیا تھا۔ وریام نے شہر میں داخل ہونے کی بجائے دائیں جانب والا ایک راستہ اختیار کیا۔ جسپال سکون سے بیٹھا رہا، شہر کے مضافات میں ایک بڑی حویلی کے گیٹ پر جیپ آن رکی، انہیں دیکھتے ہی گیٹ فوراً کھل گیا۔ وہ جیپ پورچ میں لے گئے۔ کافی کھلی حویلی تھی۔ سبزہ زیادہ تھا۔ وہ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ اندر سے حویلی وہی ہندوانہ طور پر گولائی میں تھی۔ گول سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں۔ دالان اور برآمدے بنے ہوئے تھے۔ سامنے ہی صوفے پر سفید دھوتی کرتا پہنے، کاندھے پر سنہری چادر ڈالے کھچڑی داڑھی اور بڑی مونچھوں والا

جس کے سر کے بال بالکل صاف تھے، موٹے نقوش اور صحت مند جسم والا راؤ بچن سنگھ بیٹھا ہوا تھا، انہیں دیکھتے ہی کھڑا ہوگیا۔

"آؤ...... آؤ جسپال......! میں کب سے انتظار کر رہا ہوں، بھئی باتیں بعد میں، آؤ پہلے کھانا کھاتے ہیں ہاتھ منہ دھو کے آجاؤ بھئی......" بچن سنگھ نے بے تکلف سے انداز میں کہا تو جسپال کو قدرے سکون ملا۔ جو وہ سمجھ رہا تھا، ویسا نہیں تھا۔

اس وقت وہ کھانے کی میز سے اٹھ گئے تھے اور گپ شپ کے لیے سکون سے آکر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تھے کہ جب باہر سے ایک ملازم نے ایک چٹ لاکر بچن سنگھ کو دی۔ اس نے چٹ پر نظر ڈالی ہی تھی کہ پریشان ہوگیا مگر یہ تاثر ایک لمحے کے لیے آیا پھر غائب ہوگیا۔ اس نے ایک نگاہ جسپال پر ڈالی پھر اپنے بڑے بیٹے وریام کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جسپال اور رانا کو اندر کمرے میں لے جا اور جب تک میں نہ کہوں باہر نہیں آنا، ساری باتاں غور سے سننی ہیں تاکہ تم لوگوں کو پتہ چل جائے......" یہ کہہ کر اپنے ملازم سے آنے والے لوگوں کو اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ لوگ فوراً ہی ساتھ والے عقبی کمرے میں چلے گئے، جہاں کی ہول سے وہ باہر کا منظر دیکھ سکتے تھے، کچھ دیر بعد تین لوگ اندر آئے، ان میں دو ادھیڑ عمر اور ایک نوجوان تھا۔ تینوں نے گہرے رنگ کے سفاری سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ تینوں بچن سنگھ کے ساتھ بڑے تپاک سے ملے، انہیں بٹھایا اور بچن سنگھ نے پوچھا۔

"کیا لوگے آپ لوگ ٹھنڈا یا چائے؟"

"کچھ نہیں راؤ صاحب......! بس آپ جسپال کو ہمارے حوالے کردیں، جو ابھی پنجاب سے بھاگ کر آپ کے پاس آیا ہے۔" ان میں سے ایک ادھیڑ عمر بندے نے کہا۔

"آپ لوگ سی بی آئی سے ہو، میں نے مان لیا، لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ کوئی پنجاب سے بھاگ کر میرے پاس آیا ہے، آپ لوگ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" بچن سنگھ نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

"دیکھیں راؤ صاحب! وہ ایک جنونی قاتل ہے، آج صبح اس نے قتل کیا اور چندی گڑھ سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے ایک جگہ کار چھوڑی اور دوسری جگہ سے کار چوری کی، اس طرح ان کے راستے کی نشاندہی ہوگئی۔ سیسر سے وہ جس گاڑی میں آئے ہیں وہ آپ کے پورچ میں کھڑی ہے، اب اس سے بڑا ثبوت ہم کیا دیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"دیکھ میرے بھائی! یہاں کوئی بھاگ کر نہیں آیا، آپ لوکاں کو غلط فہمی ہوگئی ہے، اس گاڑی میں تو میرے بچے او گاڑی کر کے آئے ہیں، سیسر ہی سے۔" اس نے پھر نرم لہجے میں جواب دیا تو نوجوان نے تیزی سے کہا۔

"تو کیا پھر ہم حویلی کی تلاشی لے لیں۔"

"اوئے......! بات سن......" بچن سنگھ ایک دم گرم ہوگیا۔ "آج تک کسی کی جرات نہیں ہوئی کہ میری حویلی کی تلاشی لے سکے، تیرے جیسے کئی سی بی آئی والے میری جیب میں ہیں۔ تو حکومت کا ملازم ہے تو ہم حکومت چلانے والے ہیں، کہہ دیا نہیں ہے، تو نہیں ہے۔"

"سوری راؤ صاحب! یہ بچہ ہے، اسے نہیں معلوم، معاف کردیں اسے، اصل میں آپ کو شاید نہیں معلوم کہ وہ ہمارے تین بندوں کو قتل کرچکا ہے، اس کے علاوہ ایم ایل اے کے بیٹے کو......" ادھیڑ عمر نے کہنا چاہا تو بچن سنگھ نے کہا۔

"دیکھ میرے بھائی......! میں بحث کا عادی نہیں ہوں۔ میں نے آپ لوگوں سے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ باقی میں چیف منسٹر سے بات کرلیتا ہوں۔"

"آپ بخوشی ان سے بات کرلیں، وہ بہت دباؤ میں ہیں۔ سینٹرل گورنمنٹ کے وہ مسلسل رابطے میں ہیں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہوگا کہ وہ یہاں سے نکل کر کہیں اور چلا جائے گا تو یہ اس کی خام خیالی ہے۔ آپ تعاون کریں اور اسے ہمارے حوالے کردیں۔"

"میں سوچوں گا کہ آپ سے کس قدر تعاون کیا جئے۔ ابھی فی الحال آپ جاؤ۔" بچن سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے راؤ صاحب! ہم ابھی کچھ دیر بعد آپ سے ملتے ہیں۔" وہ ادھیڑ عمر آدمی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تو باقی دونوں بھی اٹھ گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد بچن سنگھ اٹھا اور ان کے پاس آگیا۔

"سن لیا جسپال، وہ اگر یہاں تک پہنچ گئے ہیں تو مطلب وہ بالکل درست تعاقب کر کے ٹھیک جگہ پہنچے ہیں۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟" اس نے پوچھا۔

"دیکھو......! مجھے وینکوور میں موجود میرے دوست نے کہا تو اس کا حکم سر آنکھوں پر، میں اپنے خون کے آخری قطرے تک تمہاری حفاظت کروں گا لیکن......! جس قدر تیزی سے اور جس طرح کا ان کا لہجہ ہے، وہ بتا رہا تھا کہ اب تم جیسے ہی نکلو گے، وہ تمہیں قابو میں کرلیں گے۔ پھر کیا ہوگا، میں نہیں جانتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ ابھی سی ایم کا فون آئے گا اور مجھے اس کے پاس جانا پڑے گا۔ زیادہ سے زیادہ میں شام تک اڑا رہوں گا۔" بچن سنگھ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر میں نکلتا ہوں، جو ہوگا، وہ دیکھا جائے گا۔" جسپال نے کسی خوف کے بغیر کہا۔

"یہ خودکشی ہوگی میرے بچے! اور جو میرے پاس ہو اور میں اس کی حفاظت نہ کروں، یہ تو ممکن نہیں، یہ یقین کرلو جسپال، یہاں رہتے ہوئے تم جدھر بھی جاؤ گے، یہ لوگ تجھے نکلنے نہیں دیں گے۔ چینل صبح سے تیری تصویر دکھا رہے ہیں۔ یہاں بھارت میں رہنے کی تیرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اس حقیقت کو تو سمجھ لے...... ہاں کسی کمرے میں بند رہ کر وقت گزار لے تو الگ بات ہے۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا تو جسپال نے سکون سے کہا۔

"تو پھر آپ بتائیں نا، میں کیا کروں......؟"

"تم ابھی یہاں سے نکلو گے...... پانچ بج چکے ہیں، لیکن اس سے پہلے تو جسمیندر سے بات کرلے۔ اوپر کمرے میں ہر چیز موجود ہے۔ وہ تمہیں بہترین مشورہ دے گا اور اسے صورت حال کی سمجھ بھی آجائے گی۔"

"اوکے......!" جسپال نے کہا تو وہ اسی کمرے سے باہر کی جانب اشارہ کر کے خود ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وریام نے اوپر والے کمرے تک اس کی رہنمائی کی۔ کچھ دیر بعد اس کا رابطہ جسمیندر سے ہوگیا۔ وہ ساری صورت حال بتا چکا تو اس نے کہا۔

"تم پاکستان اور بھارت کی سرحد کے بے حد قریب ہو، اگر تھوڑی سی دشواری برداشت کرسکو تو سرحد پار کر جاؤ۔ اس کے لیے حوصلہ بھی چاہیے۔ ادھر ہمارے لوگ موجود ہیں، تجھے سنبھال لیں گے، پھر اس کے بعد دیکھیں گے کہ کیا کرنا ہے۔"

"میں تیار ہوں۔" جسپال نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تو بس پھر ٹھیک ہے۔ تم تیار ہو جاؤ، ممکن ہے

میں بھی تم تک پہنچ جاؤں۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں' بس حوصلہ رکھنا۔" اس نے کہا۔

"اوکے...... ڈن!" جسپال نے کہہ دیا پھر چند باتیں اور سمجھانے کے بعد ان کا رابطہ ختم ہوگیا۔ تب وریام نے اپنی ریسٹ واچ پر وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

"آؤ...... چلیں یہاں سے نکلنے میں بھی کچھ وقت لگے گا۔"

وہ دونوں نیچے چلے گئے' بچن سنگھ ان کے انتظار میں تھا۔ جسپال نے اپنا فیصلہ اسے سنا دیا۔ تب اس نے سکون سے کہا۔

"میرا فیصلہ بھی یہی تھا مگر میں نے اس لیے نہیں کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں نے تم پر اپنا فیصلہ مسلط کر دیا۔ وریام ہے نا' سارے معاملے نپٹا دے گا۔ یہ حسرت ہی رہی کہ تم سے لمبی باتاں کرتے' آؤ مل لو۔" یہ کہہ کر اس نے کھڑے ہو کر دونوں بانہیں پھیلا دیں۔ وہ اس سے مل چکا تو وریام اسے لے کر ایک دوسرے کمرے میں چلا گیا' ایک الماری سے موٹے کپڑے کی شلوار قمیص نکالی' پھر ایک بڑی ساری چادر نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ پہن لو اور اپنے کپڑے مجھے دو۔"

"تم پہنو گے۔" جسپال نے اس کے صحت مند جسم کی طرف دیکھ کر مزاقاً کہا تو وہ بولا۔

"ارے نہیں' یہ کپڑے ایک تیرے جیسے قد بت کے بندے کو پہنا کر اوپر چھت پر بھیج دوں گا جہاں سے یہ سی بی آئی والے دیکھتے رہیں کہ بندہ موجود ہے ساتھ میں رانا ہوگا' ہرنام ہوگا' تو یہ کپڑے پہن' پھر میں بتاتا ہوں تیرے ساتھ کیا کرنا ہے۔"

جسپال نے جین شرٹ اتاری' وہ کپڑے پہنے' سر سے دستار اتاری اور وہ چادر لپیٹ لی' وریام کپڑے لے کر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا اور اسے بھی ساتھ لے کر نیچے آیا' پھر اپنے چند ملازمین کے ساتھ لا کر کھڑا کر دیا۔

"ابھی یہ لوگ برتن اٹھائے باڑے میں جائیں گے' حویلی سے باہر' تو بھی ان کے ساتھ ادھر جانا...... میں ادھر ملتا ہوں تم سے......"

وریام نے کہا اور تیزی سے پلٹ گیا۔ وہ سات آٹھ ملازم تھے' جن کے ساتھ وہ بھی حویلی کے پچھلے دروازے سے نکل گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے اردگرد دیکھا' دور ایک کونے پر سڑک کنارے چند لوگ ایک چھوٹی جیپ کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ سب چلتے ہوئے ان کے قریب سے باڑے میں چلے گئے۔ انہیں شک تک نہیں ہوا کہ ان میں جسپال بھی ہوسکتا ہے۔ وہاں سے جسپال نے دیکھا' چھت پر اس کے کپڑے پہنے کوئی تھا' رانا کا ہیولا بھی لگا اور ہرنام بھی اس کے ساتھ تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وریام وہاں آ گیا۔ اس نے باڑے کے باہر ہی گاڑی کھڑی کر دی۔ کیونکہ اس سے کچھ فاصلے پر وہ مشکوک لوگ موجود تھے۔ وریام اسے لیتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔ جس کے دوسرے دروازے سے نکل کر وہ باہر آ گئے تو سامنے ویسی ہی ایک اور جیپ کھڑی تھی۔ وہ دونوں تیزی سے اس میں بیٹھے اور مشرق کی جانب چل پڑے۔ سورج مغرب کی آغوش میں ڈوب رہا تھا۔

وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک چلتے چلے گئے۔ راستے میں ایسی گزرگاہیں بھی آئیں' جہاں بہت سست روی سے گزرنا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ایک گاؤں میں آن پہنچے' جس میں ایک طرف بہت بڑا تالاب تھا۔ اگرچہ ہر گاؤں میں مویشیوں کے لیے ایک تالاب ہوتا ہے لیکن وہ کچھ غیر معمولی تالاب تھا۔

"یہ سرحد کا آخری گاؤں ہے' یہاں سے فقط دو کلومیٹر کے فاصلے پر سرحد ہے۔" وریام نے اسے بتایا۔

"وریام' میری معلومات کے مطابق تو پاکستان اور بھارت کی سرحد پر باڑ لگی ہوئی ہے' جس سے گزرنا بہت مشکل ہوگا' وہ کیسے......" جسپال نے پوچھا۔

"اس لیے تو یہاں لایا ہوں' دیکھو......! سرحد پر متعین فورس میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی' سارے فرشتے نہیں ہیں۔ ان کی اپنی بڑی ضرورتیں ہیں۔ نہ ہوں تو ہم پیدا کر دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے' ہم نے کاروبار کرنا ہوتا ہے۔ یہاں سے کچھ لوگوں کے ساتھ ہماری ڈیل ہے۔ تم دیکھتے رہنا کہ ہوتا کیا ہے۔" وریام نے کہا اور گاؤں کے ایک کچے لیکن بڑے سارے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ اگلے ہی لمحے گھر سے دو لمبے تڑنگے مرد نکلے' وہ تپاک سے ملے اور انہیں لے کر چارپائیوں پر بٹھا دیا۔ شربت وغیرہ پینے کے بعد ان میں سے ایک نے جسپال کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو یہ ہے وہ جوان......"

"ہاں یہی ہے' دیکھو اسے کوئی تجربہ نہیں ہے' اسے تو بس ادھر سے ادھر بھیجنا ہے' آگے وہ خود دیکھ لیں گے۔" وریام نے کہا۔

"دیکھیں جی' راؤ صاحب کا حکم آیا ہے تو ہم نے اچانک تیاری کی ہے۔ دو بندے ساتھ ہوں گے' وہ ساتھ تو ہوں گے لیکن ذمے داری نہیں ہے' کیونکہ آگے ہماری بات نہیں ہوئی' اس صورت حال کا شکوہ نہیں دینا۔"

"نہیں ہوگا' اب بتاؤ جانا کب ہے۔"

"ابھی آٹھ بج رہے ہیں۔ دس بجے کے بعد بندہ آ کر بتائے گا' تب تک ڈیرے پر چلتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں' اور......" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو وریام ہنس دیا۔ پھر وہ پیدل ہی گاؤں سے باہر ڈیرے کی طرف چل دیئے۔

کچے کمروں کے سامنے کھلا سارا صحن تھا' جس میں سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ وہاں چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی جا کر گدوں پر بیٹھ گئے۔ تبھی کچے کمرے میں سے دو نوجوان لڑکیاں برآمد ہوئیں' دونوں ہی گوری چٹی اور روایتی راجستھانی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ گھاگھرا اور چولی' کھلا گریبان' کمر برہنہ پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں' تبھی دو چار لوگ ایک طرف آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے کپڑے تلے پڑا سی ڈی پلیئر آن کر دیا۔ دھیمی دھیمی موسیقی شروع ہوگئی۔ ایک لڑکی وریام کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ تبھی لمبے آدمی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہی تھی اس دن والی...... ابھی دس منٹ پہلے پہنچی ہے یہ......"

"مار دیا اس ظالم نے تو اُس دن...... آج بھی کمال کر دینا ظالم......" یہ کہتے ہوئے اس نے اس لڑکی کو بانہوں میں لے کر جھنجوڑ دیا۔ وہ کچھ دیر مچلتی رہی پھر وریام نے چھوڑا تو اٹھ کر ناچنے لگی۔ گانا شروع ہوتے ہی ان کے سامنے شراب بھرے پیتل کے گلاس رکھے جانے لگے' وریام نے ایک جام جسپال کے سامنے رکھا تو اس نے دھیرے سے کہا۔

"میں شراب نہیں پیتا۔"

"او ظالم! پھر جیتا کیسے ہے؟" یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

"بس نہیں پیتا' شروع سے عادت ہی نہیں بنی۔" جسپال نے سکون سے کہا۔

"چل ٹھیک ہے' کوئی بات نہیں' تو دیکھ...... ان

میں شراب سے بھی زیادہ نشہ ہے۔ پاگل کر دیا ہوا ہے اس نے......" وریام شاید اس طوائف پر مرمٹا تھا، شراب کے جام پر جام چلتے رہے۔ بھنا ہوا گوشت ان کے سامنے آتا رہا۔ پندرہ بیس لوگ تھے۔ وہ سب کھاتے پیتے اور ناچ دیکھتے رہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔

رات ٹھہر چکی تھی دونوں لڑکیاں خوب ناچ رہی تھیں۔ ایسے میں ایک نوجوان سالڑکا ڈیرے کے احاطے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وہ لمبا آدمی اٹھ گیا۔ اٹھتے ہوئے وریام کو بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ جسپال کے ساتھ وہ بھی اٹھ گیا۔ وہ تینوں آگے پیچھے باہر نکلتے چلے گئے۔

"لو جی وریام جی! آپ نے موج مستی کرنی ہے تو ادھر رہو یا جانا ہے تو جاؤ، اب آگے ہمارا کام ہے۔" اس لمبے آدمی نے ڈیرے سے باہر نکل کر کہا تو وریام نے جسپال کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"لے بھئی جسپال! رب کے حوالے...... واگرو تم پر مہر کرے، بس تیری خدمت نہ کر سکا۔"

دونوں ایک دوسرے سے گرمجوشی سے ملے، پھر الگ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا، لمبے آدمی نے جسپال کا ہاتھ پکڑا اور اندھیرے میں چل دیا۔ وریام واپس چلا گیا تھا اور وہ دونوں پیدل ہی چل پڑے۔ کافی آگے جانے کے بعد انہیں اونٹ بیٹھے ہوئی دکھائی دیئے۔

"یہ ہمارے سدھائے ہوئے اونٹ ہیں۔ یہ ہی سرحد پار کرائیں گے۔ یہ سیدھے اپنے ٹھکانے پر جائیں گے۔ انہیں اپنی مرضی سے نہیں ہانکنا۔ یہ جدھر لے جائیں، ادھر چلے جانا ہے اور دوسری بات تمہارے ساتھ ایک اور بندہ ہوگا۔ وہ اتنی سمجھ بوجھ والا بندہ نہیں ہے۔" لمبے آدمی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" جسپال نے سر ہلاتے ہوئے کہا تو لمبے آدمی نے قطبی ستارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ دیکھ، یہ تارا دیکھ رہا ہے، یہ تیرے دائیں کاندھے کی طرف رہے بس، پھر تو صحیح سمت میں جائے گا، اسے مت بھولنا۔"

"ابھی کہہ رہے ہو کہ اونٹ......" جس پال نے سمجھنا چاہا۔

"اگر تجھے سمت سمجھنے کی ضرورت پڑے تو...... ورنہ یہ تجھے اونٹ ہی اپنے ٹھکانے پر لے جائیں گے، واگرو کا نام لے اور بیٹھ اس پر......" لمبے آدمی نے ایک اونٹ کی طرف اشارہ کیا، جسپال نے پہلے کبھی بھی اونٹ کی سواری نہیں کی تھی۔ اس لیے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ کوہان کے پیچھے مضبوطی سے بیٹھ گیا، تبھی لمبے آدمی نے ایک اونٹ کو اٹھایا تو باقی بھی اٹھنے لگے، جسپال ان اونٹوں کی درست تعداد نہ معلوم کر سکا۔ بس اندازہ تھا کہ چھ یا سات ہوں گے۔ اس کا اونٹ تیسرا یا چوتھا تھا۔ لمبے آدمی نے ایک اونٹ کی مہار پکڑی اور سب سے آگے پیدل چلنے لگا۔ تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے وہ رک گیا۔ سامنے ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس سے دھیمی دھیمی باتیں ہوئیں تو پہلا اونٹ بٹھا دیا گیا۔ وہ بندہ اس پر سوار ہوا تو اونٹ کھڑا ہو گیا۔ اونٹ چل پڑے۔ سامنے لوہے کی اونچی اونچی باڑ دکھائی دینے لگی تھی، جو روشن تھی۔ اس پر بڑی بڑی سرچ لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ اچانک وہ لائٹس بند ہو گئیں تو اونٹ تیزی سے چل پڑے۔ سامنے ایک بڑا سارا سیاہ دروازہ تھا، وہ یک لخت کھلا، تبھی اونٹ اس میں سے گزرتے چلے گئے۔ یہ سارا عمل تین یا چار منٹ کا

رہا ہوگا۔ جب وہ چند کھیت آگے چلے گئے تو بتیاں پھر سے روشن ہو گئیں۔ اب اونٹ قطار میں نہیں تھے بلکہ پھیل گئے تھے۔ وہ آدمی جسپال کے قریب اپنا اونٹ لے آیا۔

"جوان، مضبوط بیٹھنا، اونٹ کو ریگستان کا جہاز کہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے قہقہہ لگا دیا۔

"کیا اب ہم پاکستان میں ہیں؟" جسپال نے پوچھا۔

"ابھی نہیں، چند کھیت اور پار کر لیں تو پھر...... یہ باڑ عین سرحد کے اوپر نہیں لگی......" اس نے جواب دیا۔

"یہ بتیاں کیوں بند کی گئی تھیں، جب ان سے بات......" جسپال نے پوچھنا چاہا تو وہ تیزی سے بولا۔

"رات کے اس وقت مردوں کی ڈیوٹی ہوتی ہے اور وہ بہت پھیل کر بیٹھتے ہیں۔ انہیں بھی چیک کرنے والے ہوتے ہیں۔ بس رسک نہیں لیا۔ بڑی چوکی پر لائٹ بند کی تھی۔ یہ چلتا ہے۔ تو اب بھارت کو بھول جا۔ یہ آگے جہاں سے کھیت ختم ہو رہے ہیں، اس سے آگے ریگستان ہے۔ اس ریگستان سے پاکستان شروع ہو جائے گا۔"

"مطلب پھر ہم پرسکون ہو جائیں گے۔" جسپال نے اطمینان سے کہا۔

"ارے نہیں، سکون تو ٹھکانے پر ہی آئے گا۔ آگے پاکستانی چوکیاں بھی تو ہیں۔ ان سے بھی بچنا ہے۔ بس تو سنبھل کے بیٹھ، جہاز اڑنے کو ہیں۔" اس نے پھر سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ جیسے قہقہہ لگانا اس کی عادت ہے۔ جسپال خاموش ہو گیا۔ چند منٹ بعد اونٹ کی رفتار تیز ہونے لگی اور پھر وہ باقاعدہ بھاگنے لگے، جب وہ آہستہ چل رہے تھے تو ہچکولے کم تھے، لیکن جیسے ہی وہ تیز ہوئے تو جسپال کو لگا کہ جیسے سارا کھایا پیا باہر آ جائے گا۔ بہت شدید ہچکولے تھے۔ اس نے ایک بار سامنے کی طرف دیکھا، اونٹ پھیل کر یوں بھاگ رہے تھے جیسے ان کی ریس لگی ہوئی ہو۔ اس نے اپنا سر اونٹ کی کوہان کے ساتھ لگا دیا۔ وہ خود پر قابو پا رہا تھا۔

نجانے انہوں نے کتنا سفر کیا تھا۔ ایک دو یا چند کلومیٹر، تبھی بائیں جانب سے دور کہیں کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ وہ دو گاڑیاں تھیں۔ اسے لگا کہ جیسے وہ تیزی سے قریب آ رہی ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ سب کیا ہے؟ وہ نوجوان پتہ نہیں کس اونٹ پر تھا۔ اونٹ بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ وہ گاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ اس کی ساری توجہ ان ہیڈ لائٹس کو دیکھنے اور سمجھنے کی طرف لگ گئیں۔ وہ کبھی دکھائی دیتیں اور کبھی ایک دم سے غائب ہو جاتیں۔ یہ آنکھ مچولی کافی دیر تک چلتی رہی۔ اچانک وہ گاڑیاں ان کے عقب میں آ گئیں، پھر اس کے ساتھ ہی ایک فائر ہوا جس نے سناٹے کو چیر کر رکھ دیا۔ فائر کی آواز کیا گونجی تھی کہ اونٹ باؤلے ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے تین فائر مزید ہوئے۔ جسپال کے لیے اونٹ پر بیٹھنا محال ہو گیا ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے بدن کا ہر عضو الگ الگ ہو جائے گا۔ اسے اپنا سانس بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے لگا جیسے ریڑھ کی ہڈی ابھی چکنا چور ہو جائے گی۔ وہ سمجھ گیا کہ عقب سے ہونے والے ہوائی فائر ہیں۔ وہ انہیں مارنا نہیں چاہتے بلکہ گھیر کر ان اونٹوں کو اپنے ٹھکانے پر لے جانے کی کوشش ہو سکتی ہے۔ اونٹ تیزی سے چلتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ لڑکھڑایا، جسپال اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا، وہ اونٹ سے یوں گرا جیسے کسی نے اسے دھکا دے دیا ہو، نیچے

ریت ہونے کے باعث اسے کوئی چوٹ تو نہیں آئی' لیکن وہ آناً فاناً! بھاگتے ہوئے اونٹ کو نہ پکڑ سکا' چند لمحوں تک اس سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ اسے یقین ہوگیا کہ وہ اونٹ کو نہیں پکڑ سکتا تو وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اسے اپنے حواس بحال کرنے میں کتنے ہی منٹ لگ گئے۔ جب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو نہ وہاں اونٹ تھے' نہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس' صحرا کی گونجتی ہوئی مخصوص آواز تھی جو بلاشبہ دہشت پیدا کررہی تھی۔

جسپال چند لمحے بیٹھا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اچانک اسے قطبی ستارے کا خیال آیا۔ وہ اس کے بایاں کاندھے پر تھا۔ اس نے اپنی سمت متعین کی اور چل پڑا۔ یہاں بیٹھے رہنے سے زیادہ چلتے رہنا بہتر ہوسکتا تھا۔ یہاں پر بیٹھ کر اوٹ پٹانگ سوچنے کے اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ چلنے لگا۔ صحرا میں پیدل چلنا بھی کافی حد تک دشوار ہوتا ہے۔ ناہموار زمین پر وہ محتاط انداز میں چلتا چلا جارہا تھا۔ اسے لگا جیسے صدیوں سے اسی طرح صحرا میں سفر کررہا ہے۔ نجانے وہ کتنی دیر تک چلتا رہا تھا۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ پیاس سے زبان سوکھ گئی تھی۔ اسے فقط اتنا یاد تھا کہ عقب میں آسمان پر روشنی کی لکیر دیکھی تھی' پھر اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر ریت پر گر گیا۔

❀
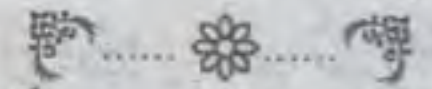
میں یہ محسوس تو کررہا تھا کہ میں ہوں لیکن احساس یہی تھا کہ میرا وزن نہیں اور میں ہوا میں کسی خشک پتے کی مانند اڑ رہا ہوں۔ شاید بندے کا ناتہ جب زمین سے ختم ہوتا ہے اور وہ عالم برزخ کی جانب سفر کرتا ہے تو یہی کیفیت رہی ہوگی۔ میں خود کو دیکھ رہا تھا لیکن آنکھ جھپکنے کی قوت تک مجھ میں نہیں تھی۔ یہی بے وزنی کثافت سے لطافت تک کے سفر میں اپنا احساس دلاتی ہے۔ میں خود پر غور کررہا تھا کہ میں کہاں پر ہوں؟ برزخ یہیں کہیں زمین پر ہے یا آسمان کی وسعتوں میں ہے۔ یا پھر یہ کسی نئی دنیا کا نام ہے۔ یہ ایک ایسا جہان ہے جو دنیا سے ہٹ کر ہے۔ میں لمحہ بہ لمحہ اپنے حواسوں میں آرہا تھا۔ مجھے اردگرد کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں مگر میں ان کی طرف دیکھ نہیں پارہا تھا۔ میں نے ہمت کی اور اردگرد دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ بھی نہ ہوسکا۔ پھر میں نے ساری کوششیں ترک کردیں۔ کچھ دیر یونہی پڑا رہنے کے بعد مجھے آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے اردگرد چند لوگ کھڑے تھے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی مقامی تھے۔ ایک بندے نے مجھے اٹھایا تو پتہ چلا کہ میں چارپائی پر لیٹا ہوا ہوں۔ میرے سر کے اوپر درختوں کا سایہ ہے۔ میں حواسوں میں آتا چلا جارہا تھا۔ مجھے گھونٹ گھونٹ پانی دیا جارہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میرے حواس میرے قابو میں آتے چلے گئے۔ میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ تبھی میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''میں کہاں ہوں؟''

''تم لالا بھوہڑ کے ٹوبے پر ہو۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟'' ان میں سے کسی نے کہا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر باریش آدمی تھا۔ میں نے اپنی حالت کا جائزہ لیا اور بتایا۔

''اس وقت میں بہت اچھا محسوس کررہا ہوں۔ یہ لالہ بھوہڑ کا ٹوبہ کہاں ہے؟'' لاشعوری طور پر میرے لبوں سے یہ سوال نکل گیا۔ اس کے ساتھ دو تین دوسرے آدمی بھی تھے۔ انہی میں سے ایک نے کہا۔

''تم کچھ دیر آرام کرو' کچھ کھاپی کر اپنے حواس قابو میں کرو' پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آؤ' اٹھو' نہالو' تمہاری طبیعت ٹھیک ہوجائے گی۔'' انہی میں سے ایک نے کہا تو میں نے اردگرد دیکھا' دن اچھا خاصا چڑھ آیا تھا۔ روشنی تیز تھی۔ میں نے ہمت کی اور اٹھ گیا۔ وہ مجھے قریب ہی ایک تالاب پر لے گئے جہاں میں نے کپڑا باندھا اور خوب نہایا۔ انہوں نے مجھے ایک صاف دھوتی اور کرتا دے دیا۔ جسے پہن کر میں پرسکون ہوگیا۔ میں ان کے ساتھ پلٹ کر واپس آیا تو ایک اونٹ کے گرد کافی سارے لوگ اکٹھے تھے اور کسی بندے کو اس پر سے اتارا جارہا تھا۔ جب اسے اونٹ سے اتار کر چارپائی پر ڈالا گیا تو میں نے غور سے دیکھا' اس نے شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی لیکن اپنی وضع قطع اور سر کے بالوں سے سکھ معلوم ہورہا تھا۔ یہی رائے ان سب کی تھی۔ وہی ادھیڑ عمر بندہ اسے ہوش میں لانے لگا۔ جبکہ وہیں موجود دوسرے لوگ میری طرف غور سے دیکھتے چلے جارہے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے ہوش آگیا۔ تھوڑا تھوڑا پانی پلانے سے اس کے حواس بحال ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ وہ ریت میں اٹا پڑا تھا' شکل اور نقوش سے' اس کے کپڑے میل نہیں کھارہے تھے۔ بالکل میری طرح اس نے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ میں کہاں ہوں؟ اسے مطمئن کرنے کے بعد اسے پوری طرح حواسوں میں لایا گیا' اور میری طرح ہی اسے نہانے کے لیے تالاب پر لے جایا گیا۔ اگرچہ مجھے بھوک شدت سے ستارہی تھی لیکن میں بے حال نہیں تھا۔ میں چارپائی پر دوبارہ لیٹا تو مجھے نیند آگئی۔ پھر میری آنکھ اس وقت کھلی جب کسی نے پیر کا انگوٹھا پکڑ کر مجھے جگایا۔ کچھ لوگ میرے لیے کھانا لیے کھڑے تھے۔ قریب ہی دوسری چارپائی پر اپنے بال کھولے سکھ بھی بیٹھا ہوا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہمارے سامنے کھانا رکھ دیا گیا' ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے' لیکن ساتھ میں کھانا کھارہے تھے۔ خوب سیر ہوکر کھانا کھاچکے تو برتن ایک تیسری چارپائی پر رکھ کر لیٹ گئے۔ مجھے اس سکھ کا نہیں معلوم بہرحال مجھے نیند آگئی' اور میں سوگیا۔

میری آنکھ کھلی تو شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں سورج غروب ہوجانے کو تھا۔ تیسری چارپائی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے بیدار ہوتا دیکھ کر اس نے کافی حد تک مقامی زبان اور لہجے میں کہا۔

''چلو اٹھو' میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں میں لے جاؤں۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہوگیا۔ اسی طرح اس نے سکھ کو بھی اشارہ کیا' جس نے اپنے بال باندھ لیے تھے اور اس پر چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ وہ نوجوان ہمارے آگے آگے جارہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ ہم اس کی پیچھے پیچھے چلتے چلے جارہے تھے۔ ہم صحرا میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان چلتے ہوئے ایک ایسی جگہ پر آگئے جہاں کافی اونچی جگہ پر گوپا (مقامی جھونپڑی) بنا ہوا تھا۔ ڈھلوان کے آخر میں ایک کچا تھڑا تھا' جس پر خس کی صفیں بچھی ہوئی تھیں۔ کافی سارے بڑے میدان کے ساتھ ایک طرف درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے ساتھ ایک کنواں تھا' جس کے اردگرد دو بیل جتے ہوئے پانی نکال رہے تھے۔ وہ پانی کھال کی صورت میں نجانے کس طرف جارہا تھا۔ ہمیں اس کھلے میدان میں لے جاکر کھڑا

کر دیا گیا۔ ارد گرد کوئی بندہ نہیں تھا۔ بس وہی نوجوان تھا جو ایک طرف ہٹ کر کھڑا تھا اور گوپے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ گوپے میں سے ایک ادھیڑ عمر اسمارٹ جسم کا' درمیانے قد' چھوٹی چھوٹی سفید داڑھی' لمبے بال جو شانوں تک پڑے تھے' اس نے باریک کرتا پہن رکھا تھا جو سفید براق تھا۔ اسی طرح گہرے نیلے رنگ کی دھوتی' پاؤں میں کھسہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ تیکھا ناک' پتلے پتلے ہونٹ' جن پر بھاری مونچھیں بہت رعب دار لگ رہی تھیں۔ وہ ہماری طرف گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا' پھر جیسے اس کھردرے ماحول میں نرم اور خوشگوار ہوا کا جھونکا در آیا ہو۔ اس کی پشت پر ایک کامنی سی لڑکی دکھائی دی۔ گول چہرہ' سیاہ بال' جو بوائے کٹ میں تھے۔ پتلی سی جسامت والی' درمیانے قد کی اس نے سفید شلوار قمیص جس پر سفید اورنج اور پیلے پھول بنے ہوئے تھے پہنی ہوئی تھی' پاؤں میں سیاہ سینڈل تھے۔ وہ بھی گہری نگاہوں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس تیکھے نقوش والی لڑکی کا وہاں ہونا' عجیب سا تاثر پیدا کر رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ کھردرے اور پھیکے ماحول میں جب عورت آ جاتی ہے تو ماحول نرم اور رنگین ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں ہماری طرف چند لمحے دیکھتے رہے' پھر ہمیں وہیں رکنے کا اشارہ کر کے واپس پلٹ گئے۔ اگلے ہی لمحے گوپے میں سے دو نوجوان نکلے۔ وہ گوپے ہی کے سائے میں چارپائیاں بچھانے لگے اور ہمیں وہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ تبھی ہمارے سامنے جدید مشروبات کے ٹن پیک لائے گئے۔ ہم وہ پی رہے تھے کہ وہ دونوں وہیں اس چارپائی کی سامنے والی چارپائی پر آن بیٹھے' جہاں ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔

''میرا نام مہر خدا بخش خان ہے' عرصہ دراز سے یہاں رہتا ہوں' یہ ساری زمینیں اور باڑے میرے ہیں۔ یہ لڑکی یہاں کام کرتی ہے۔ تانی نام ہے اس کا۔'' وہ تعارف کرا کر خاموش ہو گیا تو پہلے میں نے اپنا تعارف کرایا۔ میرے بعد وہ سکھ بولا۔

''میرا نام جسپال سنگھ ہے' میں اصل میں وینکوور کا رہنے والا ہوں۔ پچھلے چند ہفتوں سے بھارت میں تھا۔ رات سرحد پار کروائی گئی ہے مجھے' اب مجھے نہیں پتہ کہ میں کہاں ہوں۔''

''تم جمال مسلمان ہو' اور یہ جسپال سکھ ہے۔ یہ اتفاق ہی ہے کہ تم دونوں ایک ہی رات دو مختلف سمتوں سے ملے ہو۔ بے ہوش' ظاہر ہے تم دونوں میں سکت نہیں رہی ہو گی صحرا کا مقابلہ کرنے کی' یہاں بڑے بڑے لوگ ہار جاتے ہیں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم دونوں چاہے مخالف سمتوں ہی میں سہی لیکن میرے علاقے میں سے پائے گئے ہو۔ یہ تو پکی بات ہے کہ تم دونوں ہی کو کوئی مجبوری ہی اس ویرانے میں لائی ہے' اور یہ بھی سچ ہے کہ تم دونوں کوئی شریف اور معصوم بندے نہیں ہو۔''

''آپ کی ساری باتیں سچ ہیں۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تو وہ جسپال کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اور تم جسپال۔''

''ایسا ہی ہے' لیکن میں اپنے بارے میں اتنا بتا دوں کہ میں جرائم پیشہ نہیں ہوں۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم دونوں جرائم پیشہ ہو یا نہیں' لیکن تم دونوں کے پاس سے جدید پسٹل برآمد ہونا' اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ مار دھاڑ' قتل وغیرہ تم

دونوں کے کریڈٹ پر ضرور ہو گا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا' پھر ہماری طرف سے کوئی جواب سنے بغیر بولا۔ ''آرام کر لیا' کھانا کھا لیا' جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو۔''

''ہمیں تو اندازہ ہی نہیں کہ ہم کہاں پر ہیں' پھر کیسے کس طرح......'' جسپال نے تشویش سے کہا۔

''لڑکے......! میں اس کا جوابدہ نہیں ہوں اور نہ ہی یہ بتا سکتا ہوں کہ تم اس وقت کہاں ہو' یہ میری مجبوری ہے' میں تم لوگوں کو کہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا۔'' اس نے سختی اور روکھے پن سے کہا۔

''ہمیں تو سمت کا اندازہ نہیں کہ ہم کس طرف جائیں گے۔ پلیز آپ ہمیں کسی قریب ترین شہر کے پاس پہنچانے کا بندوبست کر دیں پھر ہم جانیں اور ہماری قسمت۔'' جسپال نے کافی حد تک نرم اور منت بھرے انداز میں کہا۔

''دیکھو جسپال! میں نے تم لوگوں کو پیغام نہیں بھیجا تھا کہ تم یہاں آؤ' خود آئے ہو تو خود ہی چلے جاؤ' اور پھر میں تمہاری مدد کیوں کروں......؟'' اس نے منطقی انداز میں کہا۔

''آپ کیا چاہتے ہیں؟ دولت...... وہ میں......''

''نہیں' مجھے دولت نہیں چاہیے۔ میری تین شرطیں ہیں' ان میں سے کوئی ایک پوری کر دو تو میں شہر کے قریب پہنچا دوں گا۔ جو تم میں پہلے شرط پوری کرے گا' اسے پہلے......''

''کیا ہیں وہ شرطیں۔'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا تو مہر خدا بخش نے میری جانب غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

''میرے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا ہو گی' مجھے ہرا دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔''

''دوسری شرط۔'' جسپال نے تیزی سے پوچھا۔

''یہ ہے کہ اس لڑکی تانی کے ساتھ جو فائٹ کر کے اسے زخمی کر دے گا' اس کی بات مانی جائے گی۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہ ہمارا مذاق اڑا رہا ہو۔

''اور تیسری شرط؟'' میں نے پوچھا۔ اتنے میں ایک سال بھر کا بچھڑا' ایک طرف سے بھاگتا ہوا دوسری طرف نکل گیا' مہر خدا بخش کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ بولا۔

''وہ بچھڑا دیکھا ہے' مجھے بڑا پیارا ہے' جو اسے گرا کر اس کی گردن پر چھری پھیر دے گا' میں اس کی بات مان لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا' پھر بولا۔ ''لیکن یہ یاد رکھنا' ان تینوں میں سے کوئی ایک شرط مان لینے کے بعد اگر ہار گئے تو پھر میری بات ماننا ہو گی۔ میں پھر جب تک چاہوں تم لوگوں کو یہاں رکھوں' جانا ہے تو ابھی چلے جاؤ' ورنہ میں پھر بھاگنے نہیں دوں گا۔''

نجانے کیوں مجھے مہر خدا بخش کی باتیں اوپری لگ رہی تھیں۔ مگر ان باتوں میں دم تھا' ایسا چیلنج جس میں ہمیں اس طرح للکارا گیا تھا کہ وہ ہمیں بے بس ثابت کرنا چاہ رہا تھا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا' پھر انتظار کرنے لگا کہ جسپال کیا کہتا ہے۔ وہ بھی خاموش تھا۔ جس طرح وہ تانی اب تک خاموش تھی۔ اس نے ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا تھا' مگر اس کے حسن کے جلوے ماحول کو خوشگوار بنائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو جسپال نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے جواب دینے کو کہا۔ تب میں نے بہت نرم لہجے میں کہا۔

''جہاں تک آپ کی پہلی شرط ہے' آپ ہمارے لیے ایک بزرگ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہمارا بنتا ہی

نہیں کہ آپ کے مقابلے پر اتریں۔ ہمارے بڑوں نے ہمیشہ بزرگوں کو عزت دینے کا ہی سبق دیا ہے۔ لہٰذا میں ایسا نہیں کرسکتا اور میرا خیال ہے جسپال بھی نہیں۔" میرے یوں کہنے پر جسپال نے نفی میں گردن ہلادی۔

"تو پھر......؟" مہر خدا بخش نے ہنکارے کے سے انداز میں پوچھا۔

"تانی ایک لڑکی ہے' ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا بلا ہے' یا محض ایک کمزور لڑکی' ہم عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتے' اس لیے تانی کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہے ہی نہیں۔" میں نے صاف لفظوں میں کہا تو مہر خدا بخش نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

"تو پھر بچھڑے کو گرا کر اس کی گردن پر چھری پھیر دو' جاؤ میں تم دونوں کو یہ مہلت بھی دے دیتا ہوں کہ جتنے دن چاہے لے لو اور جتنی بار مرضی کوشش کرلو' جس دن بچھڑے کی گردن پر چھری پھیر لو' اس دن جہاں کہو گے' وہاں پہنچادوں گا۔ جاؤ کرو کوشش۔" اس نے کہا تو تانی نے ایک چھری نکال کر میری جانب بڑھادی۔ اس چھری کا پھل بڑا اور چمکدار تھا۔ ان دونوں میں اتنا بڑا اعتماد دیکھ کر میں واقعتاً حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر تانی کے ہاتھ سے چھری لینا چاہی تو اس نے میرے پکڑنے سے پہلے ہی چھری چھوڑ دی۔ میں نے لاشعوری طور پر چشم زدن میں چھری کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی قابو کرلیا۔ جیسے ہی وہ چھری میرے ہاتھ میں آئی، اسی لمحے میں سمجھ گیا کہ دراصل وہ ہمارا امتحان لے رہے ہیں۔ میں تانی کی طرف دیکھ کر مسکرادیا تو اس کی بھی آنکھیں مہین سا ہنس دیں۔ بچھڑا مجھ سے کافی دور کھڑا تھا، اس کی گردن میں رسہ نہیں تھا۔ وہ کھلا ہی چھوڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا تو وہ خاصا پلا ہوا تھا۔ مجھے نہیں اندازہ تھا کہ میں اسے قابو کر بھی پاؤں گا یا نہیں لیکن یہ حوصلہ ضرور تھا کہ بچپن سے لے کر اب تک مویشیوں اور ڈھور ڈنگروں کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ طرح طرح کے جانور ہاتھ سے نکلے تھے۔ میں تیز تیز قدموں کے ساتھ اس بچھڑے کے قریب جا پہنچا۔ شاید اسے بھی احساس ہوگیا تھا کہ میں اس کے لیے آیا ہوں' وہ میری طرف دیکھنے لگا' پھر جیسے الرٹ ہوگیا۔ میں اور وہ آمنے سامنے ہوگئے۔ اس کے تھوڑے تھوڑے سینگ نکل آئے تھے۔ وہ اگر میرے سینگ مار دیتا تو میرے بدن میں دو سوراخ ہوجاتے۔ میرے ایک ہاتھ میں چھری تھی۔ جو اسے گرانے میں مشکل پیدا کر رہی تھی۔ میں نے چھری کو دانتوں سے پکڑا اور ایک دم سے بچھڑے پر چھلانگ لگادی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں بچھڑے پر سوار ہو کر اس کی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤں گا لیکن میرا خیال محض خیال ہی رہا' اس نے اپنے منہ کے تھپڑے سے مجھے ہوا میں اچھال دیا۔ میں کم از کم دس فٹ تک اچھلا ہوں گا۔ اس دوران چھری میرے دانتوں میں سے نکل گئی اور میں دھپ سے زمین پر آ گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ساری ہڈیاں ٹوٹ گئیں ہوں۔ میرا سر ایک دم سے چکرا گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں ابھی بے ہوش ہوجاؤں گا۔ مجھے اپنی بے عزتی کا اتنا زیادہ دکھ نہیں تھا جتنا ہار جانے کے بعد وہاں سے نکل نہ سکنے کا دکھ تھا۔ میں زمین پر پڑا رہا۔ تبھی تانی میرے قریب آئی' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا' میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا تو اس نے سہارا دے کر مجھے اٹھالیا۔ میں چند قدم اس کے سہارے چلا پھر خود ہی قدم بھرتا ہوا چارپائی پر آ گرا۔

"جاؤ جسپال......!" مہر خدا بخش نے کہا۔

"میر اہڈیاں تڑوانے کا ابھی موڈ نہیں ہے۔" اس نے صاف انداز میں کہہ دیا۔

"جمال تو گیا اور......" مہر خدا بخش نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں جانوروں کے ساتھ کیوں ٹکراؤں۔" جسپال نے کاندھے اچکا کر کہا۔

"انسان جانوروں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ سانپ کے زہر کا تو پھر بھی علاج ہے' لیکن انسانی زہر سے بچنا بہت مشکل ہے۔ یہ اتنا سریع الاثر ہوتا ہے کہ کئی نسلوں تک زہر کا اثر نہیں جاتا پھر جاؤ' جا کر انہی درختوں کے پاس جا کر آرام کرو' کل بات ہوگی تم لوگوں سے۔" یہ کہہ کر وہ ایک دم سے اٹھا اور واپس گوپے کی جانب بڑھ گیا۔ میں حسرت سے ان دونوں کو جاتے دیکھتا رہا۔

......❀......
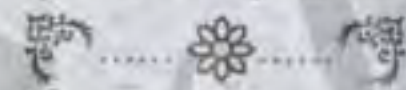
میری ساری رات اذیت میں گزری تھی۔ بچھڑے کی ٹکر سے زمین پر گرنے کی وجہ سے دائیں پسلی اور ران تک یوں تکلیف ہو رہی تھی جیسے کوئی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔ رات گئے تک جسپال میرے ساتھ لفظوں کی حد تک ہمدردی کرتا رہا۔ وہ بے چارہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ کوئی دوا نہیں تھی جس سے کسی حد تک سکون مل جاتا۔ میں نے اسے سوجانے کے لیے کہہ دیا اور خود ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبح کا سورج طلوع ہوا تو مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ ہم ساری رات درختوں کے جھنڈ کے پاس میدان میں چارپائیوں پر پڑے رہے تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ کوئی ذی روح ہمارے اردگرد بھی پھٹکا ہوگا۔ ہم دونوں ہی تھے اور اگر چاہتے تو وہاں سے کسی سمت بھی نکل سکتے تھے۔ مگر جس اعتماد سے مہر خدا بخش نے کہا تھا کہ اگر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ' میری اجازت کے بغیر نہیں جاسکتے تو اس میں ضرور کوئی راز ہوگا۔ رات بھر میں اس کے سیٹ اپ پر غور کرتا رہا تھا۔ سب کچھ عام سا تھا لیکن تانی کا وجود سارے ماحول کو منفرد بنا رہا تھا۔ اس کا قاتل انداز اور اہمیت سے اس کا وجود ماورائی سا لگ رہا تھا۔ یا تو وہ اس ماحول میں مس فٹ تھی یا پھر وہ بہت کچھ تھی۔ اس کا حسن، اس پر سادگی اور پھر اس سے فائٹ کرنے والی بات، یہ سب سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ لوگ بھی اتنے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کل ہی چند لوگ دیکھے تھے' پھر وہ بھی دکھائی نہیں دیئے۔ یہ کیسی پراسراریت تھی؟ کیا مجھے اسے سمجھنا چاہیے یا پھر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے؟ اصل میں میری مجبوری یہی تھی کہ نہ تو مجھے یہ معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اور نہ یہ پتہ تھا کہ جانا کس طرف ہے۔ صحرا کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کی بجائے یہیں پڑا رہنا بہتر تھا۔ مجھے کسی نہ کسی طرح مہر خدا بخش کی خوشنودی حاصل کرنا تھی۔ میں نے ان شرائط پر بھی بہت سوچا تھا' اگر وہ ہم پر مہربان ہوتا تو ایسا سب کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمیں وہ کسی ٹھکانے پر پہنچا دیتا۔ کیا وہ ہمیں یہاں پر روکنا چاہتا ہے؟ اور اگر روکنا ہی چاہتا ہے تو کیوں؟ ایک تو الجھن اور دوسرا تکلیف کے باعث میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میں اپنی غنودگی سے اس وقت نکلا جب ایک نوجوان ہمارے لیے کھانا لے کر آیا۔ جسپال نے چارپائی پر ہی میرا منہ ہاتھ دھلوایا اور پھر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ وہ نوجوان خاموشی سے بیٹھا رہا۔ جب برتن خالی ہوگئے تو وہ انہیں اٹھا کر لے گیا۔

"جمال یار' کہاں آ پھنسے ہیں۔" جسپال نے

دوسری چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''یہاں کم از کم یہ ڈر تو نہیں ہے کہ کوئی آ کر ہمیں گرفتار کر لے گا' پڑے ہیں' جب تک مہر خدا بخش چاہتا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''کب تک ......'' اس نے اکتائے ہوئے کہا' میں ہنستے ہوئے بولا۔

''اب ملاقات ہوئی تو اس سے پوچھ لینا۔ یا پھر باقی شرائط میں سے ایک چن لو۔''

''یہ بندہ عجیب سا لگا ہے مجھے' قنوطی سا' پاگل سا۔'' اس نے اپنے طور پر تبصرہ کیا۔

''مگر میرا یہ خیال نہیں ہے۔'' میں نے اپنے طور پر رائے دی۔

''کیوں؟'' اس نے پوچھا تو میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

''بس میرا خیال ہے۔''

لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ دو تین آدمی ہمیں اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے ساتھ تانی بھی تھی۔ اس بار وہ کاسنی رنگ کے شلوار قمیص میں تھی' جس پر سیاہ پھول بنے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی تو درد نے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ شاید میرے چہرے کے زاویے بگڑے ہوں گے کہ تانی نے انتہائی طنزیہ انداز میں کہا۔

''مرد بنو مرد...... ایک بچھڑے کی ٹکر سے تم چارپائی پر لگ گئے ہو۔''

''کاش میں لوہے کا بنا ہوا ہوتا۔'' میں نے کہا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر مرد نے درد کے بارے میں پوچھ کر میرے جسم پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ درد والی جگہوں پر اچھی طرح ٹٹول لینے کے بعد وہ سیدھا ہو کر بولا۔

''کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی' لیکن پٹھوں کو اچھا خاصا دباؤ ہے' ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور اگر میری دی ہوئی دوا پی لو گے تو آج شام تک بھلے چنگے ہو جاؤ گے۔''

''اگر پی لو گے کا کیا مطلب' اسے دیں یہ پیئے......'' تانی نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔ اگرچہ بات تھوڑی سخت تھی لیکن لہجہ بڑا نرم تھا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں تھا۔ وہ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا' اس طبیب نے اپنی پوٹلی میں سے کئی ساری شیشیاں نکالیں' ان میں سے ایک منتخب کی اور اس میں سے ذرا سا سفوف نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی پانی کا پیالہ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے بھی پھانک کر پانی پی لیا۔

''اب آرام کرو میں شام کے وقت تمہیں پھر دیکھنے آؤں گا۔'' طبیب نے کہا اور واپس چلا گیا۔ اس کے ساتھ باقی بندے بھی چلے گئے۔ تانی کچھ دیر تک ہمیں کھڑی گھورتی رہی پھر وہ بھی پلٹ کر چل دی۔ ایک لمحے کے لیے تو یوں لگا جیسے کھلے صحراؤں میں کوئی ہرنی قلانچیں بھرتی ہوئی پھر رہی ہے۔

''یار اور کچھ ہو نہ ہو' یہ ہمیں مار دے گی۔'' جسپال نے یوں کہا جیسے وہ اس پر سو جان سے فریفتہ ہو گیا ہو۔

''اسے چھیڑنا بھی مت مہر خدا بخش کی منہ چڑھی لگتی ہے۔'' میں نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی میرے منہ سے کراہ نکل گئی۔

''جمال ......! یہ سب ان کا مجھے ڈراوا لگتا ہے کچھ بھی نہیں ہے' تو شام تک اگر ٹھیک ہو جاتا ہے تو پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔'' جسپال نے اکتاہٹ

[..] انداز میں کہا۔

''لیکن مجھے نہیں لگتا کہ ہم ان کی مرضی کے بغیر یہاں سے نکل پائیں گے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی اور اسی وقت [..]وں' پتہ چل جائے گا۔'' اس نے بڑے دعوے سے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ' لیکن پھر بعد میں ان سے کسی ہمدردی کی توقع نہ رکھنا۔ میں جانتا ہوں' ان صحرائی لوگوں کو جی بھر کے مہمان نواز ہوتے ہیں لیکن اگر دشمنی پر اتر آئیں پھر......'' میں نے کہنا چاہا مگر جسپال نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم بتاؤ' پھر کیا کریں؟''

''ایک دو دن آرام کرو' مہر خدا بخش کا رویہ دیکھو' وہ [..]یں ہماری مرضی کے بغیر تو یہاں نہیں رکھ سکتا۔ [میرے] خیال میں وہ ہمارے بارے میں تصدیق کرنا چاہ رہا ہوگا کہ ہم کیسے بندے ہیں۔ وہ جو پسٹل ہم [دونوں] سے نکلے ہیں' اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے' [اور] میں یہ بھی بتا دوں' معصوم ہم دونوں ہی نہیں ہیں۔''

''ایسا تو ہے یار' مگر یہاں سے نکلنا......؟''

''نکل جائیں گے یار' بس صبر کرو۔'' میں نے کہا [ہی] تھا کہ دور گوپے کی طرف سے مہر خدا بخش کے ساتھ تانی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے [ایک] نوجوان بھی تھا' جس کے ہاتھوں میں فلاسک [اور] چیزیں پکڑی ہوئی تھیں۔ وہ لمحہ بہ لمحہ ہمارے [قریب] آتے چلے گئے اور پھر ہمارے پاس آ گئے۔ [میں] اٹھ کر بیٹھنا چاہ رہا تھا کہ اس نے کہا۔

''لیٹے رہو' تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' یہ کہتے [ہوئے] وہ سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا لیکن میں پھر [بھی] اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں درختوں میں سے دو

علامات قیامت

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے سلیمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) اس وقت لوگ اس بیت اللہ کا حج تو کریں گے مگر بادشاہ تو سیر و تفریح کے لیے حج کریں گے، اور مال دار لوگ تجارتی اغراض کے لیے اور مسکین لوگ بھیک مانگنے کے لیے حج کریں گے اور قاری حضرات ریاکاری اور دکھلاوے کے لیے حج کیا کریں گے۔''

(ابن مردویہ در منثور)

نوجوان نکلے انہوں نے ہاتھوں میں سرہانے اور گاؤ تکیے پکڑے ہوئے تھے اس کے علاوہ دیگر کپڑے وہ انہوں نے آناً فاناً بچھا دیئے۔ مجھے لگا مہر خدا بخش وہاں پر ڈیرہ ڈالنا چاہ رہا تھا یا کم از کم وہ ہمارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا' ایک طرف تانی آن بیٹھی' تبھی مہر خدا بخش نے کہا۔

''کون لوگ ہو تم...... مگر یاد رکھنا' میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا پھر مہر خدا بخش کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیا آپ میری طویل بات سن لیں گے۔''

''تم جو کہنا چاہتے ہو اور جب تک کہنا چاہتے ہو کہو' میں سنوں گا۔'' اس نے کہا تو میں نے اپنی طرف سے اختصار کے ساتھ اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی' وہیں کھانا چن دیا گیا۔ انہوں نے ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھایا' خوب سیر ہو چکے تو مہر خدا بخش نے کہا۔

''جمال نے تو اپنی کہانی سنا دی' جسپال اب تم کہو۔''

جسپال نے اپنے بارے میں تفصیل سے بتا دیا۔

بھارت آنے سے لے کر یہاں صحرا میں پہنچنے تک ساری روداد بیان کردی۔ یہاں تک کہ سہ پہر ہوگئی۔ ساری بات سن کر وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''یہ اچھی بات ہے کہ تم دونوں نے سچ بولا' مجھے تم دونوں کے بارے میں رات ہی معلوم ہوگیا تھا۔ جمال تیرے بارے میں صرف آئی جی آفس میں ایک بندے کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ اس نے رات مجھے بتایا کہ تم قیدیوں والی گاڑی سے فرار ہوئے ہو۔ تمہارا جگری دوست چھاکا بچ گیا ہے' وہ زندہ ہے مگر پولیس کی حراست میں ہے۔ جانی شوکر مارا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور بندے...... شاہ زیب کے زیادہ بندے مرے ہیں۔ میں چاہوں تو ابھی اور اسی وقت تمہیں پولیس کے حوالے کردوں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ تم فنکار ہو' چاہو تو ایک نئی زندگی کی ابتدا کرسکتے ہو' پولیس تمہیں بھول جائے گی۔ اور چھاکا' آج شام سے پہلے پولیس حراست سے باہر ہوگا۔'' اس نے بڑی سنجیدگی اور یقین سے کہا تھا' میں حیران رہ گیا۔ میں نے اس پر کچھ کہنا چاہا تھا کہ اس نے اشارے سے مجھے روک دیا' پھر جسپال کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''اور تم......! تمہاری سب سے بڑی خامی وہی ہے جو تم نے مجھے نہیں بتائی۔''

''کون سی؟'' وہ چونکا۔

''جسمیندر سنگھ' جس کا سہارا تم نے لیا' ارے ایسے کام کرنے ہوتے ہیں تو صرف اپنے زور بازو پر بھروسہ کیا جاتا ہے' شطرنج کے مہرے تو کسی دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔''

''آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟''

''میں اسے ہی نہیں' جس ریکٹ کے لیے وہ کام کررہا ہے' میں اس کے چلانے والے کو بھی جانتا ہوں' تم نے محض بچوں والا کھیل کھیلا ہے' اب سنو......! بے چارہ انوجیت پولیس حراست میں ہے اور اس پر دباؤ ہے کہ تمہیں پیش کیا جائے' مگر تم تو یہاں ہو۔ بچن سنگھ نے بہت بڑی غلطی کی کہ تمہیں سرحد پار بھیج دیا۔ یہ بھی ایک طرح سے اچھا ہوا' وہاں تمہاری بنیاد ہی نہیں تھی۔''

''اوہ......! بے چارا انوجیت۔'' جسپال نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو' وہ بھی آج شام سے پہلے پولیس حراست سے باہر آجائے گا' ایف آئی آر بھی لکھوادی ہے کہ رویندر سنگھ نے تمہیں اغوا کرالیا ہے' اس سے بازیاب کروایا جائے۔ نیوز چینل پر جو کچھ بھی چل رہا ہے وہ سب غلط ہے اور ڈرامہ ہے۔'' مہر نے سکون سے کہا تو جسپال نے انتہائی حیرت سے اسے دیکھا۔

''آپ سب کچھ جانتے ہیں......؟''

''ہاں ایک اور بات، کیشیو مہرہ نے تمہاری طرف سے مقدمہ دائر کردیا ہے۔ جائیداد والا، اس کی بھی فکر نہ کرو۔'' یہ کہتے ہوئے مہر خدا بخش کے چہرے پر انتہائی درجے کی سنجیدگی تھی۔ اس پر جسپال یوں ہوگیا جیسے وہ ابھی پاگل ہوجائے گا۔ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا

''آپ کون ہیں؟'' جسپال کے پوچھنے پر وہ دھیرے سے مسکرادیا۔ اس پر تانی بھی ہنس دی' یوں لگا جیسے صحرا میں نقرئی گھنٹیاں بج گئی ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میرے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ جو کچھ دکھائی دے رہا تھا ویسا نہیں تھا۔

(باقی آئندہ)

سوا سیر

خلیل جبار

عورت بیٹی کے روپ میں رحمت' بہن کے روپ میں غیرت اور بیوی کے روپ میں وفا کی پتلی ہوتی ہے لیکن اگر یہی عورت راہ سے بھٹک جائے تو خاندان کے خاندان تباہ کر دیتی ہے۔
انتقام کی ماری ایک عورت کا قصہ' قدرت نے اسے ہر موڑ پر سنبھلنے کا موقع دیا تھا۔

آج میں بہت خوش تھا کہ عقیلہ کے لیے جو رشتہ آیا تھا' اس کے جلد طے ہونے کی امید تھی۔ رشتے کے لیے آنے والوں نے عقیلہ کو دیکھتے ہی پسند کرلیا تھا' میں نے ذہن میں جہیز کی لسٹ بنانی شروع کردی تھی کہ اسے کیا کیا دینا ہے۔ آج مجھے جس قدر خوشی ہورہی تھی اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔

''ارشد آج عقیلہ کے رشتے کے لیے جو آئے تھے وہ اچھے لوگ لگ رہے تھے۔'' نمرہ نے کہا۔

''ہاں بیگم! وہ بہت اچھے لوگ ہیں ہماری بیٹی راج کرے گی۔ فیملی بھی چھوٹی ہے' پیسے کی ریل پیل ہے' بس ان کی طرف سے ہاں ہوجائے تاکہ ہم تیاریاں شروع ہو کردیں۔''

''اب اتنی بھی کیا جلدی ہے۔'' نمرہ نے کہا۔

''بیٹی کے فرض سے آدمی جتنی جلدی سبکدوش ہوجائے اتنا اچھا ہوتا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے بیگم کو دیکھا۔ جواباً وہ بھی مسکرادی۔

ایک ہفتہ گزر گیا' ان لوگوں کی مسلسل خاموشی میرے دل میں شکوک وشبہات پیدا کررہی ہے' میں سوچ رہا ہوں کہ جاکر دانیال سے ملاقات کروں' وہ میرا بچپن کا دوست ہے اور دفتر میں بھی میرا کولیگ تھا۔ اس نے ہی عقیلہ کے رشتے کی بات چلاتے ہوئے ان لوگوں سے ملاقات کرائی تھی' ان دنوں دانیال ایک ہفتے کی چھٹی پر چلا گیا تھا۔ اسی لیے میری اس سے ملاقات نہیں ہورہی تھی' دفتر سے نکلتے ہوئے میرا رخ دانیال کے گھر کی طرف ہی تھا کہ اچانک وہ راستے میں مل گیا۔

''ہاں بھئی کہاں جارہے ہو؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

''میں تمہارے پاس ہی آرہا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خیر تو ہے نا۔'' وہ چونکا۔

''ہاں بھئی خیریت ہی ہے' وہ صاحب کیا نام ہے ان کا ہاں منیر احمد ہی نام تھا ان کا۔'' میں نے کہنا چاہا۔

''اچھا تم منیر احمد کے سلسلے میں مجھ سے بات کرنے آنا چاہتے ہو۔'' دانیال نے کہا۔

''ہاں' ایک ہفتہ گزر گیا ہے انہوں نے پلٹ کر کوئی جواب ہی نہیں دیا۔'' میں نے کہا۔

''ارشد بھائی یہ رشتے دار بڑے کم ظرف اور حاسد ہوتے ہیں کسی کو خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔ تمہارے کسی رشتے دار نے انہیں تمہارے خلاف بُری طرح سے بھر دیا ہے اس لیے انہوں نے اس رشتے سے انکار کردیا ہے اور مجھ پر غصہ ہورہے تھے کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوتے ہوئے بھی ہمیں وہاں بھیج دیا۔ میں نے ان کو کہا کہ اس میں ارشد

صاحب اور ان کی بیٹی کا کوئی قصور نہیں ہے انہوں نے نیک کام کیا تھا لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے ہی بُرا بھلا کہتے رہے۔'' دانیال نے کہا۔

وہ اور بھی کچھ کہہ رہے تھے لیکن میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں' مجھے اپنے رشتہ داروں پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ کم بخت میری بیٹی نہیں لے رہے تھے تو کم از کم اس کی غیر برادری میں شادی ہونے پر رکاوٹ تو پیدا نہ کریں۔ یہ کوئی دسواں رشتہ تھا جو غیر برادری سے تھا' برادری میں رشتہ داروں سے زیادہ میری بھاوج تابندہ نے رشتے میں رکاوٹیں پیدا کی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہو' اٹھتے بیٹھتے میرے خلاف زہر اگلنا اس کا معمول تھا' میں جانتا تھا کہ اسے مجھ سے کیوں بیر ہے' وہ میرے خلاف خوب زہر اگلے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ ہارا ہوا جواری ایسا ہی کرتا ہے لیکن میری بیٹی پر کیچڑ نہ اچھالے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے پرانے محلے میں میری بھاوج کا گھر تھا' بچپن میں ہم ایک ساتھ کھیلے تھے' وہ مجھے بہت پسند کرتی تھی میں نے کبھی اسے اس نیت سے نہیں دیکھا تھا' تابندہ کو میرا بڑا بھائی سمیر پسند کرتا تھا پھر میں کیسے اسے اپنانے کا سوچ سکتا تھا' میرا سارا ذہن پڑھائی کی طرف تھا۔ مجھے افسر بننے کا بہت شوق تھا اس لیے سارا سارا دن کتابوں میں گم رہتا تھا' والد صاحب کی طبیعت بہت خراب رہتی تھی' وہ اپنی زندگی میں ہی سمیر کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ والدہ صاحبہ کو بیٹے کی پسند کا علم تھا اس لیے یہ رشتہ فوراً ہی طے پا گیا' مجھے پسند کرنے والی تابندہ میری بھاوج بن کر آ گئی تھی۔ گھر میں سب ہی خوش تھے میں بھی اس بات پر خوش تھا کہ سمیر بھائی کو ان کی پسند مل گئی تھی۔ تابندہ بھی خوش ہو گئی کہ اسے اچھا شوہر مل گیا ہے میری یہ خوش فہمی تھی وہ اس رشتے پر خوش نہیں تھے بلکہ اس نے مجھے پانے کے لیے رشتے کی ہامی بھری تھی شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ مجھ سے کھل گئی' بھائی جان باہر گئے ہوئے تھے۔ امی' ابو کسی شادی میں گئے ہوئے تھے میں اکیلا کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تابندہ بھابی چائے دینے کے بہانے سے میرے کمرے میں آ گئیں۔

''ارے بھابی! یہ کون سا چائے کا وقت ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جس طرح چاہت اور پیار کا کوئی وقت مقرر نہیں اسی طرح چائے کا بھی کوئی وقت نہیں ہوتا جب دل چاہے چائے پی لو۔'' تابندہ بھابی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''بھابی جملے بازی میں تمہارا جواب نہیں ہے' بندے کو لاجواب کر دیتی ہو۔''

''عورت کا کام ہی مرد کو خوش رکھنا ہے۔ وہ جیسے خوش ہو خوش کر دیتی ہے۔'' وہ میری ٹیبل پر چائے رکھتے ہوئے بولی۔

اس نے بڑے گلے کی قمیص پہن رکھی تھی اس لیے جب وہ چائے رکھنے کو جھکی اس بدن نمایاں ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور حلق خشک ہو گیا۔ رشتے کا احترام کرتے ہوئے بے اختیار میں نے اپنی نظریں نیچی کر لی تھیں۔

''کیا ہوا تمہیں پسینے کیوں آ رہے ہیں؟'' تابندہ بھابی مسکرائیں۔

''کچھ نہیں ایسے ہی۔'' میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''زیادہ پڑھائی انسان کو پاگل بنا دیتی ہے' تفریح بھی کر لیا کرو۔''

''تفریح کے لیے عمر پڑی ہے اچھی نوکری کے حصول کے لیے پڑھائی ضروری ہے' یہ وقت نکل گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی یہی بات تمہیں سمجھانا چاہتی ہوں کہ گیا وقت ہاتھ نہیں آتا' انجوائے کرنے کی عمر ہوتی ہے جب وہ عمر ہی گزر جائے گی پھر کیا خاک مزا آئے گا۔'' کہتے ہوئے وہ کرسی کھینچ کر میرے نزدیک ہو گئی۔ اس کے بدن کا حصہ میرے جسم سے مس ہو رہا تھا' اس کے سراپا کی حدت سے میرے بدن میں گدگدی سی ہونے لگی تھی۔

''بھابھی...... بھابی...... میں تمہاری بات نہیں سمجھ پا رہا' تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔'' میں نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔

''اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہو پھر بھی اتنی چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکنا چاہ رہی تھی اور میں مسلسل نظریں نیچی کیے ہوئے تھا۔ اس نے میری تھوڑی پکڑ کر اوپر کی۔

''ارشد میں اس رشتے کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھی تم جانتے ہو میں نے کیوں ہاں بھری' صرف اس لیے اس طرح میں تمہارے نزدیک رہ پاؤں گی مگر میں تمہارے نزدیک آ کر بھی پیاسی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ مجھ پر اس طرح جھک آئی اس کی گرم گرم سانسیں مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی تھیں۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں' میں نے اپنے اندر ہمت پیدا کی اور بولا۔

''بھابی! کچھ خیال کرو' رشتوں کا احترام ضروری ہوتا ہے' میں جانتا ہوں کہ تم مجھے بچپن ہی سے چاہتی ہو' میں بھی مجبور تھا کہ سمیر بھائی تمہیں پسند کرتے تھے اس لیے میں نے قربانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ تمہیں سمیر بھائی پسند نہیں تھے تو تم منع کر دیتیں کہ تمہیں اس سے نہیں مجھ سے شادی کرنی ہے۔''

''میں عورت ذات تھی جب تم مرد ذات ہو کر یہ نہیں کہہ سکے کہ تم مجھے پسند کرتے ہو تو پھر میں کیسے کہہ سکتی تھی۔'' وہ غصے سے بولی۔

''تابندہ بھابی! جو ہونا تھا ہو گیا اسے بھول جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''تلخ ماضی انسان کسی طرح بھلا سکتا ہے تم مجھ سے دور ہوتے تو شاید میں تمہیں بھول جاتی لیکن میری بدقسمتی ہے کہ دن میں کئی بار تم سے آمنا سامنا ہوتا ہے' ایسے میں کس طرح تمہیں بھلا دوں۔''

''لیکن میں بھائی کی امانت میں کس طرح سے خیانت کر سکتا ہوں' میں کیا کوئی بھی ایسا بے غیرت بھائی نہیں ہو گا جو امانت میں خیانت کرے۔''

''آئے دن اخبارات ایسے واقعات سے بھرے ہوتے ہیں پھر بھی تم ایسی بزدلی کی باتیں کر رہے ہو' میں خود تمہیں موقع فراہم کر رہی ہوں۔ عورت خود موقع دے پھر پکڑے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ہم دونوں تنہائی کا بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں ذرا تمہارے ہمت کر دینے کی ضرورت ہے۔''

''بھابی آج تو تم نے مجھے ایسی باتیں کر لی ہیں آئندہ کبھی مت کرنا ورنہ......''

''ورنہ کیا کرو گے تم؟'' وہ بولی۔

''وہ کچھ ہو جائے گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتیں؟'' میں نے غصے سے کہا۔

"ارشد تم نے مجھے ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا۔" بھابی کے تیور تبدیل ہو چکے تھے۔ وہ مجھے غصے سے دیکھ رہی تھی۔

تابندہ بھابی کو میں ابھی کچھ اور سنانے کے موڈ میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں دروازہ کھولنے چلا گیا' امی ابو شادی سے لوٹ آئے تھے۔ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اچھے موقع پر آ گئے ہیں۔ بات آئی گئی ضرور ہو گئی تھی لیکن تابندہ بھابی بھی ضد کی پکی تھیں وہ ہر صورت میں مجھے گناہوں کے گڑھے میں گرانا چاہتی تھیں جو مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔

تابندہ بھابی نے جب دیکھا کہ میں ان کے قابو میں نہیں آ رہا تو وہ دھمکیوں پر اتر آئیں میں پھر بھی اس کی باتوں میں نہیں آیا۔

ایک رات میں کمرے میں سو رہا تھا کہ تابندہ بھابی چلی آئیں' ایک جھٹکے سے اس نے میرے جسم سے چادر اتار پھینکی میں اس وقت بنیان اور انڈرویئر میں تھا۔

تابندہ بھابی نے اس وقت باریک نائٹی پہنے ہوئے تھیں جس سے ان کا سراپا نمایاں ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کو میرا دل اتھل پتھل ہوا' دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں' لیکن اگلے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھال کیا اور اپنی نظریں جھکا لیں۔

"ارشد کیا بچوں کی طرح نظریں جھکا رہے ہو' حسن خود چل کر تمہارے پاس آیا ہے' بے وقوفی کا مظاہرہ مت کرو۔" یہ کہتے ہوئے وہ مجھ پر گر گئیں' میں فوراً ہی بیڈ سے اٹھ گیا۔

"بھابی میں پہلے بھی تمہیں کہہ چکا ہوں مجھ سے ایسی توقع مت رکھو' میں ہرگز امانت میں خیانت نہیں کروں گا۔"

"ارشد مجھے تم دھمکیاں دے کر دور رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہو لیکن میں آج تمہیں دھمکی دیتی ہوں کہ اگر آج تم نے مجھے دھتکارا تو میں شور مچادوں گی کہ تم نے میری عزت پر حملہ کیا ہے تم اگر یہ چاہتے ہو اس گھر میں تمہاری عزت رہ جائے تو پھر میں جو چاہتی ہوں وہی تمہیں کرنا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے میری طرف بڑھی' خوف سے میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود کو کس طرح سے محفوظ رکھوں اچانک کمرے میں سمیر بھائی کی آواز گونجی۔

"تابندہ! میں نے سب کچھ سن لیا ہے تم کیا تم جیسی ہزار عورتیں بھی آ جائیں تو میرا بھائی ہرگز نہیں بھٹکے گا' میرے بوڑھے والدین کا خیال نہ ہوتا تو تمہیں اسی وقت شوٹ کرنے میں تاخیر نہ کرتا۔"

تابندہ بھابی گھبراتے ہوئے مجھ سے دور ہو گئیں' وہ بہت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھیں' اپنے بچھائے ہوئے جال میں وہ خود ہی پھنس چکی تھیں' وہ مرے مرے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے جانے لگی۔

"اور ہاں میرے بھائی ارشد کو آئندہ کوئی دھمکی مت دینا کیونکہ میں تم جیسی دھوکے باز عورت کی باتوں میں نہیں آؤں گا۔" سمیر بھائی نے کہا۔

بھائی اور بھابی کے جانے پر میں نے اطمینان کا سانس لیا' خدا نے اس آزمائش کی گھڑی میں بھی مجھے ثابت قدم رکھا ورنہ تابندہ نے ایسا جال پھینکا تھا کہ میں بے بس پرندے کی طرح پھنس کر رہ جاتا وہ رات میرے لیے اچھی ثابت ہوئی تھی تابندہ جیسے ہی کمرے سے نکلی' سمیر بھائی کی آنکھ کھل گئی اور وہ انہیں بستر پر نہ پا کر باہر دیکھنے کو گئے' اس وقت کمرے میں گھس رہی تھی' سمیر بھائی بھی تجسس کے ہاتھوں اٹھ کر چلے آئے اور ہم دونوں کی بات چیت سن لی اور مجھ پر ان کا اعتماد اور مضبوط ہو گیا کہ میں نے موقع ملنے پر امانت میں خیانت نہ کی۔

تابندہ کو بھی احساس ہو چلا تھا کہ مجھ پر اس کا جادو نہیں چل سکے گا' اس لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی میں خوش تھا کہ وہ راہ راست پر آ گئی ہے لیکن اس نے شکست نہیں مانی تھی البتہ اپنا انداز بدل لیا تھا اب اسے جب بھی موقع ملتا' میری برائیاں کرتی رہتی تھی میں یہ سوچ کر صبر کر لیتا کہ وہ اب اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی ہے۔

مجھے تعلیم سے فارغ ہونے پر جلد ہی نوکری مل گئی' میں بہت خوش تھا کہ میں نے جو سوچا تھا وہ مل گیا ہے۔ برسر روزگار ہونے پر میرے والدین کو شادی کی فکر ہو گئی تھی ہر والدین یہی چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی میں بچوں کی شادیاں ہو جائیں۔

ایک دن میری پھوپی آمنہ گھر آ کر زور زور سے رونے لگیں' ہم سب پریشان ہو گئے کہ اللہ خیر کرے پوچھنے پر وہ بولیں۔

"میں ان دنوں بہت پریشان ہوں' شوہر کے انتقال پر اکیلی رہ گئی ہوں جوان بیٹی کا ساتھ ہے میری خواہش ہے کہ زندگی میں اس کے ہاتھ پیلے کردوں مگر برادری میں کوئی بھی میری بیٹی کا ہاتھ تھامنے کو تیار نہیں ہے۔"

آمنہ پھوپی بانجھ تھیں جب ان کے دس سال تک اولاد نہ ہوئی لوگوں نے پھوپا اکبر کو مشورہ دیا کہ "ایک بانجھ عورت تمہیں کیا اولاد دے گی تم کسی اور عورت سے شادی کر لو تا کہ بچے ہو جائیں۔"

پھوپا کو پھوپی سے بڑی محبت تھی اور وہ انہیں کوئی دکھ دینا نہیں چاہتے تھے اس لیے انہوں نے دوسری شادی نہیں کی اور آخری عمر تک شادی نہیں کی تھی۔

ایک روز وہ قبرستان میں اپنے والد اور والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گئے جب فاتحہ پڑھ کر لوٹ رہے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ برقع میں کوئی خاتون ایک ٹوٹی قبر میں کچھ پھینک کر بھاگی ہے' پھوپا اکبر نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا مگر وہ نہ رکی انہوں نے جب اس قبر میں جھانک کر دیکھا' قبر میں بچی پڑی بلک رہی تھی۔ انہوں نے قبر میں جھک کر بچی کو نکال لیا' بچی بہت ہی پیاری اور معصوم تھی۔ اسے دیکھتے ہی پیار آ جائے اکبر پھوپا بچی کو گھر لے آئے اور اسے پالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اکبر پھوپا نے بھی اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفہ سمجھ کر قبول کر لیا' دونوں میاں بیوی اسے دیکھ کر جیتے تھے' بچی کی معصوم حرکتوں پر دیر تک ہنستے رہتے تھے۔ جس کو دیکھ دیکھ کر وہ جیتی تھیں آج اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی تھیں کیونکہ انہیں سانس کی تکلیف رہنے لگی تھی انہیں خطرہ ہو چلا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو انہیں سانس ہی نہ آئے اور بیٹی کا فرض ادا کیے بغیر ہی گزر جائیں ان کی زندگی میں ہی کوئی ان کی بیٹی نمرہ کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھا تو پھر ان کے مرنے پر کون اپنائے گا۔ نمرہ خوب صورت تھی وہ جس کی بھی بیوی بنتی اسے اس پر فخر ہوتا' خانہ داری امور میں بھی بہت اچھی تھی۔ امی ابو بھی اس کی بہت تعریف کرتے تھے مجھے وہ بہت پسند تھی۔ اپنے طور پر میں نے اپنے دوستوں میں بھرپور کوشش کی تھی لیکن کوئی اس سے شادی کرنے کو تیار نہ ہوا' سب سے بڑی رکاوٹ اس کا لاوارث ہونا تھا سب یہی کہتے تھے کہ جس کے

ماں باپ کا کچھ پتا نہیں ہے ہم کس طرح اسے اپنے گھر کی زینت بنالیں۔

"ٹھیک ہے پھوپی میں نمرہ سے شادی کروں گا' میں اس کا سہارا بنوں گا۔" میں نے جوش میں آتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔" آمنہ پھوپی نے کہا۔

وہ میری بات سن کر ہکا بکا رہ گئی تھیں انہیں مجھ سے قطعی ایسی امید نہ تھی کہ میں ایسا قدم بھی اٹھا سکتا ہوں۔

"پھوپی جان نمرہ کو کسی نہ کسی کے ساتھ شادی کرکے زندگی بتانی ہے تو پھر میں کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔

"ارشد یہ زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں انہیں جذبات سے نہیں عقل سے کیا جاتا ہے کیا تم ہوش و حواس میں یہ بات کررہے ہو۔" سمیر بھائی نے کہا۔

"ہاں میں ہوش میں ہوں۔" میں نے کہا۔

"بیٹے تم جانتے ہو نا نمرہ لے پالک ہے۔ جذبات میں کیے فیصلے انسانوں کو پریشانی میں مبتلا کردیتے ہیں کہیں تم میری پھول سی بچی کو تکلیف تو نہیں دو گے۔" آمنہ پھوپی نے کہا۔

"پھوپی جان آپ بے فکر رہو میں نمرہ کو کوئی تکلیف نہیں دوں گا' اگر میں اسے تکلیف دوں تو تم میرا گریبان روز قیامت پکڑ لینا۔" میں نے کہا۔

میرے اس فیصلے کو گھر میں سب نے ہی سراہا تھا سوائے بھابی تابندہ کے اس کا خیال تھا کہ ناجانے نمرہ کس کا گناہ ہے جو ہمارے گھر میں آئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے بچوں کے رشتے بھی اس گند کی وجہ سے نہ ہو پائیں۔ میں نے اسے دوٹوک جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تابندہ بھابی بے فکر رہو' شادی ہوجائے میں نمرہ کو اس گھر سے دور رکھوں گا' تمہیں نمرہ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔"

شادی کرکے میں پہلے کرائے کے مکان میں گیا پھر ایک سستا مکان مل جانے پر وہاں شفٹ ہوگیا۔

بچے جوان ہوچکے تھے تابندہ بھابی ابھی تک مجھ سے خار کھاتی تھیں' میں نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا تھا۔ سمیر بھائی کے اچانک انتقال ہوجانے پر میرا تابندہ بھابی کے گھر آنا جانا بہت کم ہوگیا تھا' سالوں میں ہی ان کے یہاں کوئی تقریب ہونے پر جاتا تھا۔ والدین بھی حیات نہیں رہے تھے ورنہ ان کے بہانے جانا پڑتا۔

بیٹی کے جوان ہونے پر میری کوشش تھی کہ کسی طرح اس کے ہاتھ پیلے کردوں مگر تابندہ بھابی کو مجھے زک پہنچانے کا یہ موقع اچھا آگیا تھا' جہاں بھی اس کے رشتے کی بات چلتی وہ ہماری بات خراب کرنے کو پہنچ جاتیں اور وہ ان کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دیتیں کہ پتا نہیں نمرہ کس کا گناہ ہے اس کی بیٹی بھی پتا نہیں کس چلن پر چلے' میں نے کئی بار تابندہ بھابی کے گھر جاکر غصہ بھی کیا لیکن وہ ایسی بھولی بن جاتی کہ جیسے اسے کچھ خبر ہی نہیں اور جو اس طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں وہ دراصل خود رشتہ کرنا نہیں چاہتے خوامخواہ مجھ پر برائی ڈال رہے ہیں۔ میں بھی کب تک یہ باتیں سہتا' مرد تھا غصہ آنا یقینی تھا۔ میں تابندہ بھابی سے انتقام لینے پر تل گیا' میری ذات تک وہ کچھ بھی کہتی میں سہہ لیتا لیکن میری بیٹی پر کوئی کیچڑ اچھالے مجھ سے برداشت نہیں ہورہا تھا۔

ان ہی دنوں ہمارے آفس میں چند اسامیاں

نکلیں انٹرویو کمیٹی کا میں بھی ممبر تھا۔ تابندہ بھابی کا چھوٹا بیٹا نوکری کی تلاش میں تھا اور مختلف دفاتر کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ وہ میٹرک پاس تھا اس ملک میں ایم اے پاس لوگوں کو نوکری نہیں ملتی پھر بھلا ایک میٹرک پاس کو کس طرح نوکری مل سکتی تھی۔ دفتر میں بیٹھے بیٹھے اچانک میرے ذہن میں ایک شاندار منصوبہ آگیا اس سے شاندار تابندہ بھابی سے انتقام لینے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ یہ میرا ایسا انتقام ثابت ہوگا کہ تابندہ بھابی زمین پر اپنا سر پٹخ پٹخ کر شور شرابہ ضرور کرسکتی تھیں لیکن اسے میرے بچھائے جال میں پھنس کر رہ جانا تھا۔

سمیر بھائی کے دو بیٹے نعمان اور کاشان تعلیم کم ہونے پر محنت مزدوری کرکے اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہے تھے۔ شاہ زیب کو سرکاری نوکری کا شوق بھی تھا اور وہ خود بھی دیکھ رہا تھا کہ اس کے بڑے بھائی سرکاری نوکری نہ ہونے پر کس قدر ذلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ غربت کے سبب وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم بھی نہیں دلا پارہے تھے۔ شاہ زیب کے عزائم جوان تھے اور اچھی اور بھرپور زندگی گزارنا چاہتا تھا' اس لیے سرکاری نوکری کے حصول کی خاطر دھکے کھا رہا تھا میں نے اپنے ذرائع سے شاہ زیب کو پیغام بھجوادیا کہ وہ اگر سرکاری نوکری کرنا چاہتا ہے تو مجھ سے رجوع کرے۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا میرے پیغام پر دوڑا چلا آیا' وہ بھی ہمارے دفتر کا اشتہار اخبار میں پڑھ چکا تھا۔

"چچا! کیا مجھے نوکری مل جائے گی؟" وہ بے یقینی سے بولا۔

"کیوں نہیں۔ میں انٹرویو کمیٹی کا ممبر ہوں' ممبران کی مشاورت سے تعیناتی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"چچا جان ایسا ہوجائے تو مزا آجائے گا۔" شاہ زیب نے کہا۔

"شاہ زیب کیا تم ساری زندگی اس نوکری پر کام کرتے رہو گے یا افسر بننا بھی پسند کرو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں چچا جان یہ نوکری میری ترقی کا پہلا زینہ ہوگا' میں اپنے شاندار مستقبل کے لیے بھرپور جدوجہد کروں گا۔" شاہ زیب کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔

"شاہ زیب میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ تمہارا مستقبل روشن ہو مگر تمہیں اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنا پڑے گا' جبھی تم افسر بن سکتے ہو تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔" میں نے کہا۔

"ہاں ہاں میں سمجھ رہا ہوں' میٹرک پر مجھے کسی طرح افسر کی نوکری نہیں مل سکتی۔" شاہ زیب نے کہا۔

"اپنا شاندار مستقبل بنانے کے لیے انسان کو کچھ قربانی بھی دینی پڑتی ہے' کیا تم قربانی کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں میں اپنے شاندار مستقبل کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہوں۔" شاہ زیب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

مجھے اندازہ تھا شاہ زیب سرکاری نوکری کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے پر تیار ہوجائے گا' جیسا میں چاہ رہا تھا وہ میری مرضی کے مطابق ہورہا تھا۔

"تمہیں میری بیٹی عقیلہ سے شادی کرنا ہوگی' جس دن نکاح ہوگا اس دن تمہیں نوکری کا لیٹر مل جائے گا۔" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

عقیلہ کا نام سن کر شاہ زیب کے چہرے پر ایک

رنگ آ رہا تھا اور ایک رنگ جا رہا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا تھا کہ وہ میری بات کا کیا جواب دے۔

''شاہ زیب کس سوچ میں پڑ گئے ہو' کیا نوکری کے لیے اتنی سی قربانی نہیں دے سکتے۔''

''امی کسی طور پر اس رشتے کے لیے تیار نہ ہوں گی۔''

''مجھے معلوم ہے وہ تیار نہیں ہوں گی' اس لیے میں تم سے بات کر رہا ہوں' وہ اپنی زندگی گزار چکی ہیں اب تمہیں ایک بہت بڑی زندگی گزارنی ہے۔ تمہارے سامنے اپنے بھائیوں کی زندگی نمونے کے طور پر موجود ہے انہوں نے تمہاری ماں کے کہنے پر شادی کی اور اب وہ کیسی غربت زدہ زندگی گزار رہے ہیں' تم بھی ان کی طرح زندگی گزارنا چاہتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''نن...... نہیں...... میں ہرگز بھی ایسا نہیں چاہوں گا۔'' وہ کمزور آواز میں بولا۔

''تمہاری ماں چند دن اس شادی پر شور کرے گی اور پھر تمہارا شاندار مستقبل دیکھ کر خاموشی اختیار کر لے گی۔''

''ٹھیک ہے چچا مجھے سرکاری نوکری مل جائے میں عقیلہ سے شادی کر لوں گا۔'' شاہ زیب نے گردن نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔

اس کی جھکی گردن نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ سرکاری نوکری کے حصول میں مسلسل ناکامی پر یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہو گیا ہے' میں نے بڑی رازداری سے شاہ زیب اور عقیلہ کا نکاح چند گواہوں کی موجودگی میں کرا دیا۔ حسب وعدہ میں نے شاہ زیب کو نوکری دلا دی تھی وہ نوکری پا کر بہت خوش تھا اور وہ خوش کیوں نہ ہوتا اس کی دلی مراد پوری ہو چکی تھی۔ تابندہ بھابی کا مجھے علم تھا کہ وہ اس سمجھوتے پر بالکل تیار نہ ہوں گی ایسا ہی ہوا انہوں نے خوب شور شرابہ کیا اور شاہ زیب پر زور دیا کہ وہ عقیلہ کو فوری طلاق دے دے۔ میں نے اس کا پہلے ہی توڑ کر چکا تھا' حق مہر پانچ لاکھ روپے بندھوایا تھا' عقیلہ کو میکے چھوڑنے پر دس ہزار روپے خرچہ ماہانہ دینے کا وہ پابند تھا۔ شاہ زیب اتنی سخت شرائط ہونے کی وجہ سے عقیلہ کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عقیلہ کو میں نے ابھی رخصت نہیں کیا تھا' میری کوشش تھی کہ تابندہ بھابی جب ذہنی طور پر عقیلہ کو رکھنے کے لیے تیار ہو جائے گی پھر میں اسے گھر سے رخصت کروں گا۔

ایک روز دفتر سے گھر لوٹنے پر مجھے کورٹ سے نوٹس (سمن) ملا' وہ دیکھ کر میں سمجھ گیا تابندہ بھابی نے کوئی نیا پتا پھینکا ہے وہ چاہے کچھ بھی کر لے میں نے بھی پکا کام کیا تھا وہ اس پوزیشن میں نہیں رہی تھی کہ میرا کچھ بگاڑ سکے۔

O

شریف لوگوں کا مجرا

سلمیٰ غزل

ہر کہانی کا اپنا اک رنگ اور ذائقہ ہوتا ہے۔ کچھ تحریریں طویل ہونے کے باوجود اپنا اثر قارئین پر نہیں چھوڑتیں اور کچھ انتہائی مختصر ہونے کے باوجود پڑھنے والوں کو ایک راستہ دکھا جاتی ہیں۔
دلوں پر دستک دیتی ایک مختصر لیکن وسیع کینونس کی کہانی جسے آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔

منال سخت پریشان تھی یہ تنہائی اسے ناگن کی طرح ڈس رہی تھی خاندان کے بے شمار لوگوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی وہ تنہا تھی۔ رومان آفس کے کام سے لاہور گیا ہوا تھا اگر ساس کا اخلاقی سہارا نہ ہوتا تو وہ شاید سب کی طنزیہ نظروں اور حقارت آمیز رویوں سے دلبرداشتہ ہو کر جان دے چکی ہوتی مگر بی اماں بھی کیا کرتیں جوڑوں کے درد نے انہیں بستر تک محدود کر دیا تھا اکثر منال ہی انہیں وہیل چیئر پر زبردستی سب کے درمیان لے آتی تھی۔ رومان کی بہن آلشبہ بھی تو منال کا بے حد خیال رکھتی تھی آخر وہ اس کی اکلوتی بھابی تھی مگر اپنی بے پروا طبیعت اور بچپنے کی وجہ سے وہ زیادہ تر اپنی کزنز کے درمیان ہی پائی جاتی تھی۔ اس دو ہزار گز کی کوٹھی میں علیحدہ علیحدہ پورشن ہوتے ہوئے سب ساتھ تھے۔

رومان کے دو چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنے اپنے پورشن میں رہتے تھے' ایک پورشن رومان اس کی بہن آلشبہ اور اس کی امی کا تھا اور چوتھا اس کے چاچو طلحہ کا جو سونا خالی ہی رہتا تھا کیونکہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی اور بزنس کے سلسلے میں وہ اکثر ملک سے باہر ہی رہتے تھے۔ رومان کے والد کی ڈیتھ اس کے بچپن میں ہو گئی تھی تب یہ طلحہ ہی تھا جنہوں نے رومان کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی کیونکہ رومان کی امی گھر کی سب سے بڑے بھائی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے سب کی نظروں میں ماں کا درجہ رکھتی تھیں انہوں نے ہی ایک ماں کی طرح تمام دیور نندوں کو پالا اور ان کی شادی کی تھی کیونکہ ان کی ساس اور سسر دونوں ہی آگے پیچھے بچوں کی کوئی خوشی دیکھے بنا ہی گزر گئے تھے اور رومان کے ابو نے بڑے بیٹے ہونے کا فرض نبھایا اسی وجہ سے آج بھی اس گھر کا شیرازہ نہیں بکھرا تھا' چھوٹے چھوٹے اختلافات کے باوجود سب ایک ہی چھت تلے رہ رہے تھے۔ طلحہ کو گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ایک خاص اہمیت حاصل تھی' خاص طور پر بی اماں کو وہ رومان ہی کی طرح لگتا تھا جس کی شادی کا سب کو بے حد ارمان تھا اکثر بھتیجا بھتیجی مذاق کرتے تھے۔

''چاچو شادی کر لیں ایسا نہ ہو سب کہیں ''پوتے بیاہ گئے کنوارے رہ گئے دادا۔''

مگر وہ ہنس کر ٹال دیتے تھے لیکن بی اماں کو لگتا تھا کہ اندر ہی اندر کوئی دکھ ہے جو اسے گھن کی طرح کھا رہا ہے لیکن لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے کبھی پھوٹ کر نہیں دیا۔ یہ علیحدہ بات تھی کہ 45 سال کے ہو کر بھی ان کی وجاہت اور اسمارٹنس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کنپٹیوں کے سفید بال اور رم لیس گلاسز انہیں اور بھی گریس فل بناتے تھے اکثر رومان مذاق کرتا تھا۔

''چاچو! آپ کے سامنے ہماری دال نہیں گلتی' آپ ہوں تو لڑکیاں نظر اٹھا کر ہمیں نہیں دیکھتیں۔''

رومان کی شادی بھی ایک سسپنس تھی۔ اس نے چپکے چپکے جی میٹ کی تیاری کر کے امتحان پاس کر لیا تب اس نے بی اماں کو بتایا کہ اس کا Lums میں داخلہ ہو گیا ہے بی اماں کی تو جان پر بن آئی کیونکہ ان کی جان تو رومان میں تھی۔ لاہور کراچی سے کوئی اتنا دور بھی نہیں تھا

محبت و عشق

کائنات کی ہر ایک چیز محبت کی وجہ سے قائم ہے اگر زمانے میں محبت نہ ہوتی تو شائد آج کوئی چیز اس قابل نہ ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بولتے ایک دوسرے کی خوشیوں اور چاہتوں میں شریک ہوتے۔ اس دنیا میں اس کائنات میں نجانے محبت و عشق کی کتنی لازوال داستانیں ہیں جو آج بھی ادھوری ہیں۔ جو بھی کسی مجبوری یا غربت مفلسی کی وجہ سے کہیں گم نامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی ایسی داستانوں پہ یقین نہیں کرتا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ کیونکہ کوئی بھی تو محبت نہیں سمجھتا سب ہوس اور لالچ کے مارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کا ڈراما کرتے ہیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سر بے وفائی تو کبھی کسی لڑکے کے ماتھے پہ بے وفائی کا نشان آخر کیوں؟ ہمارے اس معاشرے سے محبت، چاہت ختم ہوتی جارہی ہے۔ کیوں محبت پر سے لوگوں کا یقین اٹھ گیا ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ کس وجہ سے محبت و عشق کو ختم کیا جارہا ہے۔ کیوں محبت ہم سے روٹھتی جارہی ہے۔ ہم سب محبت کرنے والے محبت محبت کا راگ الاپتے ہیں مگر کبھی عملی طور پر اس کی تکمیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ محبت و عشق کی دنیا الگ ہے۔ محبت و عشق کے جذبات الگ ہیں۔ محبت و عشق کا مذہب الگ ہے۔ احساسات منفرد ہیں۔ محبت کے ناکام ہونے پہ دل برداشتہ نہیں ہوتے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات نہیں سجاتے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ محبت جو ہم سے روٹھ کر کہیں بہت دور جارہی ہے اس کو دور نہ جانے دیں اس کا راستا روک لیں اس کے آگے دیوار بن جائیں۔ اگر ہم اپنی سچی محبت کو بچانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ محبت ہمیشہ ہمارے آس پاس رہے ہمارے دلوں میں بسی رہے تو ہمیں ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہوگا جنہوں نے محبت و عشق کے لیے سب کچھ قربان کردیا۔ اپنی زندگی کو محبت و عشق کی نذر کردیا کبھی آپ نے سوچا وہ لوگ کون تھے؟ وہ لوگ ہمارے جیسے ہم میں سے تھے ہماری طرح کھاتے پیتے تھے ہماری طرح چلتے پھرتے تھے مگر ان کے دلوں میں محبت و عشق کا سمندر موجزن تھا۔ اس لیے آج بھی کائنات میں محبت و عشق کی نجانے کتنی داستانیں موجود ہیں اور موجود رہیں گی۔

کتنے عشق و محبت کرنے والے آئے اور آکر چلے گئے اور ان کی قبروں کے نشانات بھی مٹ گئے مگر ان کی محبت و عشق کی داستانیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں اور تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں اور ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔

شکیل اختر...... سنجر پور

مگر وہ چار سال کے لیے رومان کو ہوسٹل بھیجنے کے لیے تیار نہیں تھیں مگر طلحہ کی حمایت سے رومان انہیں منانے میں کامیاب ہوگیا۔

❀......✹......❀

Lums میں پڑھائی ٹف تھی مگر ماحول اچھا تھا گھر والے تو یاد آتے تھے مگر رومان کا دل لگ گیا تھا چار سال پلک جھپکتے گزر گئے کانووکیشن میں طلحہ ملک سے باہر ہونے کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ گھر میں اس کی کامیابی پر جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں گھر میں پہلے پوتے کی حیثیت سے اسے خاص اہمیت حاصل تھی وہ لوٹ آیا لیکن اس کی بیوی کی حیثیت سے ایک لڑکی منال اس کے ساتھ تھی۔ رومان کے دونوں چچا اور پھوپیوں کی نظریں اپنی بیٹیوں کے لیے رومان پر تھیں "ایک انار سو بیمار" اور یہ رومان نہ جانے کس کو بیوی بنا کر لے آیا تھا۔ بی اماں کو شدید دھچکا لگا اور تکلیف تو آشبہ کو بھی ہوئی تھی۔

❀......✹......❀

منال، رومان کے ساتھ منال میں Lums میں پڑھ رہی تھی کلاس فیلو ہونے کی وجہ سے دونوں میں سرسری سی بات چیت تھی کیونکہ رومان ہوسٹل میں رہتا تھا جو کافی

رقبہ پر محیط تھا یونیورسٹی کے اندر ایک طرح سے چھوٹا سا جہاں آباد تھا، ایک دو ریسٹورنٹ کے علاوہ ڈھابے کے کھانے بھی بڑے لذیذ ہوتے تھے پھر کبھی کبھار سب لڑکے لڑکیاں مل کر فوڈ اسٹریٹ یا ڈیفنس کے کسی ریسٹورنٹ میں بھی کھانا کھانے چلے جاتے تھے لیکن منال ان سب سے بالکل الگ تھلگ رہتی تھی۔ اس کی زندگی گھر سے یونیورسٹی اور یونیورسٹی سے گھر تک محدود تھی، اگرچہ لڑکیوں کا ہوسٹل علیحدہ تھا لیکن سب مل کر رات دیر تک تھروبال، بیڈمنٹن اور ٹینس کھیلتے رہتے تھے لیکن منال کا ان سرگرمیوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ اپنی بے پناہ خوب صورتی کے احساس سے بھی بیگانہ تھی، اس کا لمبا قد سانچے میں ڈھلا ہوا جسم اور آہو چشم آنکھیں اسے سب میں ممتاز بناتی تھیں۔ اس کی گھنے سیاہ بالوں کی چوٹی اس کے اسکارف سے جھانکتی رہتی تھی لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ہمیشہ دکھ ہلکورے لیتا رہتا تھا۔ اس کی لڑکے چھوڑ کسی لڑکی سے بھی دوستی نہ تھی لیکن رومان کے خلوص اور بلند کردار سے متاثر ہو کر وہ اس سے کافی حد تک بے تکلف ہوگئی تھی لیکن یہ تعلق صرف دوستی تک ہی محدود تھا اور رومان نے دوستوں کی معنی خیز گفتگو پر سنجیدگی سے وضاحت کردی تھی۔

"دیکھو بھئی منال میری صرف اچھی دوست ہے میں یہاں پڑھنے آیا ہوں عشق لڑانے نہیں، رہا شادی کا سوال تو وہ میں صرف اپنی بی اماں کی مرضی اور پسند سے کروں گا۔"

منال نے بھی جب ادھر اُدھر سے یہ خبر سنی تو اس کے دل میں رومان کی عزت اور بڑھ گئی پھر ایک دم منال کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ منال یقیناً اپنی ماں کا پرتو تھی وہی نین نقش، وہی قد بت، گلشن آرا کو دیکھ کر لگتا تھا کہ عمارت شاندار رہی ہوگی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر وقت اور حالات نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کردیا تھا۔ وہ بے حد نفیس، شائستہ اور بردبار خاتون تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ان کا حسب نسب کسی اعلیٰ

خاندان سے ہو‘ گفتگو میں تہذیب اور شائستگی کا رچاؤ تھا۔ رومان کو ان سے مل کر ہمیشہ ایک اپنائیت کا احساس ہوتا‘ وہ اکثر بیمار رہتی تھیں اور رومان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں روشنی سی آجاتی تھی پھر ان کے منع کرنے کے باوجود جب رومان نے ان کا سر سے پاؤں تک فل چیک اپ کرایا تو اس ہولناک انکشاف نے اس کے پیروں سے زمین کھینچ لی۔ ان کو گال بلیڈر کا کینسر تھا جس کی معیاد بہت کم ہوتی ہے وہ کسی وقت بھی ختم ہوسکتی تھیں۔ رومان کو پریشان دیکھ کر وہ افسردگی سے مسکرائیں۔

”اب عمر کی نقدی ختم ہوئی‘ مجھے اپنی بیماری کا بہت پہلے سے علم تھا۔ صرف اپنی بچی کی وجہ سے کسی کو بتا نہیں رہی تھی۔“ منال اس وقت چائے بنانے گئی ہوئی تھی۔

”مجھے مرنے کا کوئی غم نہیں جی کر بھی کیا کروں گی لیکن منال کی فکر مجھے مرنے بھی نہیں دیتی۔ تم مجھے کسی اعلیٰ خاندان کے چشم و چراغ لگتے ہو‘ اس لیے آج تمہیں وہ بتانے جارہی ہوں جو صرف منال کو پتا ہے اور اسی لیے وہ زندگی کی رنگینیوں اور لطافتوں سے دور سہمی ہوئی چڑیا کی طرح زندگی گزار رہی ہے مگر آج بھی دل کا بوجھ ہلکا نہیں کروں گی تو شاید قبر میں بھی مجھے چین نہیں ملے گا۔“

❀ ◉ ❀

گلشن آرا کی ماں طوائف تھی مگر لوگوں کے طور طریقے دیکھتے ہوئے اس نے بچپن ہی سے اس پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں پڑھنے جاتی تھی‘ جہاں انگریزی کے علاوہ مذہبی تعلیم سے بھی روشناس کرایا جاتا تھا۔ وہاں لڑکیوں کو بغیر اسکارف آنے کی اجازت نہ تھی اور مردوں کا داخلہ ممنوع تھا۔ اس کی ماں کی نگاہیں دوررس تھیں۔ اس کا منصوبہ تھا کہ گلشن آرا کو اس وقت میدان میں اتارے جب وہ تعلیم کے ہتھیار سے لیس ہوچکی ہو اور اس کے سامنے اچھے اچھے سورماؤں کا بھی پتا پانی ہوجائے اور دولت اس کے گھر کی لونڈی ہو‘ مگر ہوا یوں کہ جہاں تعلیم نے گلشن آرا کو شعور دیا وہیں مذہب نے اسے اس پیشے سے نفرت دلادی۔ ماں کے لاکھ اصرار کے باوجود وہ خود کو اس ماحول میں نہ ڈھال سکی‘ اس کی آواز بے حد سریلی اور نغمہ بار تھی اس کی ضد سے مجبور ہوکر ماں نے اسے گانے پر لگادیا اور اس کی آواز کی کشش سے دور دور سے لوگ کھنچے چلے آتے‘ وہ زیادہ تر بڑے بڑے شعراء کی غزلیں گاتی تھی جن میں سوز بھی تھا‘ گداز بھی اور نغمگی بھی۔ کبھی کبھی اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگتی پھر ایک دن ایک ایسے نوجوان کو لایا گیا جو لگتا تھا غلطی سے آگیا ہو یا اس کے ساتھ زبردستی کی گئی ہو۔ اس کے چہرے کی برہمی اور بیزاریت اس کی ناراضگی کا پتا دے رہی تھی اس نے ایک مرتبہ بھی رقص کرنے والی لڑکیوں پر نظر نہیں ڈالی تھی۔ بس سر جھکائے بیٹھا تھا لیکن جب گلشن آرا نے ساز کے ساتھ آواز ملائی۔

”تو پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔“ اس کی نگاہیں گلشن آرا پر جم کے رہ گئیں اور اس کا محفل سے اٹھنا مشکل ہوگیا وہ ایک ہفتے مسلسل آتا رہا۔ گلشن آرا کو بھی اس کی محویت کا کچھ کچھ اندازہ ہورہا تھا‘ ساتھ ساتھ اسے اس شریف نوجوان کو اس محفل میں دیکھ کر دکھ بھی ہوتا تھا پھر اچانک ایک دن اس نے جاتے جاتے سب سے نظریں بچا کر ایک پرچہ گلشن آرا کے ہاتھ میں تھمادیا۔ گلشن آرا نے چپکے سے پڑھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”ایک مشہور ریسٹورنٹ میں اس سے صبح گیارہ بجے ملنے کی درخواست کی گئی تھی۔“ ساتھ میں موبائل نمبر بھی تھا‘ گلشن آرا تذبذب میں پڑگئی ساتھ ہی اس نوجوان کی التجا اسے منزلِ مقصود تک لے گئی۔ صبح کا وقت اس کے لیے مناسب بھی تھا کہ کوٹھے رات کو جاگتے اور دن میں سوتے ہیں پھر یہ ایک ملاقات بے شمار ملاقاتوں کا تسلسل ثابت ہوئی۔ وہ نوجوان اس سے محبت کرنے لگا تھا اس کے الفاظ میں صداقت‘ آنکھوں میں خلوص کی

اللہ کی نصیحت

”(مسلمانو) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بے شک اللہ ہر بات سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو‘ تم میں سے جو لوگ صاحبِ اختیار ہوں، ان کی بھی۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہوجائے تو اگر تم واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کے حوالے کردو۔ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔“

(النساء: ۵۸،۵۹)

افتخار احمد..... کراچی

چمک اور لہجے میں جذبوں کی سچائی تھی۔ گلشن آرا کو اپنی اس زندگی سے نفرت تھی اس لیے اسے یہ موقعہ غنیمت لگا اور اس نے خاموشی سے اس نوجوان سے شادی کرکے کوٹھا چھوڑ دیا۔ محمود علی نے اسے اتنا پیار دیا کہ وہ پچھلی زندگی کی تمام تلخیاں بھول گئی۔ اس نے اس کے نام سے اکاؤنٹ کھول کر ایک بڑی رقم جمع کرادی تھی اور وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی اسے اپنے گھر لے جائے گا۔

گلشن آراء کو اس کے خلوص محبت پر اندھا اعتماد تھا پھر اس کو ضروری کام سے ملک سے باہر جانا پڑا ادھر گلشن آرا کی ماں کے کارندے اس کی بو سونگھتے پھر رہے تھے اس لیے ان سے بچنے کے لیے گلشن آرا نے لاہور کے مضافات میں چھوٹا سا گھر کرائے پر لے کر رہنا شروع کردیا‘ اسے اب محمود علی کا شدت سے انتظار تھا کیونکہ وہ محمود علی کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

”بس بیٹا اس دن سے لے کر آج تک میں اپنے شوہر کا انتظار کررہی ہوں کیونکہ مجھے یقین نہیں کہ وہ بے وفا ہوسکتے ہیں‘ پتا نہیں زمانے نے ان کے ساتھ کیا چال چلی ورنہ دغا بازی ان کی سرشت میں نہیں تھی ان کے ساتھ گزارے ہوئے تین ماہ میری زندگی کا حاصل ہیں‘ ان تین ماہ میں میں اپنی پوری زندگی جی لی اور زندہ رہنے کی حسرت باقی نہیں‘ بس اتنی خواہش ہے کہ اپنی بیٹی کو کسی محفوظ ہاتھوں میں پہنچادوں۔ میری بیٹی کی رگوں میں ایک شریف باپ کا خون ہے۔ میں نے اسے ہر آلائش سے پاک رکھا ہے اور اسی لیے اعلیٰ تعلیم دلائی ہے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکے مگر تم جانتے ہو ہمارا معاشرہ تنہا عورت کو ایک گدھ کی نظروں سے دیکھتا ہے کب اس کو نوچ کھائے۔ میری سانسیں اپنی بیٹی کی وجہ سے اٹکی ہوئی ہیں‘ ویسے بھی وہ بے حد معصوم اور سیدھی سادی ہے۔ دنیا کی چال بازیوں سے نابلد‘ لوگوں کی چالاکیوں سے ناواقف ڈرتی ہوں میرے بعد اس کا کیا بنے گا؟“ وہ مایوسی سے کہتے ہوئے رو پڑیں۔

”آنٹی آپ مایوس نہ ہوں اللہ بہتر کرے گا۔“

رومان کو خود اپنے ہی الفاظ بے معنی لگ رہے تھے اور پھر اچانک ان کی طبیعت بگڑ گئی اور رومان کو منال کے باپ کے بارے میں زیادہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا اور مرتی ہوئی ماں کی التجا پر اسے منال سے نکاح کرنا پڑا۔ اس میں اس کے جذبوں یا محبت کا کوئی دخل نہ تھا مگر جب منال اس کی زندگی میں شامل ہوئی تو جذبوں کو زبان مل گئی اسے لگا شاید وہ پہلے سے ہی اس سے محبت کرتا تھا مگر احساسات کو پہچاننے میں اس سے غلطی ہوئی تھی۔ منال تو ویسے ہی اس سے متاثر تھی‘ اب احترام کے ساتھ ساتھ محبت بھی کرنے لگی تھی وہ اس کے لیے مسیحا ثابت ہوا تھا جس نے اس کی ڈوبتی کشتی کو کنارے سے لگایا تھا۔“ رومان کے خاموش ہوتے ہی بی اماں نے

اسے بڑھ کر گلے لگالیا۔

"بیٹا ایک مرتی ہوئی ماں کی خواہش کا احترام کرکے تم نے انسانیت کی معراج پالی۔" انہوں نے رومان کی پیشانی چوم کر اسے دعائیں دیں تو اس کی روح اندر تک شانت ہوگئی پھر انہوں نے بڑھ کر منال کو گلے لگایا تو وہ ان کی بانہوں میں بکھر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❋ .... ✺ .... ❋

منال نے جلدی ہی اپنے اخلاص اور محبت سے آلشبہ اور بی اماں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ صرف خوب صورت ہی نہیں سلیقہ شعار اور مہذب بھی تھی بی اماں کو اسے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس کو دل جیتنے کا ہنر آتا تھا پھر صوم وصلوٰۃ کی بھی پابند تھی' چچا اس سے متاثر تو چچیاں اور ان کی بیٹیاں خار کھاتی تھیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کو دھکے دے کر اس گھر سے نکال دیں جہاں ہر کوئی اس کی شان میں رطب اللسان تھا کیونکہ وہ ان سب سے بالکل مختلف تھی اس نے Lums سے پڑھا تھا مگر فیشن کے تقاضوں سے ناآشنا سیدھی سادی مذہبی ذہن رکھنے والی جس کا سر ہمیشہ دوپٹے سے ڈھکا اور نظریں جھکی رہتی تھیں' گھر کے مردوں اور عورتوں کے سوا لڑکے لڑکیاں کم ہی نماز پڑھتے تھے لیکن لڑکیاں منال کو نماز کی پابندی کرتے دیکھ کر منہ بنا لیتیں۔

"ہنہہ! طوائف کی بیٹی' انداز تو دیکھو جیسے کسی دارالعلوم سے فارغ التحصیل ہو۔ نری بناوٹ' ڈھکوسلا اور دکھاوا۔"

اسی دوران گھر کے اندر آلشبہ کی کزن کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے' رات گئے تک پورے گھر میں شور شرابا رہتا۔ مہندی مایوں کے لیے ڈانس کی تیاریاں ہوئیں' دعوت تو منال کو بھی ملی۔ مگر اس نے سہولت سے معذرت کرلی اور پھر صبح سب سوئے رہتے اور وہ جلے پیر کی بلی کی طرح اکیلی پورے گھر میں چکراتی رہتی رومان اپنے کسی کام سے چاچو کے پاس گئے ہوئے تھے اور دونوں کو ساتھ ہی آنا تھا آلشبہ نے بھی منال کا کافی اثر لیا تھا لیکن پھر بھی وہ اس ہنگامے کا حصہ بن گئی تھی۔

❋ .... ✺ .... ❋

آج رت جگا تھا پورے ہال میں چاروں طرف کشن لگا کر بیٹھنے کا انتظام اور بیچ میں ڈانس کے لیے جگہ چھوڑی گئی تھی۔ آلشبہ کے مجبور کرنے پر منال بھی بی اماں کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی خود بھی ہال میں آ گئی۔ فل آواز میں ڈیک پر انڈین گانے چل رہے تھے' بی اماں کے اشارے پر آلشبہ بھی منال کے ساتھ کھڑی ہوگئی تھی بی اماں کے چہرے پر دکھ اور شرمندگی کے تاثرات تھے مردوں کے داخلے پر پابندی تھی لیکن لڑکے لڑکیاں آپس میں مل کر خوب ڈانس کررہے تھے۔

کس لڑکے کا ہاتھ کس کی کمر پر ہے کون کس کی بانہوں میں جھول رہی ہے' کسی کو احساس تک نہ تھا محرم و نامحرم کی تفریق مٹ چکی تھی حوا کی بیٹی کوٹھے پر نہ سہی محفل میں محو رقص تھی اور تماش بین بہنوں ماؤں اور بھائیوں کی شکل میں تالیاں بجا بجا کر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے تھے تب اچانک آلشبہ کی کزن ملیحہ نے جو منال سے سب سے زیادہ خار کھاتی تھی۔ اسے اپنی طرف گھسیٹا۔

"آؤ نا کیا کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہو' ہمارا ساتھ دو' کتنا زبردست ڈانس ہورہا ہے۔"

"سوری مجھے ڈانس بالکل نہیں آتا۔" منال نے معذرت کی اور ملیحہ کے تو جیسے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"ارے طوائف کی بیٹی ہو تمہیں ڈانس نہیں آتا۔ ناممکن تم تو خود اچھے اچھوں کو انگلیوں پر نچانے والی ہو پھر ہمارے سامنے ناچنے میں کیسی شرم۔" ملیحہ نے بدتمیزی سے کہا۔

"ملیحہ تم ہوش میں تو ہو کس قسم کی گھٹیا باتیں کررہی ہو' جب بھائی نے منع کردیا تو تم کیوں انہیں مجبور کررہی ہو۔" آلشبہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"ارے تو ایسا کیا کہہ دیا ملیحہ نے جو تمہیں برا لگ گیا۔ طوائف کی بیٹی کو طوائف نہ کہیں تو کیا شریف زادی کہیں۔" ملیحہ کی امی بگڑ کر بولیں اور منال کا ضبط جواب دے دیا۔

"چچی جان میں تو طوائف کی بیٹی ہوں مگر آپ کی بیٹیاں تو شریف زادیاں ہیں اعلیٰ خاندان سے جن کا تعلق ہے پھر یہ سب ہے کیا ہے "شرفاء کا مجرا" جہاں تماش بین اپنے ہی خاندان کے لوگ ہیں صرف کوٹھے پر بیٹھنے کی کسر رہ گئی ہے ورنہ مجھے تو کوئی فرق نظر نہیں آرہا۔"

"ہماری بچیوں کو طوائف کہتی ہے تیری یہ ہمت۔"

"آئینہ ان کو دکھایا تو بُرا مان گئے۔" کے مصداق چچی جان برداشت نہ کرسکیں اور زور سے منال کو دھکا دیا۔ منال اس افتاد کے لیے تیار نہ تھی بُری طرح فرش پر گرتی' مگر گرنے سے پہلے ہی کسی نے اپنی بانہوں کا سہارا دے دیا اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

"یہ سب کیا ہورہا ہے؟" ایک کڑک دار آواز نے سب کی بولتی بند کردی۔ منال کو جونہی احساس ہوا کہ وہ کسی اجنبی کی بانہوں میں ہے تو اس نے کسمسا کر نکلنا چاہا مگر گرفت مضبوط تھی۔

"میری بیٹی گلشن آرا کی اولاد۔" منال نے گھبرا کر نظریں اوپر اٹھائیں اور ایک اجنبی کو دیکھ کر پلکیں جھپکنا بھول گئی۔

"منال یہ میرے چھوٹے چچا اور تمہارے باپ ہیں محمود علی لیکن نک نیم طلحہ ہے۔"

قریب ہی سے رومان کی آواز ابھری تو منال کے رگ و پے میں بجلی سی دوڑ گئی اس کا سر بلند ہوگیا۔

"کہاں تھے آپ بابا! میری ماں آپ کا انتظار کرتے کرتے جاں سے گزر گئی' مگر آپ نے پلٹ کر نہیں پوچھا' کیا یہ تھے آپ کے دعوے؟ ایسی ہوتی ہے محبت بیچ منجدھار میں چھوڑ کر میری ماں کو آپ بھاگ گئے اس عزت کی چادر کی بھی حفاظت نہ کرسکے جس کا آپ نے

ان سے وعدہ کیا تھا۔" منال جذباتی ہو کر چیخ پڑی۔

"تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گا میری جان! مجھے رومان نے سب کچھ بتا دیا ہے، مجھے دکھ تو اسی بات کا ہے کہ گلشن آرا مجھے بے وفا سمجھ رہی ہوگی۔"

"نہیں میری ماں کو آپ کی وفاؤں پر اندھا اعتماد تھا، رومان اس کے گواہ ہیں۔" منال جلدی سے بولی۔

"یہی تو دکھ ہے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا، مجھے تو ناکردہ گناہوں کی سزا ملی تھی اٹلی میں ایک دوست کے ساتھ ہوٹل میں مقیم تھا، مخبری ہوئی چھاپہ پڑا، دوست گرفتار ہوا تو اس کے ساتھ کمرے میں ٹھہرنے کے جرم میں میں بھی ملزم ٹھہرا۔ میں نے یہاں کسی کو بھی نہیں بتایا کہ چھ ماہ مجھ پر کیا گزری، پھر میری کاروباری ساکھ، ایمان داری اور حب الوطنی کام آئی خود دوست نے میرے فیور میں بیان دے کر نیکی کمائی کہ میں اس کے کاروبار میں ملوث نہیں ہوں، بے گناہ ہوں مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، میں نے پورا لاہور چھان مارا مگر تمہاری ماں نہیں ملی مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں باپ بننے والا ہوں۔" پھر وہ بی جان کے آگے جھکتے ہوئے بولے۔ "بی جان میری بیٹی کی رگوں میں ایک عزت دار باپ کا خون دوڑ رہا ہے یہ کسی طوائف کی بیٹی نہیں ہے۔ میری بیوی ایک شریف عورت تھی میں کافی دیر سے ان عزت دار لوگوں کی باتیں سن رہا تھا اور حیران تھا کہ آپ اب تک چپ کیوں ہیں۔" پھر وہ سب کی طرف گھومتے ہوئے مایوسی سے گویا ہوئے۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے کو ملے گا، دوسروں پر انگلی اٹھانے سے پہلے سوچا کریں کہ باقی چار انگلیاں آپ کی طرف اٹھ رہی ہیں۔ آپ لوگ شرافت کے ٹھیکیدار بنتے ہیں مگر وہ نام نہاد شرافت ہے کہاں؟ آپ نے کبھی سوچا ہے پہلے طوائفوں کے علاقے مخصوص تھے مگر اب تو شرفاء کے گھر بھی کوٹھے بن گئے ہیں۔ گھر گھر مجرے ہو رہے ہیں اور گھر کے ہی لوگ تماش بین بن گئے ہیں، معاشرتی رویوں کا یہ تضاد ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔ قرب قیامت کی نشانیاں یہی ہیں نا کہ گھر گھر سے ناچ گانوں کی آوازیں آیا کریں گی تو قیامت تو آ گئی بیٹیاں بھائیوں اور ماؤں کے سامنے ناچ رہی ہیں، یہ قیامت نہیں تو اور کیا ہے۔ شکر ہے میری بیٹی آپ کی بیٹیوں کی طرح شریف زادی نہیں۔" طلحہ کا لہجہ تلخ ہو گیا اور چچی جان کو غصہ آ گیا۔

"طلحہ تم حد سے بڑھ رہے ہو آخر یہ بھی تمہاری بھتیجیاں ہیں۔"

"اسی کا تو دکھ ہے۔" وہ رنجیدہ ہو گئے۔

"آپ نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ ہر انسان ماں کے پیٹ سے معصوم ہی پیدا ہوتا ہے اس کو چور ڈاکو اور لٹیرا بنانے والے تو ہم ہیں، اسی طرح کوئی لڑکی طوائف پیدا نہیں ہوتی۔ اس کو طوائف بنانے والے ہم خود ہیں جو خود کو شرفاء میں شمار کرتے ہیں اگر ہم شریف لوگ کوٹھے پر نہ جائیں تو کبھی کوٹھے پر طوائفیں جنم نہ لیں اور پھر کوٹھے پر جانے والے کو آپ عزت دار اور شریف کیسے کہہ سکتی ہیں۔ آپ سب کو تو منال کو حوصلہ دینا چاہیے تھا اس کی عزت کرنی چاہیے تھی کہ بقول آپ کے وہ شریف زادی نہیں پھر بھی اپنے کردار میں ان نام نہاد شرفاء سے بڑھ کر ہے مگر آپ نے تو الٹا اس کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنایا، یہ کیسا انصاف ہے یہ کہاں کی شرافت ہے میں آپ سے پوچھتا ہوں بی جان! شرفاء کے مجرے اور کوٹھے کے مجرے میں کیا فرق ہے۔" طلحہ نے تلخی سے کہا اور رومان اور منال کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئے، سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور پیشانی شرم سے عرق آلود...... سچ ہے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔"

⌘

بنت حوا

سندیسہ رضا

ہمارے معاشرے میں اولاد خصوصاً بیٹیوں کے مستقبل کے فیصلے گھر کے بڑے بزرگ ہی کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ یہ فیصلے سوچ سمجھ کر اولاد کی بہتری کو مدنظر رکھ کر ہی کرتے ہیں لیکن بعض اوقات انسان کی غلطی نہ صرف انہیں بلکہ اولاد کو بھی خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔
اک بیٹی کا احوال وہ والدین کے فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

"آپی! صبح مومنہ آنٹی کا فون آیا تھا۔ حجاب آپی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا ہے۔ شاید نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے آنٹی بہت پریشان تھیں۔ آپ کو آنے کا کہہ رہی تھیں۔" سنبل نے اپنی بڑی بہن حسینہ کو بتایا۔

"یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ وہ اتنے عرصے سے ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔" حسینہ نے دکھ سے کہا۔

اپنی عزیز از جان دوست کی بیماری کا سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کی امی بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپایا، انہیں اندازہ تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے کس قدر محبت ہے۔ دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ ایک ساتھ پلی بڑھیں، پہلی کلاس سے ایم اے تک کا تعلیمی سفر اکٹھے طے کیا وہ تو ایک دوسرے کو بہنوں سے بھی زیادہ چاہتی تھیں۔ جب دلی تعلق ہو اور کوئی اس قدر عزیز ہو تو ایک دوسرے کے دکھ سکھ سانجھے ہو جاتے ہیں۔

"حسینہ بیٹا پریشان نہ ہو، اللہ فضل کرے گا وہ ٹھیک ہو جائے گی اور اگر تم یوں بے حوصلہ ہو جاؤ گی تو اسے کون سنبھالے گا۔" امی نے پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے کہا۔

حسینہ نے ماں کا شفیق چہرہ دیکھا۔ ماں جو خدا کا پرتو ہے اولاد کے ماتھے کی معمولی سی شکن بھی اس کے سکون کو درہم برہم کر دیتی ہے مگر بے پناہ محبت کرنے والی یہ ہستیاں اپنی عزیز از جان اولاد کو داؤ پر کیوں لگا دیتی ہیں؟ خصوصاً بیٹیوں کو بیٹیاں اس قدر کمتر یا بے وقعت تو نہیں ہوتیں۔ اس قدر سمجھدار اور باشعور ہونے کے باوجود وہ اکثر والدین کے ہاتھوں میں محض کٹھ پتلی بن کر رہ جاتی ہیں جن کی باگ ڈور مکمل طور پر بزرگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

"مگر امی یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ آج کل کے دور میں ایک نہیں ایسی بیسیوں مثالیں مل جائیں گی کہ بیرون ملک کے نام پر لڑکیوں کی زندگیاں کیسے تباہ ہوئیں۔ کچھ نکاح کر کے گئے اور واپس نہ آئے اور گھر بیٹھے بیٹھے ہی لڑکیاں نکاح شدہ بھی کہلائیں اور پھر طلاق یافتہ بھی، کچھ شادی کر کے ساتھ لے گئے اور وہاں پہلے سے ہی ان کی گرل فرینڈ اور بچوں یا بیویوں کو موجود پایا اور پھر وہ کن اذیتوں سے گزرتی ہیں یہ سب فرضی قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق ہیں عبرت ناک حقیقتیں۔ آنکھیں بند کر لینے سے حقائق کی سنگینی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں انہیں بوجھ سمجھ کر کیوں اتار پھینکا جاتا ہے؟"

حسینہ سسک رہی تھی۔ اس کی امی نے اسے سینے سے لگا لیا۔

"حسینہ بیٹا! حوصلے سے کام لو مسائل یوں نہیں سلجھتے دل جوئی اس طرح نہیں کی جاتی کہ خود ہی بیمار ہو جاؤ، تمہیں اس وقت اپنی دوست کو سنبھالنا ہے۔ تھوڑی دیر آرام کر لو پھر اس کی طرف چلی جانا۔" امی اسے سمجھا کر چلی گئیں۔

مگر حسینہ کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ سوچیں اور سوچیں، سوچوں کی یلغار تھی اور وہ تھی، جو لڑکے دیار غیر جاتے ہیں کتنے ہیں جو ثابت قدم رہتے ہیں۔ مغربی حسن کی تجلیوں کی چکا چوند انہیں اندھا کر دیتی ہے۔ وہ اچھائی برائی کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں۔ پرائے دیس جانے والوں کے ساتھ ایسے بندھن باندھنا سراسر زیادتی ہے۔ اس کی نگاہوں میں نگینہ کی تصویر گھوم گئی۔

کتنی اچھی لڑکی تھی، کس قدر ذہین اور خوش شکل اسے بھی لندن کے چکر نے برباد کردیا۔ اس کی امی کا دور پار کا کوئی کزن تھا جس سے اسے بیاہ دیا گیا۔ سب کتنے خوش تھے لڑکی انگلینڈ بیاہی جارہی ہے مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ لڑکا ذہنی مریض نکلا وہ اسے طرح طرح سے اذیت دیتا، کبھی جلتے سگریٹ سے اس کے جسم کے مختلف حصوں کو جلا دیتا۔ کبھی سخت سردی میں کمرے سے باہر نکال دیتا اور پھر سردی میں اسے کانپتا دیکھ کر خوشی محسوس کرتا۔ اس طرح کئی قسم کی اذیتیں اس کا مقدر بن گئیں۔ اس نے چپ سادھ لی تھی۔ کسی جاننے والے سے نگینہ کے متعلق خبر ملی تو اس کا بھائی اسے لے کر آگیا۔ نگینہ تو پہچانی ہی نہیں جارہی تھی۔ اتنی کمزور اور بدشکل کہ دیکھ کر ہر کوئی آنسو بہانے پر مجبور ہوگیا۔ حجاب کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ ہوا۔

حسینہ خیالوں میں گم تھی۔ حجاب کی زندگی کے سب واقعات اس کے سامنے تھے کون سوچ سکتا تھا کہ اتنے خوب صورت آغاز کا ایسا بھیانک انجام ہوگا۔ وہ محبتیں، وہ چاہتیں وہ باغ و بہار محفلیں سب کچھ ہی تو ختم ہوگیا تھا۔ حجاب خوب صورت اور خوب سیرت تھی۔ زندگی سے بھرپور زندہ دل لڑکی جس کے چاروں طرف خوشیاں اور محبتیں تھیں۔ پیسے کی ریل پیل، غم وفکر سے بے نیاز اس کی زندگی پر تو کبھی غم کا سایہ بھی نہ پڑا تھا۔ وہ تین بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی حجاب تھی۔ اس کے بعد دو بھائی تھے۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ چاہنے والے بھائی، جاں نثار کرنے والے والدین اس کی کون سی ایسی خواہش تھی جو پوری نہ ہوئی ہو۔ وہ تھرڈ ایئر میں گئی تو اس کی منگنی اس کے ماموں زاد احراز سے کردی گئی۔ وہ چاہت کے مفہوم سے پوری طرح آشنا بھی نہ تھی کہ معصوم سوچوں کو ایک مرکز مل گیا اور خوب صورت جذبوں کو ایک محور۔

احراز اس کا ماموں زاد بھی تھا بچپن کا ساتھی بھی تھا اور اب منگیتر بھی بن گیا تھا۔ اس نے اپنے تمام جذبے بلاخوف وخطر اس کے نام کردیے۔ جدائی کا اندیشہ تھا نہ مستقبل کا خوف۔ ماموں اور ممانی اس پر صدقے واری ہوتے تھے۔ احراز کی والہانہ نگاہیں ہر دم اس کا احاطہ کیے رہتیں۔ وہ دونوں ہی اس بندھن سے بے حد خوش تھے۔ محبت کے خوب صورت رنگوں کا عکس اس کے چہرے پر تھا جس نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔ چاہے جانے کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے روپ تو چاہنے والے کی نظر سے نکھرتا ہے۔ وہ احراز کی چاہت تھی، اس احساس نے اسے اور بھی معتبر کردیا تھا۔ اس کی اپنی چاہت بھی احراز سے کسی طور کم نہ تھی، مگر عموماً جذبوں کا اظہار مردوں کے حصے میں آتا ہے۔ شدید محبت ہوتے ہوئے بھی عورت اس کا اظہار کرکے اپنی وقعت کھونا نہیں چاہتی وہ عاشق ہوتے ہوئے بھی معشوق رہنا چاہتی ہے۔ طالب ہوکر بھی مطلوب ہی رہتی ہے۔ یہی مشرقی عورت کی آن بان ہے۔

جب حجاب فورتھ ایئر میں گئی تو احراز نے انجینئرنگ پاس کرلی۔ احراز مزید تعلیم کے لیے انگلینڈ جانا چاہتا تھا۔ وہ لائق اور ذہین طالب علم تھا۔ اس کے جانے کی سب تیاریاں مکمل ہوگئیں تو حجاب کے ماموں ممانی کو خیال آیا کہ کہیں اتنا خوبرو ہونہار سپوت کسی گوری میم کے چکر میں نہ پھنس جائے کیوں نہ اس کا نکاح کردیا جائے۔ حجاب کے والدین تھوڑا ہچکچائے تو ضرور مگر یہ سوچ کر کہ گھر کا بچہ ہے دونوں میں اتنی چاہت ہے نکاح تو کرنا ہی ہے خوامخواہ انکار کرکے بدمزگی کرنے کا کیا فائدہ، جبکہ اعتراض کا کوئی معقول جواب بھی نہیں تھا۔ احراز اس نئی تجویز سے بہت خوش ہوا۔ اس نے حجاب سے کہا۔

"میری کوشش ہوگی کہ تم بھی بی اے کے بعد وہاں آجاؤ مجھ سے وہاں تنہا نہیں رہا جائے گا۔"

حجاب تھوڑی پریشان تھی کیونکہ وہ احراز کی لاابالی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی۔ احراز کی ہر خواہش بہت شدید ہوتی تھی مگر پھر ایک دم ختم، وہ کبھی کسی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ وہاں کی رنگینیوں میں کھوکر اسے بھول نہ جائے۔ اس نے اپنے اندیشوں کا اظہار احراز سے بھی کردیا تھا۔ اس کے اندیشے جان کر وہ خوب ہنسا۔

"بے وقوف ہو جو ایسا سوچ رہی ہو، تم تو میری رگ رگ میں بسی ہو اور میں تنہا کب جارہا ہوں تمہارا خیال تو ہر دم

میرے ساتھ رہے گا اور پھر نکاح کے بعد تو مجھ پر تمہارا مکمل حق ہوگا۔ کان سے پکڑ کر بھی بلاسکتی ہو ویسے بھی بندے میں دم مارنے کی مجال کہاں ہے۔" احراز نے بھرپور انداز میں اسے اپنی چاہت کا یقین دلایا۔

"جب جذبے اتنے شدید ہیں تو اس وقت نکاح کی کیا ضرورت ہے تمہارے نام کی انگوٹھی ہی بہت ہے، تعلق تو دلوں کا ہوتا ہے یہ سب واپسی پر ہوتا رہے گا۔" حجاب نے اسے سمجھانا چاہا۔

"مگر تمہیں نکاح پر اعتراض کیا ہے؟" احراز نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

لمحہ بھر کو حجاب نے اپنی حیا بار نظریں اٹھائیں تو اس کی نگاہیں احراز کی جذبے لٹاتی نگاہوں سے مل گئیں۔ لب خاموش تھے مگر آنکھوں سے ہر جذبہ بیان ہورہا تھا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

اور ایک ہفتے بعد وہ نکاح کے بندھن میں بندھ گئی۔

احراز انگلینڈ روانہ ہوگیا اور حجاب پڑھائی میں مشغول ہوگئی۔ بی اے کے امتحان تک تو وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ پڑھائی کی مصروفیت بھی تھی اور احراز کی خوب صورت یادیں بھی۔

فون اور خطوط کا تسلسل قائم تھا۔ رابطے بحال رہیں تو اندیشے سر نہیں اٹھاتے۔ بی اے کے امتحان کے بعد احراز نے اسے وہاں بلانے پر اصرار کیا مگر سب کو اس کی تجویز پر اعتراض تھا کہ اس طرح وہ دل جمعی سے نہیں پڑھ سکے گا۔ لہٰذا اس کے اصرار کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔ حجاب کے ماموں ممانی نے کہا کہ اگر حجاب مزید پڑھنا چاہتی ہے تو ایم اے میں داخلہ لے سکتی ہے۔ مگر احراز نہیں چاہتا تھا کہ وہ مزید پڑھے اور شادی کو التوا میں ڈالے۔

احراز کی چھوٹی بہن ماہا کی بھی منگنی ہوچکی تھی۔ دونوں کی شادی ایک ساتھ کرنے کا پروگرام تھا مگر ماہا کے سسرال والوں کو جلدی تھی۔ اس لیے اس کی شادی کی تاریخ طے کردی گئی۔ احراز نے پھر اصرار کیا کہ حجاب کو رخصت کروالائیں اور انگلینڈ روانہ کردیں لیکن اس بار بھی اس کے اصرار کو کوئی اہمیت نہ دی گئی۔

ماہا کی شادی پر حجاب بجھی بجھی سی تھی کیونکہ احراز بہت کم رابطہ کرنے لگا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ضرور سب سے ناراض ہوگیا ہے۔

یونیورسٹی میں داخلے شروع ہوئے تو حجاب نے بزرگوں کے کہنے پر ایم اے انگلش میں داخلہ لے لیا۔ تنہائی میں احراز کی سرگوشیاں اس کے کانوں میں گونجتی تھیں "گھرداری اور بچوں کی صحیح تربیت کے لیے بی اے تک تعلیم بہت ہے۔" اسے احراز کی رائے سے اتفاق تھا مگر بزرگوں کے فیصلے کے سامنے بے بس تھی۔ ایک روز وہ حسینہ کے کاندھے پر سر رکھ کر رو دی۔

"حسینہ! مجھے احراز کے اصرار گھر والوں کے انکار سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے مستقبل کے اندیشے پریشان کررہے ہیں۔ یہ سب فیصلے مجھ سے متعلق ہیں اور مجھے ہی بولنے کا حق نہیں میں اور احراز اکٹھے پلے بڑھے ہیں میں اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ سچ ہے کہ وہ مجھے بہت چاہتا ہے مگر اس میں مستقل مزاجی نام کو نہیں ہے۔ وہ اتنے سال اس نام نہاد رشتے کے سہارے نہیں گزار سکتا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہے۔ یہ لوگ انکار کرکے اسے ضد پر لا رہے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی بدظن ہورہا ہے۔ اس نے پچھلے خط میں بھی صاف صاف لکھا تھا کہ ایم اے میں داخلہ لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو میں نے سوچا تھا کہ نہیں لوں مگر گھر بیٹھ کر میرا ذہن اور خراب ہورہا تھا میں الجھتی جارہی تھی میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا کروں؟" حجاب نے اندیشوں میں ڈوبی گلوگیر آواز میں کہا۔

"تو یوں کہو کہ تم بھی اس کے پاس جانا چاہتی ہو بے تابی یکطرفہ نہیں آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے۔" حسینہ نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

وہ اس کا دھیان بٹانا چاہتی تھی مگر اس کی چھیڑ چھاڑ سے بھی اس کے چہرے پر کوئی رنگ نہ آیا۔

"حسینہ! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے، یا تو ان لوگوں نے نکاح نہ کیا ہوتا یا اب مجھے وہاں بھیجنے سے انکار نہ کریں۔ اگر کچھ ہوا تو میری زندگی پر اثر ہوگا۔ ان لوگوں کا تو کچھ نہیں

جائے گا۔" اس نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"بے کار وہموں میں گھری ہو تم' کچھ نہیں ہوگا۔ بزرگ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کررہے ہوں گے۔ تمہارے سب اندیشے بے بنیاد ہیں۔" حسینہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" حجاب نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

پھر آہستہ آہستہ احراز نے رابطہ بالکل ہی منقطع کردیا۔ گھر والوں نے باز پرس کی تو مختصر سا جواب ملا کہ بہت مصروف ہوں۔ امتحان ہونے والے ہیں۔

اور پھر چند ماہ بعد وہ کچھ ہوگیا جس کی کسی نے توقع نہیں کی تھی۔ احراز نے وہاں کسی لڑکی سے شادی کرلی اور وہیں سروس بھی شروع کردی۔ مگر یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں خود احراز نے اس کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ اسی لیے حجاب کو ایک امید سی تھی کہ شاید یہ سب کچھ غلط ہو۔ کچھ دن اور گزرے تو احراز کے ابو نے اس سے کافی سخت لہجے میں باز پرس کی اور اس خبر کے متعلق بھی پوچھا جوان تک کسی ذریعے سے پہنچی تھی۔

احراز نے بھی اعتراف کرنے میں دیر نہ کی فوراً ہی اس کا خط مع شادی کی تصویروں کے آ گیا۔

حجاب کی آس ٹوٹ گئی' امید ختم ہوگئی' کہنے سننے کو باقی کچھ نہ رہا۔ سارے اندیشے سچ ثابت ہوئے۔ وہ رشتہ جو اتنی خوشیوں اور آرزوؤں سے جوڑا گیا تھا۔ اس کا انجام آنسوؤں پر ہوا۔ احراز کے اس قدم پر سب ہی دکھ سے چور تھے۔

اس نے کہا تھا "حجاب میری محبت تھی اور کرسٹی میری ضرورت ہے۔ میں محض ماضی کے خوابوں کے لیے مستقبل کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ حجاب جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہوگی۔"

احراز کے اس قدم نے حجاب کی شخصیت کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ حساس دلوں کے لیے تو چار دن کی رفاقت بھی بہت ہوتی ہے اور وہ تو تین سال اس کی ذات سے وابستہ رہی تھی۔ اس نے تو محبت کا ہر رنگ احراز کے حوالے سے دیکھا تھا۔ محبت کے شدید جذبوں سے اسے روشناس کروانے والا احراز ہی تو تھا۔ اس نے تو پہلے اس طور کسی اور کے لیے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا پور پور اس کی چاہت میں ڈوبا ہوا تھا۔

حجاب پتھر کے بت کی مانند خاموش گم صم اور بے جان سی ہوگئی تھی۔ بالکل خالی خالی ہر جذبے ہر چیز سے یکسر لاتعلق۔ توہین کے احساس نے اس کے وجود میں آگ سی لگا دی تھی۔ احراز نے اس پر ایک انگریز لڑکی کو ترجیح دی تھی ایک غیر عورت کو اپنی منکوحہ سے بہتر جانا تھا۔ اس کے لیے محبت ایک کھیل اور نکاح ایک کمزور بندھن ہی تو تھا جس کو اس نے اپنی ضرورت پر قربان کردیا۔ کیسے خود غرض شخص پر اس نے اپنے جذبے لٹائے تھے۔ چاہتیں قربان کی تھیں وہ ہر وقت سوچوں' خیالوں میں ڈوبی خود سے بھی بے نیاز ہوتی جارہی تھی۔ انہیں سوچوں کے باعث اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تو اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔

حسینہ ایک روز پہلے حجاب سے مل کر گئی تھی اس وقت بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے اسے بہت سمجھایا' ذہنی دباؤ سے نکالنے کی کوشش کی مگر سب بے سود رہا۔ اس کے سمجھانے پر بھی وہ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی اس کی باتوں اور دلیلوں کا اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔

آخر وہی ہوا جس کا حسینہ کو ڈر تھا۔ حساس اور محبت بھرا دل رکھنے والی حجاب یہ سب برداشت نہ کرسکی۔ جذبے جتنے شدید ہوں انسان کے اندر ٹوٹ پھوٹ اتنی ہی شدید ہوتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد یہ سب کچھ تو ہونا ہی تھا۔ حجاب کی حالت اس کے لیے غیر متوقع نہیں تھی وہ تو یہ سوچ کر دکھی ہو رہی تھی یہ سب کچھ کب تک ہوتا رہے گا۔ حوا کی بیٹیاں آخر کب تک وفا کے نام پر لٹتی رہیں گی' دھوکے کھاتی رہیں گی شادی کے نام پر یونہی فنا ہوتی رہیں گی۔ آخر کب تک ابن آدم اس کے دل' وفاؤں' محبتوں' جذبوں پر پاؤں رکھ کر گزرتا چلا جائے گا۔

آخر کب تک......!!

روحانی علاج

حافظ شبیر احمد

سائرہ...... کراچی

جواب:۔ ا:۔ والدہ سورۃ فاتحہ پڑھنا جاری رکھیں صرف اور ہر نماز کے بعد سورۃ اخلاص' سورۃ الفلق' سورۃ الناس' 9،9 مرتبہ پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کریں۔

۲:۔ نماز کی پابندی کریں۔ رشتوں کے لیے سورۃ الفرقان آیت نمبر 74'70 مرتبہ اول وآخر 11،11 مرتبہ دورد شریف پڑھ کر اپنے رشتوں کے لیے دعا کریں جلد اور اچھے۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ سورۃ بقرہ پڑھ کر سب افراد اس کا پانی پئیں اور گھر میں بھی چھڑکیں (حمام کے علاوہ)۔

رابعہ کو اعصابی کمزوری ہے علاج کروائیں اور ہر نماز کے بعد "یا قوی" 11 مرتبہ سر پر ہاتھ رکھ کر پڑھیے۔

بھائی کے لیے (جو بیرون ملک ہیں) عشاء کی نماز کے بعد سورۃ الضحیٰ 41 مرتبہ اول وآخر 11،11 درود شریف۔ پڑھتے وقت مقصد ذہن میں ہو۔

م ر...... آزاد کشمیر

جواب:۔ آنکھوں کے لیے بعد نماز عشاء 101 مرتبہ سورۃ ق آیت 22 اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف۔

ط س عطاریہ...... سیالکوٹ

جواب:۔ (۱) بعد نماز فجر سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ (اول وآخر 11،11 مرتبہ درود شریف) اچھے رشتے کے لیے۔

(۲) بستر پر لیٹنے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھ کر 101 مرتبہ پڑھیں۔ "یا باعث" اول وآخر 7،7 مرتبہ درود شریف۔

اللہ آپ کو اپنا قرب نصیب فرمائے آمین۔ گھر والوں کے لیے بھی دعا کریں۔

فرزانہ مظہر...... فاروق آباد

جواب:۔ کوئی جادو نہیں۔

فجر کی نماز کے بعد ایک مرتبہ سورۃ یسین ایک مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اپنے مسئلوں کے لیے دعا کریں۔ دونوں بہنیں۔

ر۔ا۔ش...... فیصل آباد

جواب:۔ وظیفہ جاری رکھیں۔ ساتھ ہی مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد 11'11 مرتبہ سورۃ اخلاص' سورۃ الفلق اور سورۃ الناس بھی پڑھیں۔ رکاوٹیں ختم ہونے کی نیت رکھیں۔ میں بھی دعا کروں گا ان شاءاللہ آپ کا مسئلہ جلد ہو جائے گا۔

بھائی 101 مرتبہ آیات شفاء تیل پر دم کرکے روزانہ لگائے اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

م۔ع...... مانگٹ

جواب:۔ مسئلہ نمبر ا:۔ عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ کاروبار اور قرض کی ادائیگی کے لیے دعا کریں۔ (والد خود پڑھیں)

مسئلہ نمبر ۲:۔ "یا علیم" جب پڑھنے بیٹھیں۔ 11 مرتبہ پڑھا کریں سبق یاد رہے گا۔

امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی کے لیے۔ سورۃ قریش روزانہ 1 تسبیح (اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف) امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک۔ (بعد نماز عشاء)

بھائیوں کے لیے دعا کیا کریں۔

ص ...... گجرات

جواب:۔ رشتہ کے لیے سورۃ الفرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

بعد نماز مغرب 19'19 مرتبہ سورۃ فلق اور سورۃ الناس.

2'3 جادو ہے۔

بعد نماز عشاء 3 مرتبہ سورۃ عبس گھر کے سب افراد پڑھیں روزانہ۔ اپنے اوپر دم کریں۔ پانی پر دم کر کے گھر میں بھی چھڑکیں۔ حمام کے علاوہ۔ (ہفتہ میں 2 مرتبہ)۔

بیرون ملک جانے کے لیے سورۃ القریش روزانہ 1 تسبیح۔

رخشندہ ارشد ...... حافظ آباد

جواب:۔ کاروبار میں ترقی کے لیے۔ سورۃ القریش 111 اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ والد استغفار کی کثرت کریں۔

ریاض بیگم ...... پنڈی گھیپ

جواب:۔ نماز کی پابندی کریں۔ فجر کی نماز کے بعد سورۃ یٰسین اور سورۃ مزمل 1'1 مرتبہ مغرب کے بعد 3 مرتبہ سورۃ عبس۔ پانی پر دم کر کے خود بھی پئیں اور شوہر کو بھی پلائیں۔ (اثرات ختم ہونے کے لیے)۔

عشاء کی نماز کے بعد۔ 101 مرتبہ "یا لطیف یا ودود" اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ پڑھتے وقت تصور ہو کہ اللہ کے اس نام مبارک کی برکت سے ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیدا ہو رہی ہے۔

اسماء ...... سرگودھا

جواب:۔ روزانہ ایک تسبیح درود شریف پڑھ کر دعا کیا کریں۔

غ۔ا ...... عارفوالا

جواب:۔ مسئلہ نمبر1:۔ سورۃ یونس آیت نمبر ۸۱۔۸۲ دونوں آیتیں روزانہ بعد نماز عشاء 111 مرتبہ پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کریں۔ ساتھ ہی ایک بوتل پانی پر بھی۔ پانی پورا دن پئیں رات تک ختم کرلیں۔ اسی طرح روزانہ پڑھ کر دم کیا کریں اور گھر میں بھی پانی چھڑکا کریں۔ حمام کے علاوہ۔ یہ عمل 3 ماہ تک کرنا ہے۔

مسئلہ نمبر2:۔ امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک سورۃ قریش 41 مرتبہ۔ امتحان میں کامیابی کے لیے اول وآخر 7،7 مرتبہ درود شریف۔

ص۔ن ...... مرلے چوک

جواب:۔ بعد نماز فجر 1 مرتبہ سورۃ یٰسین 3 مرتبہ سورۃ مزمل پڑھ کر اپنے مسائل کے لیے دعا کریں۔

قرض کی ادائیگی اور معاش کے لیے۔ بعد نماز عشاء 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کر ایک بوتل پانی پر دم کریں۔ پانی سب گھر والوں کو پلائیں روزانہ۔

11 مرتبہ سورۃ عبس پڑھ کر تیل پر دم کریں۔ اس تیل سے مسرت شاہین کے سر کی روزانہ مالش کریں اور علاج کرائیں۔

ثناء ارم ...... کلر سیداں

جواب:۔ 119'119 بار سورۃ الفلق' سورۃ الناس پڑھ کر 11 دن لگاتار صبح وشام پانی پلائیں۔ پھر ٹیسٹ کرائیں۔ روزانہ ایک بار پڑھ کر آدھا پانی صبح آدھا پانی شام میں پلائیں۔

ش۔ سمندری

جواب:۔ بعد نماز فجر ہر بہن 70 مرتبہ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 بار درود شریف شادی کے لیے۔

رزق کے لیے رات کو سورۃ الاخلاص 111 بار اور بعد نماز فجر سورۃ اخلاص 111 بار ہر بھائی پڑھے۔ رزق میں رکاوٹیں ختم ہونے کی دعا کریں اول وآخر 7'7 بار درود شریف' عرصہ 6 مہینے۔

ساجدہ ...... فیصل آباد

جواب:۔ سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74 بعد فجر 70 بار پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 بار درود ابراہیمی۔

عامرہ ...... سرگودھا

جواب:۔ بعد نماز فجر سورۃ الفرقان کی آیت نمبر 74' 70 بار پڑھیں۔ اول وآخر 11'11 بار درود ابراہیمی۔

4 ماہ تک ان شاء اللہ اللہ کی مدد ہوگی۔

صائمہ صدیق ...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

جواب:۔ مسئلہ نمبر1:۔ بھائی عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کریں کہ جہاں بہتر ہو وہاں روزگار کا ذریعہ بن جائے۔

مسئلہ نمبر2:۔ جب گھر میں چینی آئے اس پر 3 مرتبہ سورۃ مزمل اول وآخر 3'3 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دم کریں۔ چینی گھر کے تمام افراد کے استعمال میں آئے۔

ہفتہ میں ایک مرتبہ سورۃ بقرۃ پڑھیں۔ 1 گیلن پانی پر دم کریں۔ وہ پانی پورے گھر کی دیواروں پر چھڑکیں۔ (حمام کے علاوہ)

رزق کی فراوانی کے لیے سورۃ قریش ہر نماز کے بعد 21 مرتبہ گھر کے تمام افراد پڑھیں۔

نوٹ:۔ (وظائف گھر کا وہ فرد پڑھے جو نماز کا پابند ہو)

ارم کوثر ...... سرگودھا

جواب:۔ عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف' روزانہ۔ دعا کریں کہ اچھے داموں فروخت ہو جائے رکاوٹ نہ آئے۔

مسئلہ نمبر2:۔ گھر والوں کی مرضی میں آپ کی بہتری ہے۔ انہیں قائل کریں۔

غزالہ یونس ...... اٹک

جواب۔ معاشی مسائل کے لیے۔

عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ (گھر کا ایک فرد یا ایک سے زائد پڑھ سکتے ہیں)، دعا بھی کریں۔

رشتے کی رکاوٹ کے لیے۔

فجر اور عشاء میں 41 مرتبہ سورۃ اخلاص اول وآخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ دعا کریں رکاوٹ بندش ختم ہو اور جلد اچھی جگہ رشتہ ہو جائے۔

بھائی ہر نماز کے بعد 41 مرتبہ سورۃ قریش پڑھے۔

ج۔ل ...... گوجرانوالہ

جواب:۔ ماموں اور ممانی کے لیے:۔

"اللھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذبک من شرور ھم" ہر نماز کے بعد 11 بار پڑھیں۔

والدہ کے لیے:۔

سورۃ العصر 21 بار ہر فرض نماز کے بعد پڑھ کر ان کا تصور کر کے پھونک ماریں۔ نیت ہو کہ وہ تاش وغیرہ چھوڑ دیں اور زمین کی طرف توجہ کریں۔

یا رزاق کا ورد مستقل کریں۔

این ایس...... گجرات

جواب:۔ مسئلہ نمبر۱:۔ وظیفہ جاری رکھیں اور عشاء کی نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ عبس پڑھیں (بندش ہے)۔

مسئلہ نمبر۲:۔ ہر نماز کے بعد 11 مرتبہ سورۃ قریش۔

مسئلہ نمبر۳:۔ عشاء کی نماز کے بعد 111 مرتبہ سورۃ قریش اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ بھائی خود پڑھے دعا بھی کریں۔

فائزہ...... کوٹ غلام محمد

جواب:۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔

صبا...... ٹنڈو الہیار

جواب:۔ جو بچیاں اپنی بہنوں اور بھائیوں کا خیال اور ماں باپ کا ادب کرتی ہیں ان کی اکثریت سسرال میں عزت سے رہتی ہیں۔

تھوڑا لکھا بہت سمجھو۔

خالدہ...... خانیوال

جواب:۔ اللہ سے دعا کریں کہ وہ دونوں کے حقوق برابر پورے کریں۔ غلط سوچ ذہن سے نکال دیں۔

یا لطیف یا ودود روزانہ 313 مرتبہ بعد نماز عشاء اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔ تصور میں شوہر کو لا کر دم کریں دعا بھی کریں۔ وہ آپ کی طرف مائل ہوں اور آپ کا خیال رکھیں۔

نگہت...... کراچی

جواب:۔ وظیفہ آپ کی بہن خود کرے۔ بعد نماز فجر سورۃ فرقان آیت نمبر 74' 70 مرتبہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف رشتے کے لیے دعا کریں۔

ہر نماز کے بعد 3 مرتبہ سورۃ الفاتحہ اور 7'7 مرتبہ۔ سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ کر اپنے پورے جسم پر دم کریں، بیماری کے لیے۔

فریحہ...... سلانوالی

جواب:۔ مسئلہ نمبر۱:۔ ہر نماز کے بعد 3 مرتبہ آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کیا کریں۔ شیطانی اثرات ہیں ختم ہو جائیں گے۔

مسئلہ نمبر۲:۔ یا فتاح امتحان شروع ہونے سے نتیجہ آنے تک 101 مرتبہ روزانہ اول و آخر 11'11 مرتبہ درود شریف۔

نوٹ

جن مسائل کے جوابات دیئے گئے ہیں وہ صرف انہی لوگوں کے لیے ہیں جنہوں نے سوالات کیے ہیں۔ عام انسان بغیر اجازت ان پر عمل نہ کریں۔ عمل کرنے کی صورت میں ادارہ کسی صورت ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ای میل صرف بیرون ملک مقیم افراد کے لیے ہے۔

rohanimasail@gmail.com

روحانی مسائل کا حل کوپن برائے دسمبر 2013ء

نام ...... والدہ کا نام ...... گھر کا مکمل پتا ......

......

گھر کے کون سے حصے میں رہائش پزیر ہیں ......

خوشبو سخن

عمر اسرار

مجھے سمیٹ لو!

میرے سچے ساتھی
میرے ریزہ ریزہ وجود کو
سمیٹ لو
کہ میرے اپنوں کے دیے ہوئے
زخموں نے
میرے دل کی بستی اجاڑ دی ہے
میرے سچے ساتھی
میرے حسن میں جھانک کر دیکھو
میری آنکھوں کا سمندر اتر چکا ہے
میرے دل کے صحرا میں خاموشی ہے
میری روح کے دشت میں
لامحدود نفرت ہے
اس نفرت کو مٹا دو
میرے سچے ساتھی
میری روح کی تھکن مٹا دو
میرے لیے زندگی جان کا وبال ہے
مجھے جینا سکھا دو
میرے سچے ساتھی
مجھے سمیٹ لو
مجھے بچا لو

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

میں ہر دور کا انسان

میں ہر دور کا انسان ہوں
ہر بات معلوم ہے مجھے
سیم وزر سے نفرت ہے
تب ہی تو ہر ظلم سہا ہے میں نے
لٹکتے دار پر لوگ دیکھے ہیں
بے بس و مجبور سسکتے
اپنے گھروں میں بند
دم توڑتے
سب میرے سامنے ہیں
کیونکہ
میں ہر دور کا انسان ہوں

وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

کوئی اپنا سہارا ہوگیا ہے
غمِ الفت گوارہ ہوگیا ہے
اسے دیکھا تو دل کو یوں لگا ہے
کوئی روشن ستارہ ہوگیا ہے
نبھانا ہوگا اب تو ساتھ ہر دم
کوئی سنگدل ہمارا ہوگیا ہے
ہمیں اک پل نہیں تسکین جاناں
یہ جب سے دل تمہارا ہوگیا ہے
محبت کے سفر میں دیکھ رانا
میرا یہ دل آوارہ ہوگیا ہے

قدیر رانا...... راولپنڈی

غزل

ساون کی گھٹاؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
رنگین فضاؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
پہلے تو جفاؤں نے جگر چیر دیا ہے
پھر شوخ اداؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
اک عمر ہوگئی گنبد اسرار میں بند ہوں
انجانی صداؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
کچھ بچوں نے ماؤں کو ستایا بھی بہت ہے
کچھ بچوں کو ماؤں نے بڑے زخم دیے ہیں

یہ بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئی
انسان کو خطاؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
جس نخل کو سینچا بھی ہے پالا بھی ہے میں نے
اس نخل کی چھاؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
ہیں اور قمر جن کو شکایت ہے جفا کی
ہم کو تو وفاؤں نے بڑے زخم دیے ہیں
ریاض حسین قمر...... منگلا ڈیم

غزل

غصے سے بات کی تھی
جب اس نے بات کی تھی
اب کے وہ جا نہ پائے
رستے سے بات کی تھی
منہ پھیر کر کسی نے
بوڑھے سے بات کی تھی
تم جلدی لوٹ آنا
یہ چلتے بات کی تھی
کیا تم کو یاد بھی ہے
جو پہلے بات کی تھی
ان سے چھپا کے آنسو
ہنس ہنس کر بات کی تھی
رانا حنیف عاطر...... جھڈو

گیت

میں ہوں اک پگلی دکھیاری
سنو غموں سے بھری میری کہانی
دن رات گزارے ہیں جو عذابوں سے
کنوارے من کی لگی تھی بہاروں سے
کھیل بچپن کے بھلا بیٹھی سبھی
جب دیوانہ گانے لگا تھا آہوں سے
عشق کوئی کھیل نہیں ہے او مستانی
میں ہوں اک پگلی دکھیاری
سنو غموں سے بھری میری کہانی
بنا پتوار کے ناؤ ڈوب جاتی ہے
لڑکی بے وارث ہو تو لٹ جاتی ہے
خواہشوں کے اجالے میں دل ہو جائے اسیر
تو ماں بھی اپنی سوت ہو جاتی ہے
تسکین رہ گئی محبت کی پشیمانی
میں ہوں اک پگلی دکھیاری
سنو غموں سے بھری میری کہانی
اب ٹمٹاتا چراغ رہ گیا گھر کا
حادثہ ہوتا ہے محبت میں عمر بھر کا
موسم بدلتا ہے تو کھلتے ہیں گل
خالی ستاروں سے ہے آنچل سر کا
اکیلی منتظر ہے تخت پر اک رانی
میں ہوں اک پگلی دکھیاری
سنو غموں سے بھری مری کہانی
سید عبداللہ شاہد...... حیدر آباد

غزل

آنکھوں میں خواب اس کے سجاتے رہے ہیں ہم
اس کے لیے بھی خود کو جگاتے رہے ہیں ہم
کھو دیا تھا جس کو ہم نے صحرا کے آس پاس
اس کو تلاش کرنے کو جاتے رہے ہیں ہم
صحرا نشینوں میں گزری تمام عمر میری
صحرا میں بھی کچھ چراغ جلاتے رہے ہیں ہم
کیسے کسی کی یاد نے آنسو دیے ہمیں
خود کو کسی کی یاد میں جلاتے رہے ہیں ہم
دل کے تمام زخم تو لمحوں میں بھر گئے
اس کو وفا کے قصے سناتے رہے ہیں ہم
اس نے تو مڑ کے ہم کو بھی دیکھا نہیں کبھی
ہاتھوں سے نام اس کا مٹاتے رہے ہیں ہم
کل شب کسی کی یاد نے اتنا رلا دیا

آنکھوں سے اپنی آنسو بہاتے رہے ہیں ہم
کیسے بتائیں اب ہم کسی کو پھر جاوید
روٹھے ہوئے یار بھی مناتے رہیں ہم
محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

جیون چار دن کا

آ جاؤ جان کیف
زندگی کو سمجھیں ہم
محبت، چاہت اور
عاشقی کو سمجھیں ہم
چار دن کا ہے جیون
حسن پہ ناز کیسا
ہونا ہے فنا آخر
مٹنا ہے نشاں آخر
دو باتیں محبت کی
بس رہ جاتی ہیں
ہمیں رنگ چڑھے کتنے
معصوم سے چہروں پر
ہیں رنگ چڑھے کتنے
ہم سب کے دلوں پر
ہر کوئی پریشان ہے
ہر کوئی ہراساں ہے
پھر کس نے بدلنا ہے
یہ سارا سماں آخر
آؤ نکال دیں میل
کدورتیں ساری
اپنے دلوں سے
ہاں اتار پھینکیں
چہروں پر جو
اوڑھ رکھے ہیں نقاب
سچائی کو پالیں ہم
سادگی کو سمجھیں ہم
عبدالمالک کیف

دنیا

بڑی ہی ستم گر اور ظالم ہے، یہ دنیا
ہنستے ہوؤں کو بھی رلاتی ہے، یہ دنیا
جو آزاد ہوں خود مختار ہوں من کے
پردوں میں بھی ان کو بٹھاتی ہے، یہ دنیا
نہیں ہوتی برداشت ان سے کسی کی آزادی
پاؤں میں زنجیریں ڈال دیتی ہے، یہ دنیا
اگر کہہ بھی دیں غلطی سے کسی کو "اپنا"
بدلہ وفا کا جفاؤں سے دیتی ہے، یہ دنیا
کسی کو چاہے یا نہ چاہے، یہ من کی مرضی
بستے ہوؤں کو تو اجاڑ دیتی ہے، یہ دنیا
ہم بے قصور تھے مگر بن گئے قصوروار
کسی کی بے گناہی کو کب مانتی ہے، یہ دنیا
ہم پورے نہ اتر سکے، ان کی آزمائشوں پر
سزائیں بڑی ہی سخت دیتی ہے، یہ دنیا
نجانے کیا کیا خطا ہو گئی ہے ہم سے
یونہی مفت میں بدنام کر دیتی ہے، یہ دنیا
ہمیں تو پہلے ہی غموں نے ہے ستایا
کیوں غموں کے انبار لگا دیتی ہے، یہ دنیا
کہتے ہیں ہم سے، سنبھل جاؤ صرف ایک بار
سنبھلنے والوں کو تو پھر گرا دیتی ہے، یہ دنیا
بتلاؤ کس سے رکھیں ہم وفا کی امید
یارو بڑی ہی بے وفا ہو گئی ہے، یہ دنیا
کہا تو تھا تمہیں، نہ چلو ان راہوں پر رانی
دل کے جلتے دیے بجھا دیتی ہے، یہ دنیا
عاصمہ رانی...... گوجرانوالہ

اعتراف محبت

کیا کہنا ضروری ہے

مجھے تم سے
محبت ہے
میرے شب وروز
تیری ذات کا قصہ ہیں
میری آنکھوں میں فقط
تیری محبت کے
دیپ جلتے ہیں
دل کی ہر دھڑکن
تیرا نام لکھتی ہے
میرے لبوں پر
تیری چاہت کے گیت
رقص کرتے ہیں
میں
بن تیرے، ادھوری ہوں
بن تیرے، زندگی میں
تاریکی ہی تاریکی ہے
کوئی روشنی نہیں
جانتے تو ہو جانم!
میری ذات کا
تم حصہ ہو
میرے نام کا
تم حوالہ ہو
تو پھر بتاؤ جانم!
کہنا یہ ضروری ہے
کہ
مجھے تم سے
محبت ہے
مجھے تم سے محبت ہے

زوبیہ جہد......کھیالی

غزل

ہوگئے عشق میں، اپنے حالات کیا
ملے گی اس درد سے کبھی نجات کیا؟
وہ وصل کی راتیں، وہ وصل کے دن
تم بھول گئے وہ دلنشیں لمحات کیا؟
یہ اُجڑا ہوا سا بیاباں ہے جو
مت پوچھو یہاں پہ تھے باغات کیا
ساری دنیا ہی چھوٹ گئی ہو جیسے
تم نے ہاتھ سے چھڑایا ہاتھ کیا
ہم سے پوچھتے ہیں، وہ بڑی سادگی کے ساتھ
لکھتے رہتے ہو ندیم تم دن رات کیا؟

ندیم اقبال......منچن آباد

غزل

تنہائیوں کا عذاب کیسا لگتا ہے
جاننا ہو تو اس عذاب سے گزر کر دیکھو
کنارے پر کھڑے رہ کر کیا جان سکو گے گہرائی کو
دیکھنا ہو تو سمندر میں ڈوب کر دیکھو
سہارے کسی کے زندگی بسر کر دینا آسان ہے
اکیلے کبھی اس زندگی کو گزار کر دیکھو
جو ہم پر بیتی ہے وہ کیا بتائیں تمہیں
کبھی اپنوں کے ہاتھوں سے سنگ کھا کر تو دیکھو
عمر کردیں گے اس کے نام جو چل دے دو قدم ساتھ
لیکن کس سے کہیں کہ ایسا کرکے تو دیکھو

کلثوم ریاض......گوجرانوالہ

آگہی ذوق

عفان احمد

اللہ کی نصیحت

"(مسلمانو) یقیناً اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ یقین جانو اللہ تم کو جس بات کی نصیحت کرتا ہے وہ بہت اچھی ہوتی ہے۔ بے شک اللہ ہر بات سنتا اور ہر چیز کو دیکھتا ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو۔ تم میں سے جو لوگ صاحبِ اختیار ہوں، ان کی بھی ۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہوجائے تو اگر تم واقعی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اسے اللہ اور رسول کے حوالے کردو۔ یہی طریقہ بہترین ہے اور اس کا انجام بھی سب سے بہتر ہے۔"

(النساء:۵۸،۵۹)

افتخار احمد......کراچی

حضور پاک ﷺ نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اقرع بن حابس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسنؓ کا بوسہ لے رہے تھے۔ تو وہ بولا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میرے دس بچے ہیں میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جو (بچوں اور یتیموں اور عاجزوں اور ضعیفوں پر) رحم نہ کرے، اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہ کرے گا۔" (مسلم)

آفتاب خان......کراچی

محبت و عشق

کائنات کی ہر ایک چیز محبت کی وجہ سے قائم ہے، اگر زمانے میں محبت نہ ہوتی تو شاید آج کوئی چیز اس قابل نہ ہوتی کہ ہم ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے بولتے ایک دوسرے کی خوشیوں اور چاہتوں میں شریک ہوتے۔ اس دنیا میں اس کائنات میں نجانے محبت و عشق کی کتنی لازوال داستانیں ہیں جو آج بھی ادھوری ہیں۔ جو ابھی کسی مجبوری یا غربت مفلسی کی وجہ سے کہیں گم نامی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ کوئی ایسی داستانوں پر یقین نہیں کرتا۔ کوئی کرے بھی تو کیسے؟ کیونکہ کوئی بھی تو محبت نہیں سمجھتا سب ہوس اور لالچ کے مارے لوگ ایک دوسرے سے محبت کا ڈراما کرتے ہیں۔ کبھی کسی لڑکی کے سر بے وفائی تو کبھی کسی لڑکے کے ماتھے پر بے وفائی کا نشان آخر کیوں؟ ہمارے اس معاشرے سے محبت، چاہت ختم ہوتی جارہی ہے۔ کیوں محبت پر سے لوگوں کا یقین اُٹھ گیا ہے؟ کبھی ہم نے سوچا کہ کس وجہ سے محبت و عشق کو ختم کیا جارہا ہے۔ کیوں محبت ہم سے روٹھتی جارہی ہے۔ ہم سب محبت کرنے والے محبت محبت کا راگ الاپتے ہیں مگر کبھی عملی طور پر اس کی تکمیل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ محبت و عشق کی دنیا الگ ہے۔ محبت و عشق کے جذبات الگ ہیں۔ محبت و عشق کا مذہب الگ ہے۔ احساسات منفرد ہیں۔ محبت کے ناکام ہونے پر دل برداشتہ نہیں ہوتے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات نہیں سجاتے بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ محبت جو ہم سے روٹھ کر کہیں بہت دور جا رہی ہے اسے کو دور نہ جانے دیں اس کا راستا روک لیں اس کے آگے دیوار بن جائیں۔ اگر ہم اپنی سچی محبت کو بچانا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ محبت

ہمیشہ ہمارے آس پاس رہے ہمارے دلوں میں بسی رہے تو ہمیں ان لوگوں کے نقش قدم پر چلنا ہوگا جنہوں نے محبت و عشق کے لیے سب کچھ قربان کردیا۔ اپنی زندگی کو محبت و عشق کی نذر کردیا کبھی آپ نے سوچا وہ لوگ کون تھے؟ وہ لوگ ہمارے جیسے ہم میں سے تھے ہماری طرح کھاتے پیتے تھے ہماری طرح چلتے پھرتے تھے مگر ان کے دلوں میں محبت و عشق کا سمندر موجزن تھا۔ اس لیے آج بھی کائنات میں محبت و عشق کی نجانے کتنی داستانیں موجود ہیں اور موجود رہیں گی۔

کتنے عشق و محبت کرنے والے آئے اور آ کر چلے گئے اور ان کی قبروں کے نشانات بھی مٹ گئے مگر ان کی محبت و عشق کی داستانیں آج بھی لوگوں کے دلوں میں ذہنوں میں اور تاریخ کے اوراق میں زندہ ہیں اور ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔

شکیل اختر...... سنجر پور

انمول معلومات

❁ انسانی دل دھڑکتے ہوئے جو پریشر رکھتا ہے وہ خون کو تیس فٹ دور تک پھینک سکتا ہے۔

❁ بڑے کینگرو ایک چھلانگ میں تیس فٹ کا فاصلہ طے کرتے ہیں۔

❁ عورتیں مردوں سے دگنا ہنستی ہیں۔

❁ ایک اوسط انسان دن میں تیرہ مرتبہ ہنستا ہے۔

❁ ذہین لوگوں کے بالوں میں زنک اور تانبا زیادہ ہوتا ہے

❁ دو واحد جانور جو سر گھمائے بغیر اپنے عقب میں دیکھتے سکتے ہیں وہ خرگوش اور طوطا ہے۔

❁ جس وقت آپ شرم سے سرخ ہو جائیں تو آپ کے معدے کا استر بھی سرخ ہو جاتا ہے۔

❁ پہلی ہار لے ڈیوڈسن موٹر سائیکل 1903 میں بنائی گئی تھی اور اس میں کاربوریٹر کی جگہ ٹائر کین استعمال کیا گیا تھا۔

❁ فٹبال کے ایک میچ کے دوران اکثر کھلاڑی سات میل تک بھاگ لیتے ہیں۔

❁ خون کے سرخ خلیے کو پورے جسم کا چکر لگانے میں صرف بیس سیکنڈ لگتے ہیں۔

ابن مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

عقیدے

۞ اسلامی ملک مالدیپ کے باشندوں کا عقیدہ ہے کہ اگر انہیں کسی نے کھاتے دیکھ لیا تو دیکھنے والے کا پیٹ بھر جائے گا اور وہ خود بھوکے رہ جائیں گے۔

۞ امریکا میں اگر گائے دم اوپر اٹھائے تو بارش کا امکان ہوتا ہے۔

۞ برصغیر میں مسلمان صفر میں شادی نہیں کرتے تھے۔

۞ قدیم یونانی اپنے بدصورت بچوں کو چٹانوں سے نیچے پھینک دیتے تھے۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

اقوال زریں

● خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔

● صبر سے بڑھ کر کوئی چیز میٹھی نہیں۔

● روشنائی جلد خشک ہو جاتی ہے۔ آنسو نہیں۔

● کیڑے آپ کو اس وقت کھاتے ہیں جب آپ مردہ ہوں لیکن غم آپ کو زندہ ہی کھا لیتے ہیں۔

● مشکل ترین کام بے کار رہنا ہے۔

انتخاب: نور فاطمہ...... کراچی

سکھ

ایک سکھ رات کے وقت موٹر سائیکل پر جا رہا تھا۔ اچانک سامنے سے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ تو اس نے رک کر اپنا کوٹ الٹا پہن لیا اور بٹن پیچھے کی طرف کر لیے اور موٹر سائیکل پر سوار ہوگیا۔ اور سردی سے بچنے پر اس ترکیب پر وہ اتنا خوش ہوا کہ ڈھلان پر موٹر سائیکل پھسل گئی اور وہ دھڑام سے گر گیا۔ کچھ دیر بعد بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ دیکھا سردار جی مرے پڑے ہیں۔ اور ایک سکھ اس کے پاس کھڑا ہے۔ لوگوں نے پوچھا۔ کیا ہوا ہے۔ وہ بولا۔ جب میں یہاں پہنچا سردار جی کراہ رہے تھے۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ تو پتہ چلا کہ گردن مڑ گئی ہے۔ میں نے زور لگا کر گردن سیدھی کی تب سے نہیں بولے۔

توقع

اگر زندگی میں سکون چاہتے ہو تو کبھی کسی سے توقع مت رکھو۔ کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں کی زد میں رہتا ہے۔

خان حفیظ احمد خان...... راجن پور

دنیا والوں کی بات پر توجہ کرنے کے بیان میں

لوگوں کی زبانوں کے ظلم سے کوئی شخص نہیں چھوٹا' چاہے ریاکار ہے چاہے حق پرست خواہ تو شیر ہے خواہ لومڑی یہ نہ سمجھ کہ تو ان سے شرافت اور حیلہ کے ذریعہ چھٹکارا حاصل کرلے گا۔

اگر کوئی آدمی تنہائی پسند ہے تو اس کی برائی کریں گے کہ وہ مکروہ فریب ہے لوگوں سے بھوت کی طرح بھاگتا ہے اور کوئی ہنس مکھ ہے اور گھل مل جانے والا ہے اس کو پاک دامن اور پرہیزگار نہ سمجھیں گے' مال دار فرعون کا لقب دیں گے اور اگر کوئی فقیر مصیبت میں ہے تو کہیں گے یہ بدبختی کی وجہ سے ہے' اگر کوئی مرتبہ سے گر جائے اس کو غنیمت اور خدا کا فضل شمار کریں گے کہ اس مرتبہ کی وجہ سے کب تک تکبر کرتا خوشی کے پیچھے ناخوشی ہوتی ہے۔

اور اگر کسی غریب کا مرتبہ بڑھتا ہوا دیکھیں تو اس کو کمینہ نالائق کہیں گے اگر تیرے ہاتھوں میں کوئی کام سیدھا دیکھیں تو لالچی اور دنیا پرست خیال کریں گے اور اگر تو کسی کام میں حصہ نہ لے تو تجھ کو پکی پکائی کھانے والا کہیں گے' اگر تو بولنے والا ہے تو ڈھول اگر چپ رہے تو تصویر کہیں گے۔ تحمل کرنے والے کو نامرد کہیں گے اور جو بہادری بتائے تو دیوانہ کہیں گے' اگر کوئی کم خوراک ہے تو کہیں گے کہ اس کے نصیب میں روزی کہاں ہے' اس کا مال تو دوسرے ہی کھائیں گے اور اگر کوئی اچھا کھانے پینے والا ہے تو اس کو پیٹ کا غلام کہیں گے۔

اگر کوئی مال دار سادہ زندگی گزارے تو اس کو بخیل کہیں گے اور اگر کوئی شوقین اچھا لباس اختیار کرے تو اس کو عورتوں کے ساتھ تشبیہ دیں گے اگر کسی نیک آدمی نے سفر نہ کیا ہو اس کو بے ہنر کہیں گے اور اگر کوئی سفر کا عادی ہے تو اس کے بارے میں کہیں گے کہ اگر نصیبہ صحیح ہوتا تو شہر بہ شہر نہ گھومتا' بے شادی والے کو زمین پر بوجھ کہیں گے اور شادی والے کو کہیں گے کہ گدھا خود کیچڑ میں گرا ہے۔ لوگوں کی زبان سے نہ کوئی بدصورت بچا ہے اور نہ کوئی خوب صورت' نہ خدا بچا ہے اور نہ رسول۔

فائدہ: آدمی کو چاہیے کہ مخلوق کی رضامندی کا خیال چھوڑ دے' شریعت کی حد میں رہ کر اپنی مصلحت کے مطابق زندگی گزارے' رضائے مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔

مرسلہ: اللہ بخش خیال...... حیدرآباد

خلیفہ مامون کی حکایت

جب مامون کی حکومت کا زمانہ آیا تو اس نے ایک خوب صورت باندی خریدی جو چہرے کے اعتبار سے آفتاب' جسم کے لحاظ سے پھولوں کی شاخ' عقل مند

کی عقل سے کھیلنے والی خلوت کی رات میں اس حور نسل کی گڑیا نے شاید اپنے کو مامون کی بغل میں سپرد نہ کیا۔ مامون کے بدن میں آگ بھڑک اٹھی، اس کے سر کے دو ٹکڑے کر دینا چاہا۔ وہ بولی یہ سر موجود ہے اس کو تیز تلوار سے اتار پھینک اور میرے ساتھ سونا اور نشست برخواست نہ کرنا۔ بادشاہ نے کہا: کس سے تیرے دل کو تکلیف پہنچی ہے، میری کون سی عادت تجھ کو ناپسند آئی ہے؟

وہ بولی: آپ چاہیں مجھے مار ڈالیں، مجھے آپ کے منہ کی بدبو سے تکلیف ہے، جنگ کا تیر اور ستم کی تلوار ایک بارگی مار ڈالتی ہے اور منہ کی بدبو پے در پے مارتی ہے۔ نیک بخت بادشاہ تھوڑی دیر رنجیدہ ہوا پھر دوا اور خوش بُو کا اہتمام کیا تو اس کا منہ پھول کی طرح معطر ہو گیا، اس نے باندی کی قدر کی کہ اس نے عیب بتا دیا۔

فائدہ: عیب اور نقصان کی خبر دینے والا واقعی دوست ہے، جب تک آدمی کو توجہ نہ دلائی جائے وہ عیب کو ہنر سمجھتا رہتا ہے۔

مرسلہ: اسلم راہی...... لاہور

بے ڈھب ڈرانونی آواز والے گویے کا قصہ

میرے استاد شیخ ابو الفرج ابن جوزی رحمہ اللہ تعالیٰ جتنا بھی سماع چھوڑنے اور تنہائی اختیار کرنے کا حکم فرماتے تھے۔ میری نوجوانی مجھ پر غالب آ جاتی تھی اور میں اپنے مربی کی رائے کے خلاف سماع اور میل جول سے لذت حاصل کرتا یہاں تک کہ میں ایک رات ایک مجمع میں پہنچا وہاں ایسے گانے والے کو دیکھا کہ اس کا بے اصول راگ جان کی رگیں کاٹتا ہے، اس کی آواز باپ کے مرنے کی آواز سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ کبھی مجلس کے شریک افراد کی انگلیاں اس گانے والے کی آواز کی وجہ سے کانوں میں اور کبھی تمام کے ہونٹوں پر چپ رہو کی آوازیں ہوتیں۔ میں نے گھر کے مالک سے کہا: خدا کے لیے میرے کانوں میں روئی ٹھونس دو تاکہ میں اس کی آواز نہ سنوں یا دروازہ کھول دو تاکہ باہر نکل جاؤں۔

قصہ مختصر دوستوں کی خاطر میں نے ان کی موافقت کی اور اس رات کو بڑی مصیبت سے جوں توں کر کے پورا کیا۔ صبح کے وقت تبرک کے طور پر سر سے پگڑی اتاری اور کمر سے دینار کھولے اور اس گانے والے کے سامنے ادب سے پیش کیے اور اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ میرے دوست چپکے چپکے میری بے وقوفی پر ہنسے ان میں سے ایک نے برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ خدا کرے ایسا گانے والا دور رہے جب اس کی آواز منہ سے نکلی لوگوں کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے، محل کا پرندہ اس کی ڈراؤنی آواز سے بھاگ گیا اس نے ہمارا مغز خالی کر دیا اور اپنا حلق پھاڑ لیا۔ میں نے کہا: تم اعتراض کرنا چھوڑ دو، میں نے اس گویے کے ہاتھ پر توبہ کر لی کہ اب عمر بھر گانا سننے اور میل جول کے پاس نہ جاؤں گا۔ یہ میں اس وجہ سے کہتا ہوں کہ مجھ کو استاد نے کئی مرتبہ سماع چھوڑنے کی نصیحت فرمائی مگر میں نے دھیان نہیں دیا یہاں تک کہ میرے نیک نصیب نے اس مکان تک پہنچا دیا اور میں نے آئندہ کے لیے اس گناہ سے توبہ کر لی۔ (گلستان ص ۸۰)

فائدہ: شاگردوں اور مریدوں کو اپنے مشائخ اور اساتذہ کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے ورنہ شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔

مرسلہ: محمد یوسف...... پنڈ دادن خان

قسط نمبر 4

جگت سنگھ

شمیم نوید

تاریخ کے صفحات میں محفوظ سرزمین پنجاب کی ایسی دلگداز داستان جو کلاسک داستانوں میں شمار ہوتی ہے...... جور و جبر کے خلاف بغاوت کی آتشیں آندھیوں کا احوال' جو حاکمانہ غرور کے کوہساروں کے ساتھ پورے جاہ و جلال سے ٹکرا جاتی ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کے لیے بھی فسانۂ عبرت ہے' جو آنے والی نسلوں کو انتقام اور دشمنی کے جذبات منتقل کرتے رہتے ہیں اور سیدھے سادھے نوجوان "جگت سنگھ" بن جاتے ہیں اور پھر حالات کسی کے قابو میں نہیں رہتے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار "جگت سنگھ" ایک ایسا ڈاکو ہے جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی ہو جاتا تھا۔ دراصل فطری طور پر امن و آشتی کا پیامبر ہے۔ "جگت سنگھ" کے کردار کا رومانی پہلو' جو شروع سے آخر تک "چندن" اور "ویرو" کی صورت میں اس کہانی میں رچا بسا نظر آتا ہے اس بات کا معتبر ترین گواہ ہے کہ لطیف جذبات رکھنے والا نوجوان جسے دنیا خطرناک ڈاکو کے طور پر جانتی ہے اندر سے کتنا نرم اور محبت کرنے والا ہے۔
"جگت سنگھ" کہاں سے چلا اور کہاں پہنچا' آئیے قارئین یہ جاننے کے لیے ہم بھی زیر نظر کہانی میں "جگت سنگھ" کے ساتھ ساتھ گاؤں کے سرسبز کھلیانوں' اونچے نیچے ٹیلوں اور پر خطر کھنڈرات کے نشیب و فراز میں سفر کرتے ہیں۔

ایک بار جان بوجھ کر وہ روپا سے راستے میں ٹکرا گیا تھا۔ روپا نے غصے میں بپھر کر کہا تھا۔

"گاؤں کی عورتوں کو ستاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہارے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں؟" جوگیندر نے دانت پیس کر کہا۔ "اچھا...... یہ بات ہے اب دیکھ، میں تجھے کس طرح قابو کرتا ہوں۔" وہی جوگیندر آدھی رات کو مسلح لوگوں کے ساتھ اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے گھر میں داخل ہوا تھا۔

روپا کو محسوس ہوا کہ آج اس کے شوہر کی دولت کے ساتھ اس کی عزت بھی لوٹ لی جائے گی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس بے عزتی سے تو بہتر ہے وہ...... مگر اسی وقت اسے ایک گرج دار آواز نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"جگت سنگھ جگا کی پارٹی تیرے گھر ڈاکہ ڈالنے آئی ہے۔ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔" اور روپا نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ جگا ڈاکو کسی عورت کی عزت نہ خود لوٹتا ہے نہ کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ دوسرے اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گھر میں لٹنے والا قیمتی مال وغیرہ بھی نہیں تھا۔ اس کے شوہر نے دکان کے نیچے تہہ خانے میں تمام سرمایہ اور زیورات چھپا رکھے تھے۔

کرپال اور بچن دروازے کے پاس چوکس کھڑے ہوئے تھے۔ ہوشیار سنگھ کے ذمہ بڑھیا کو رائفل دکھا کر چپ رکھنے کی ذمہ داری تھی۔ ہنومان اور جوگیندر اوپر کی منزل پر پہنچ گئے۔

کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر روپا نے تجوری کی چابیاں ان کے حوالے کر دیں۔ روپا پر نگرانی کا کام جوگیندر نے خود سنبھال لیا۔ جگت اور ہنومان دوسرے کمرے میں تجوری اور الماریاں کھنگالنے لگے تجوری

میں بمشکل پچاس ساٹھ روپے ملے۔ تمام کپڑے وغیرہ انہوں نے الماری سے باہر پھینک دیے مگر ایک بھی زیور ان کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔

ہنومان نے جگت سے کہا۔

''اس خاتون نے تجوری کی چابیاں جس آسانی سے ہمارے حوالے کی تھیں میں اسی وقت سمجھ چکا تھا کہ اپنا یہ چکر بے کار ہوگا۔''

''مگر جوگیندر نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ ہزاروں کا مال ہاتھ لگے گا۔'' جگت نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ہنومان! کیوں نہ اس عورت کو ڈرایا دھمکایا جائے ممکن ہے کام ہوجائے۔ تم ٹھہرو...... میں ابھی آتا ہوں۔'' جگت تیزی سے باہر نکل گیا۔

برابر کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کے پاس آ کر جگت رک گیا۔ اندر سے جوگیندر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ روپا سے طنزیہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''دیکھا پارو! اس دن تم نے مجھے راستے میں جو کہا تھا آج میں نے اس کا بدلہ لے لیا ہے۔ اب اگر میں تمہیں چھیڑوں گا تو پیار سے جواب دو گی۔''

جوگیندر کا ارادہ جان لینے کے بعد جگت کا دماغ جل اٹھا۔ اس نے دل ہی دل میں کچھ سوچا اور پھر وہ واپس لوٹ آیا اور ہنومان سے کہا۔

''اب تمہیں اس گھر سے کچھ نہیں لینا۔ دو چار جوڑے لباس کے ساتھ لے لو۔'' ہنومان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر اس وقت کسی قسم کی بحث بے کار تھی۔ جگت کے ہر اقدام پر اسے پورا یقین تھا۔ جگت نے بلند آواز میں جوگیندر کو اپنے قریب بلایا اور کہا۔

''چلو! اپنا کام پورا ہو چکا ہے اب واپس چلیں گے۔''

جوگیندر نے ہنومان کے ہاتھ میں کپڑوں کا بنڈل دیکھا اور جاتے وقت سر گھما کر اس نے روپا کو اشارہ کیا پھر سب لوگ مکان سے باہر آ گئے۔

گھوڑے دوڑاتا ہوا سب سے آگے نکل گیا۔

جگت نے ہنومان کے آگے نکل جانے کے بعد اپنے تین ساتھیوں کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ جوگیندر بے ایمان اور مفاد پرست شخص ہے۔ وہ اس خاتون پر اپنا رعب جمانے کی خاطر ہمیں یہاں لایا تھا۔ اسے اس کی اس حرکت کی سزا دی جائے گی۔''

گاؤں سے تقریباً میل دور نکل آنے کے بعد سب ایک کنوئیں کے قریب ٹھہر گئے۔ جگت نے آس پاس کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد جوگیندر سے کہا۔

''ہمیں سخت پیاس لگی ہے۔ لہٰذا یہاں کچھ دیر ستا لیا جائے۔ پانی پینے کے بعد تمہارے کام کا حساب کر دیا جائے گا۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہم آگے جائیں گے۔''

پانی پینے کی غرض سے رسی اور بالٹی ہمیشہ بچن سنگھ اپنے گھوڑے پر بندھے رکھتا تھا۔

''جوگیندر! تم رسی اور بالٹی لے کر پانی نکال لو اور سب کو پانی پلاؤ۔''

جوگیندر خوشی خوشی اٹھا اور گھوڑے کی پیٹھ سے رسی اور بالٹی اتار کر کنوئیں کی منڈیر پر پہنچ گیا۔ رسی کو بالٹی کے کنڈے سے مضبوط باندھ کر اس نے بالٹی جیسے ہی کنوئیں میں اتاری جگت جو قریب ہی کھڑا تھا بولا۔

''جوگیندر! وہ عورت تو بلا کی حسین تھی۔''

جوگیندر جگت کے یہ الفاظ سن کر چونکا۔ اس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اسے جگت کی یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جگا کبھی کسی عورت پر بری نظر نہیں ڈالتا۔ اس نے کہا۔

''جی ہاں سردار! میری نظر بھی بہت دنوں سے اس حسینہ پر ہے۔ آپ یہاں سے جائیں گے تو میں

واپس جا کر اسے قابو کروں گا۔''

مگر اس کے لبوں سے آخری الفاظ کی ادائیگی ہوتے ہی جگت کی رائفل تیزی سے حرکت میں آئی اور گولی اس کی پشت میں سوراخ کرتی ہوئی آر پار نکل گئی۔ رائفل کے دھماکے کے ساتھ جوگیندر کے قدم لڑکھڑائے اور کنوئیں کی تہہ میں ایک اور دھماکہ ہوا جس کے ساتھ ہی جوگیندر پانی کے بوجھ تلے دب گیا۔ برا انسان اپنے برے انجام تک پہنچ گیا۔ ماحول پر خاموشی مسلط ہوگئی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جگت نے سر اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے لاتعداد ستاروں کی جانب دیکھا۔ صبح ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا جو جگت ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں اور ہنومان اتنے وقفے میں دودھیا جا کر آسانی سے واپس لوٹ سکتے ہیں۔'' جگت نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''جگت! ہم لوگ ہمیشہ ایک ساتھ جاتے ہیں۔ لہٰذا کیوں نہ اکٹھے چلیں۔ ہم آپ کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔'' ہوشیار سنگھ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں دوستو! ایسی تو کوئی بات نہیں مگر چونکہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے لہٰذا ہنومان میرے ساتھ کافی ہے۔ تم لوگ قطعی فکر نہ کرو۔'' جگت نے مسکرا کر کہا۔

اس کے بعد کسی نے بحث کرنا مناسب خیال نہ کیا۔ پانچوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے ایک کچے راستے پر آ نکلے۔ کچھ آگے بڑھے تو جگت ایک چوراستے پر رک گیا۔ جگت کے ساتھ ہی سب رک گئے۔ جگت نے ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''یہ راستا جنگل کی طرف جاتا ہے۔ تم تینوں کسی محفوظ مقام پر رک جانا۔ ہم دونوں دودھیا سے واپس آ کر تمہیں ساتھ لے لیں گے۔''

سب نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے گھوڑوں کو جگت کے بتائے ہوئے راستے پر ڈال دیا۔

جگت اور ہنومان ان سے الگ ہو کر دودھیا کی جانب بڑھنے لگے۔ ستاروں کی دھندلی روشنی میں کچی پگڈنڈی پر جگت کی سفید گھوڑی کے ساتھ ہنومان کا سیاہ گھوڑا قدم ملا کر دوڑ رہا تھا۔ دونوں سوار دھیمے لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔

''ہنومان! اب تم مجھے گھر کے تمام حالات بتاؤ۔''

''ابھی بتاتا ہوں۔''

''جلدی بتاؤ' ماں کی طبیعت کیسی ہے؟ تمہیں دیکھ کر ناراض تو نہیں ہوئیں؟'' جگت نے بے چینی سے ہنومان سے پوچھا۔ ہنومان سمجھ گیا کہ جگت کو گھر کی یاد بہت ستا رہی ہے۔

وہ جگ کو بتا دینا چاہتا تھا کہ ''تمہاری ماں تمہارا چہرہ دیکھنے کے لیے تڑپ رہی ہے۔ کیونکہ یہاں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ منڈلا رہا ہے۔'' مگر یہ بات کہہ کر وہ جگت کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جگت کو اطمینان ہو اس لیے اس نے گھر کے حالات اس طرح بیان کیے کہ جگت خاموشی سے سنتا رہا۔ ہنومان سب کچھ کہہ چکا اس کے باوجود جگت کی خاموشی برقرار رہی۔

ان تمام باتوں کے درمیان ہنومان نے ایک بار بھی ویرو کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ ماں کی جانب سے ویرو کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے اس نے ہنومان کو گھر کے حالات بتانے کو کہا تھا۔ کیا ویرو اپنے شوہر کو چھوڑ کر میکے چلی گئی ہے؟ یا پھر موہن نے

اسے گھر میں قید کر دیا ہوگا؟ ویرو اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھانے والی ڈاکہ زنی آج اسے بہت کھل رہی تھی۔

"ہنومان! ماں جی نے ویرو کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟" جگت نے مجبور ہو کر پوچھ ہی لیا۔

"کیا؟" سب کچھ جاننے کے باوجود ہنومان نے انجان بن کر کہا۔ اسے معلوم تھا کہ جگت گھر کے حالات سننے کے باوجود سوچ میں کیوں ڈوب گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ چندن کور سے ملاقات کے لیے جانے والا جگت ویرو کے متعلق کیوں سوچ رہا ہے۔

"ہنومان! ماں جی نے ویرو کے متعلق کسی قسم کی اطلاع فراہم نہیں کی؟" جگت نے دوسری بار معلوم کیا۔

لمحہ بھر ہنومان نے چاہا کہ جگت کو غلط بات بتا دے۔ مگر جگت کی دوستی نے اسے سچ بات اگلنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"جگت تمہاری ماں اور باپ نے چندن کور کے متعلق اتنی باتیں کیں کہ کچھ مزید معلوم کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا اور میں چلا آیا۔"

پرہول سناٹے کے درمیان جگت کے لبوں سے نکلنے والی سرد آہ ہنومان کو صاف سنائی دی۔ اس کے ذہن میں ایک سوال گونجا۔ "جگت اور چندن کور کے پیار کے درمیان کہیں ویرو دیوار تو نہیں بن جائے گی؟"

رات کے پچھلے پہر دو گھڑ سوار خاموشی سے دودھیا گاؤں میں داخل ہوئے۔ اس وقت گاؤں پچھلے پہر کی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ جگت کے ایک ہاتھ میں لگام اور دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کے ہاتھ کی ایک انگلی پستول کی لبلبی پر جمی ہوئی تھی۔ دو چار کتوں نے نئے مہمانوں کو دیکھ کر کچھ دیر تک استقبالیہ راگ گائے اس کے بعد خاموش ہو گئے اور جگت کی گھوڑی سسرال کی گلی میں داخل ہو گئی۔

بچپن کے کچھ سال اس نے اس گلی میں گزارے تھے۔ اس وقت وہ اور چندن کور کچھ لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ عجیب عجیب سے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ جگت کسی اور سے نہیں بلکہ صرف چندن کور کے ساتھ کھیلنا پسند کرتا تھا۔ جب وہ چھپنے والا کھیل کھیلتے اس وقت جگت صرف چندن کور کو تلاش کر کے اسے پکڑ لیتا اور چندن رونی صورت بنا کر کہتی تھی۔

"تم میرے علاوہ کسی اور کو نہیں پکڑتے' جاؤ! ہم تم سے نہیں کھیلیں گے۔"

اور آج اسی چندن نے اسے پیغام بھیجا تھا۔

"جگت! میں تیرے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں کھیلوں گی۔ آ! مجھے پکڑنے کے لیے جلدی سے میرے پاس آ جا۔"

جگت کی گھوڑی کچھ دیر تک مکان کے پاس کھڑی رہی۔ ہنومان کچھ دور رک کر چوکس نظروں سے اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ مانک سے اتر کر جگت نے دروازے کی کنڈی کھٹکھٹائی اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ شاید اندر والے گہری نیند میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"کون ہے؟" کسی مردانہ آواز نے اندر سے پوچھا۔

"مہمان......!" جگت نے کافی دھیمے لہجے میں کہا۔

بڑے دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کی درز میں لالٹین کی روشنی کی باریک لکیر چمکتی نظر آئی اور کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ "کون ہے بھائی؟" کسی نے پھر پوچھا۔

"رات کا مہمان۔"

اور دروازے کی چھوٹی سی کھڑکی کھل گئی۔ بشن سنگھ نے لالٹین بلند کر کے دیکھا۔ جگت نے چہرے پر بندھے ہوئے صافے کو الگ کیا اور داماد کو پہچان کر سسر نے جلدی سے بڑا دروازہ کھول کر گھوڑی کو مکان میں داخل کر لیا اور دروازہ بند کرنے لگا۔ اسی لمحے جگت نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

"میرا ایک دوست بھی میرے ساتھ آیا ہے۔ اسے بھی اندر لے آئیں۔" اتنے وقفے میں ہنومان بھی ان کے قریب پہنچ گیا اور بڑا دروازہ بند کر دیا گیا۔

مگر جب جگت مکان میں داخل ہو رہا تھا سامنے مندر کے آگے بنے ہوئے چبوترے پر سوئے ہوئے کانے کی ایک آنکھ کھل چکی تھی۔ وہ ایک آنکھ سے لیٹے لیٹے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ مسلسل دو راتوں سے یہیں سو رہا تھا کہ شاید جگا اس طرف چلا آئے اور اس کا انعام پکا ہو جائے۔

یہ منظر دیکھنے کے بعد بھی اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آیا اس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ خواب ہے یا حقیقت؟ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اگر اس کی دو آنکھیں ہوتیں تو وہ اس منظر کو شاید صاف دیکھ سکتا اور یہ یقین کر لیتا کہ یہ جگا تھا مگر قدرت نے اسے ایک آنکھ بخش کر اس کے ساتھ شاید انصاف نہیں کیا تھا۔ مگر اب دیکھنے کی بجائے کچھ سننا ضروری تھا۔ لہٰذا وہ اسی امید پر اپنی جگہ سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا بڑے دروازے کے قریب جا کر چوکنا کھڑا ہو گیا اور دروازے سے کان لگا کر سن گن لینے لگا۔

"کون آیا ہے اتنی رات بیت جانے کے بعد؟" چندن کور نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ دیکھنے کے لیے چندن کور بستر سے اٹھ گئی اور آنکھیں ملتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ جلدی سے باہر صحن میں آ گئی۔ لالٹین کی مدہم روشنی کے باوجود وہ سامنے کھڑے ہوئے شخص کو پل بھر میں پہچان گئی۔

مگر دوسرے ہی لمحے اسے خیال گزرا کہ وہ جلدی میں اپنا دوپٹا لینا بھول گئی ہے۔ لہٰذا اس نے جلدی سے اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر شرمیلے انداز میں منہ پھیر لیا۔

جگت اس نازنین کی کمر دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ پانچ سال پہلے جس چندن کو دیکھا تھا یہ وہی چندن ہے بچپن میں اس نے جس کمر پر ہاتھ مارے تھے آج اس کمر کو سہلانے کی آرزو اس کے دل میں کروٹیں لینے لگی۔

مگر چندن تو بھاگ کر کمرے میں جا چکی تھی۔

"کسی قسم کی آواز نہ ہو۔" جگت نے سرگوشیانہ لہجے میں سب سے کہا۔

بالکل خاموشی سے بشن سنگھ کے پیچھے جگت اور ہنومان کمرے میں داخل ہو گئے۔ بشن سنگھ اس شش و پنج میں مبتلا تھے کہ گھر آئے ہوئے ہونے والے داماد کا کس طرح استقبال کریں؟ دروازے کے درمیان کھڑی ہوئی چندن بھی یہی سوچ رہی تھی۔ اس نے اپنے باپ سے جگت کے کھانے کے متعلق پوچھنے کا اشارہ کیا جسے جگت نے دیکھ لیا۔

"ابھی کسی قسم کے کھانے کے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ سے چند اہم باتیں کرنے آیا ہوں کسی بھی قسم کا شور ہونے پر کام بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔" جگت نے سرگوشی میں کہا۔

اس کے باوجود چندن کور باورچی خانے میں جا کر دودھ کے دو گلاس بھر لائی۔ دودھ انڈیلتے ہوئے اسے ایک شرارت سوجھی اس نے گلاس میں گڑ کے ٹکڑے ڈال دیے۔ دودھ کے گلاس کے آخری گھونٹ کے ساتھ ہنومان کے منہ میں گڑ کا ٹکڑا آ گیا۔ جگت کے

گلاس میں بھی گڑ کا ٹکڑا آیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرا دیے۔ دروازے کے پیچھے کھڑی چندن بھی ان کی حرکت دیکھ رہی تھی اور اپنی شرارت پر خوش ہو رہی تھی۔

ہنومان کے ذہن میں یہ شرارت کلبلا رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس ملاپ کا انجام کیا ہوگا؟ یہ جاننا کافی مشکل ہی تھا لہٰذا اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔

گڑ کا ٹکڑا چباتے ہوئے جگت نے ہنومان سے کہا۔

''کیوں ہنومان! منہ میٹھا تو ہوگیا ہے؟'' ہنومان صرف مسکرا دیا۔

پھر جگت کے ذہن میں ایک خیال تیزی سے آیا۔ اس نے ہنومان سے سرگوشیانہ انداز میں کہا۔

''تم چھت پر جا کر اطراف کا جائزہ لو۔''

ہنومان کے ساتھ بشن سنگھ بھی کھڑا ہوگیا۔

''جگت! میں بھی جا رہا ہوں تم دونوں باتیں کرو میں چندن سے معلوم کرلوں گا۔''

جگت نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ ہنومان سے کہا۔

''مکان کے قریب پیپل کا درخت ہے وہاں سے کوئی بھی شخص آسانی سے اندر داخل ہوسکتا ہے لہٰذا اس جگہ کی خاص کر نگرانی کی ضرورت ہے۔''

ہنومان اور بشن سنگھ چلے گئے۔ جگت اور چندن دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر گم صم تھے۔ چندن کو تعجب ہو رہا تھا کہ جگت کو اتنے سال بیتنے کے باوجود پیپل کا درخت یاد ہے۔ جب وہ چھوٹے تھے جگت چندن کو ڈرانے کی غرض سے اکثر اس پیپل کے درخت سے اچانک گھر میں کود کر چندن پر خوف طاری کر دیتا تھا۔ ایک بار تو چندن خوف سے چیخ اٹھی تھی مگر جگت کو دیکھ کر بڑبڑانے لگی تھی۔

''جگت کو یہ سب باتیں یاد ہوں گی؟''

''کیا سوچ رہی ہو؟'' جگت نے مسکرا کر پوچھا۔ چندن اپنے خیالات سے چونک کر شرما گئی اور پیر کے انگوٹھے سے زمین کھرچنے لگی۔ جگت کو چونکہ جلدی تھی لہٰذا اس نے بات شروع کرنا بہتر سمجھا۔ ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم......'' جگت کہنا چاہتا تھا کہ ''تم شادی کے لیے جلدی کر رہی ہو۔'' مگر وہ یہ بات کہہ نہ سکا۔

''تم نے رشتے کے بندھن توڑنے کی اجازت نہیں دی۔''

چندن نے صرف اثبات میں سر ہلایا۔ جگت نے دیکھا اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ چندن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''تم نے پوری ہمت سے شادی کی دعوت بھیجی تھی۔ میں تمہاری دعوت قبول کر کے آ گیا ہوں۔''

چندن نے چونک کر اپنا حسین چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں پیار کے موتی چمک رہے تھے اور پلکوں نے شرما کر چمکیلی آنکھوں پر حیا کی چادر ڈال دی تھی۔

''میں گھوڑے پر سوار ہو کر ضرور آیا ہوں مگر شادی کے ارادے سے نہیں۔'' جگت سنگھ نے صاف صاف بات کہہ دی۔ ''میں تمہیں قول دینے سے پہلے صاف صاف بات کر دینا ضرور سمجھتا ہوں۔''

''کہیے۔'' چندن نے پہلی بار لب کھولے پھر مضبوطی سے بند کر لیے۔

''تم جانتی ہو کور کہ میری زندگی کس دوراہے پر کھڑی ہے۔ ہم نجانے کب ہمیشہ کے لیے الگ ہو جائیں؟ کیا تم میرے ساتھ ایسی زندگی بسر کرنا پسند کرو گی؟ ملاپ چند ساعتوں کا اور جدائی عمر بھر کی ہے۔''

''شیر۔'' چندن کور اسے جگت نہ کہہ سکی۔

''تم نے جس جدائی کی بات کی ہے اس جدائی

کے لیے تمہاری ماں بھی تڑپ رہی ہے۔ ہم ایک ہی جگہ دو عورتیں مل کر جدائی کے اس بوجھ کو بانٹ لیں گی۔''

جگت سکتے میں رہ گیا۔ یہ جواب ملنے کے بعد مزید کسی سوال کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے یقین ہوگیا کہ چندن اپنے دل میں اٹل فیصلہ کر چکی ہے۔ اب صرف ایک بات باقی تھی۔

''کور تم جانتی ہو کہ ڈاکہ زنی کے راستے پر مجھے خاندانی عداوت کے علاوہ دشمن کی عورت لے آئی ہے۔'' جگت نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''آپ ویرو کی بات کر رہے ہیں؟'' چندن نے جلدی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم میرے متعلق تمام اطلاع رکھتی ہو۔'' جگت نے تعجب سے کہا۔ ''اچھا ہے میں اب جلدی سب کچھ کہہ دوں گا۔'' جگت کچھ دیر توقف کر کے بولا۔ ''دیکھو کور! اس ویرو نے میرے لیے بہت کچھ برداشت کیا ہے اور اس کے لیے مجھے کتنا بھی خطرہ مول لینا پڑے میں دریغ نہیں کروں گا۔''

''ہماری شادی کی بات میں ویرو کا ذکر کیوں؟'' چندن نے مدہم لہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز میں کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔

''شاید ضرورت پڑنے پر مجھے ویرو کو اغوا بھی کرنا ہوگا۔ اس وقت تم یہ محسوس نہیں کرو گی کہ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا۔''

''آپ کہہ چکے' چلیے اب میں کچھ محسوس نہیں کروں گی اور کچھ؟'' چندن نے حسین مسکراہٹ میں یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ جگت کو چندن پر بے انتہا پیار آنے لگا۔ اس نے کہا۔

''پھر تمہیں تین چار مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔ برسات کے بعد دیوالی گزرتے ہی میں گھوڑے پر سوار ہو کر تمہیں اپنانے آ جاؤں گا۔'' جگت نے چندن کی چمکیلی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے اس طرح کہا جیسے اسے پیار کا قول دے رہا ہو۔ جگت کے ہاتھ میں چندن کا گورا ہاتھ تھا۔ جگت نے پیار سے اسے ہلکا سا دبایا اور چندن کا چہرہ حیا کی چادر میں چھپ گیا۔

ہنومان زور سے کھنکارا۔ جگت نے چونک کر چندن کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دونوں الگ ہوگئے۔

ہنومان نے آتے ہی آہستگی سے جگت سے کہا۔

''ایک شخص مکان کے گرد چکر لگا رہا ہے کیا میں اسے رائفل کا کندا مار کر بے ہوش کر دوں؟''

جگت کا ہاتھ پستول پر جم گیا۔ اس نے الوداعی نظروں سے چندن کی جانب دیکھا۔ چندن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کی حسین پلکیں نم ہوگئیں۔ ہنومان اتنے میں کھڑکی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس نے بغیر آواز نکالے آہستہ سے کھڑکی کھول دی۔

کانا جو پشت دیوار سے لگا کر کھڑا تھا کھڑکی کھلنے کی ہلکی سی آواز سن کر چونک گیا۔ مگر اسی لمحے جگت نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ پشت پر پڑا ہوا کپڑا اس نے کانے کے چہرے پر کس کر لپیٹ دیا۔ جگت نے اسے پشت پر سے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ ہنومان ان کے قریب پہنچ گیا۔

اسی لمحے گھوڑے لائے گئے اور جگت نے پستول کی نال پر کانے کو مانک پر سوار ہونے پر مجبور کر دیا اور خود اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ دونوں گھوڑے دوڑاتے ہوئے گاؤں کی حد سے باہر نکل گئے۔ دو میل فاصلہ طے کر کے جگت نے کانے کو گھوڑی سے پیچھے اتار دیا۔ ہنومان رائفل تانے کانے کے عقب میں چلا گیا۔

جگت نے کانے کے چہرے پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ اس کا بگڑا ہوا چہرہ دیکھ کر جگت نے نفرت سے ہونٹ سکیڑے۔

''بول تُو وہاں کیا کر رہا تھا؟'' جگت نے زوردار آواز میں کہا۔

کانا بری طرح کپکپانے لگا۔ اس نے اپنی ایک آنکھ میں رحم کا بھرپور تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''بھائی صاحب میں چوری وغیرہ کی نیت سے وہاں نہیں کھڑا تھا بلکہ دیوار کے پاس......!'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر چھوٹی انگلی بتائی۔

ہنومان نے عقب سے رائفل کا کندا اس کی پشت پر مارتے ہوئے کہا۔ ''جھوٹ بکتا ہے اس میں پندرہ منٹ خرچ نہیں ہوتے۔''

''میرے باپ میں جھوٹ نہیں بولتا۔'' کانا محسوس کر رہا تھا کہ بولنے میں ذرا سی غلطی پر انعام کی جگہ جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ''پتھری کی بیماری کی وجہ سے مجھے آدھا گھنٹہ پریشان ہونا پڑتا ہے۔''

جگت کا جی چاہا کہ وہ ایک گھونسہ اس کے پیٹ پر مارے مگر اسے رحم آ گیا۔ ابھی تو چندن نے کہا تھا کہ کسی مظلوم کو صرف شک کی بنا پر نہ ماریں۔

جگت نے محسوس کیا کہ کانا اسے نہیں پہچانتا۔ پولیس کا مخبر اس طرح کا نہیں ہوتا شاید چور ہو اور اس کے چکر میں وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے اسے آزاد کرنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''جا میں تجھے آزاد کرتا ہوں اگر پولیس کے ہاتھ لگتا تو وہ لوگ تجھے مار مار کر ادھ موا کر دیتے' سمجھے؟''

یہ سن کر کانے نے ہاتھ جوڑے اور سر پر پیر رکھ کر بھاگنے لگا۔ ہنومان کو یہ بات اچھی نہ لگی۔

''جگت تم نے جلدی کی ہے اس کی حرکات اچھی نہیں تھیں۔''

''جانے دو اسے۔'' جگت نے مانک کی پشت پر جست لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں جلدی ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہیے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے۔ برسات کے آثار نہیں رہے تھے۔ مگر ہنومان بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ مبادا کانا پولیس کو اطلاع فراہم کر دے اس لیے پہلے سے خبردار رہنا بہتر تھا۔

کانا پکا بدمعاش تھا۔ پولیس کو اطلاع فراہم کرنے سے پہلے اسے پورا معاوضہ کس طرح ملے وہ یہ سوچ رہا تھا۔ وہ یقیناً جگت اور چندن کی شادی میں بڑی رکاوٹ بننے والا تھا۔

☆
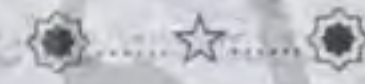
برکھا کے موسم میں چار مہینوں کے دوران جگا ڈاکو نے پورے علاقے میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ وہ برق کی طرح حملہ آور ہوتا اور ڈاکہ ڈالنے کے بعد طوفان کی طرح غائب ہو جاتا۔ موسلا دھار برستی ہوئی بارش کی سیاہ راتوں میں کیچڑ سے لبریز پگڈنڈیوں اور گدلے پانی سے چھلکتے ہوئے نالوں سے گزرتی ہوئی جگت سنگھ کی پارٹی مخصوص ٹھکانوں پر اچانک چھاپے ڈال کر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے گھروں میں چھپائی ہوئی یا زمین میں دفن کی ہوئی دولت کو آزادی دلاتی تھی۔ جگا کا نام سن کر وڈیروں کے دل دہل جاتے تھے۔ اگر کوئی مال حوالے کرنے میں پس و پیش کرتا تو جگا کی تیز اور خوفناک نظریں اس کے حواس غائب کر دیتی تھیں۔

چھاپہ مارنے سے پہلے کتنا مال اور دولت کہاں اور کس جگہ موجود ہے جگا اس کے متعلق پوری اطلاع حاصل کر لیتا تھا۔ یہی بات تھی کہ وہ اپنے نشانے پر پہنچ کر اپنے شکار کو یہی حکم دیتا۔

''جلدی مال نکالو میں جانتا ہوں کہاں ہے۔''

بے چارے شکار کے حواس ہوا ہو جاتے تھے۔ وہ سمجھ جاتا تھا کہ مال کہاں چھپایا ہے۔ اس کی جگا کو مکمل اطلاع ہے۔ لہٰذا اگر چھپانے کی کوشش کی تو اس صورت میں جگا کے عتاب کا شکار ہونا پڑے گا۔ جگت کا رعب ایسا طاری ہو چکا تھا کہ جھوٹ بولنے والے پر کبھی رحم نہیں کرتا تھا۔ ایک وڈیرے نے جھوٹ بولا تھا مگر جگت کے بائیں ہاتھ کے ایک تھپڑ نے اس کے دو دانت نکال باہر کیے تھے۔ پیٹ میں پڑنے والا اس کا گھونسہ طاقتور سے طاقتور آدمی کو بھی گرا دیتا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکل پڑتے تھے۔

کسی سود خور بیوپاری کے گھر پر جگا کی پارٹی نے ڈاکہ ڈالا۔ بیوپاری کو سن گن لگ گئی تھی۔ اسی لمحے اس نے اپنے لڑکے کو پچھلے دروازے سے باہر بھیج دیا تاکہ پولیس کو اطلاع کر دے۔ آدھے گھنٹے تک بری طرح پٹتے رہنے کے باوجود اس نے یہ نہیں بتایا کہ مال کہاں چھپایا ہوا ہے بلکہ جہاں بیٹھا تھا وہاں سے کھسکا تک نہیں۔ اس کے ہونٹوں سے خون کی دھار بہہ رہی تھی۔ چہرے پر مار کے نشان ابھر رہے تھے۔ اس کی روح وداع ہو رہی تھی مگر وہ پھر بھی دولت چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کچھ مار سہہ لے جب تک اس کا لڑکا پولیس کو لے کر آ جائے گا۔ وہ خود لٹنے سے بچ جائے گا اور جگا ڈاکو کی گرفتاری کا دو ہزار انعام بھی پالے گا۔

مگر اس بے چارے کا حساب غلط ہو گیا۔ کیونکہ اس کا لڑکا جب مکان سے باہر نکل رہا تھا ہنومان نے اسے دیکھ لیا۔ ہنومان نے عقب سے ہاتھوں کے شکنجے میں اسے جکڑ لیا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چند گھونسے اس کی پسلیوں پر لگائے اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

ہنومان کی عادت تھی کہ وہ جس کو بھی مارنا شروع کرتا اس وقت اس پر جنون سوار ہو جاتا تھا۔ جگت کئی بار اسے ٹوک چکا تھا کہ کسی کو مر جانے کی حد تک نہیں مارنا چاہیے۔ جگت کے حکم کی وجہ سے ہنومان کے ہاتھوں درجن بھر جانیں بچ چکی تھیں۔

بیوپاری کا لڑکا جب بے ہوش ہو گیا تو ہنومان نے اس کے ناک پر انگلیاں رکھ کر اچھی طرح یقین کر لیا کہ اس کی سانس چل رہی ہے۔ اس کی وہ زیادہ ہی مرمت کر چکا تھا۔ لہٰذا کہیں رخصت نہ ہو جائے۔ ایسا ہونے کا اسے ڈر محسوس ہوا کیونکہ جگت کی ناراضگی کا ڈر تھا۔ دو چار بار اسے اچھی طرح ہلایا جلایا مگر اس پر گہری بے ہوشی طاری تھی۔ ہنومان اسے گھسیٹ کر کنوئیں کے قریب لے گیا۔ پانی کی بھری ہوئی بالٹی نکال کر اس کے چہرے پر انڈیل دی۔ کچھ دیر بعد اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہنومان نے اس کے سینے پر رائفل کی نال رکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''بے وقوف اب اگر تم بے ہوش ہوئے تو گولی مار دوں گا۔ مجھے بتا چھپ کر کہاں جا رہا تھا؟''

''پپ...... پپ پولیس......!''

یہ سن کر ہنومان کا جی چاہا کہ رائفل کی لبلبی دبا کر اس کا سینہ چھلنی کر دے مگر اس نے لڑکے کا گریبان پکڑ کر کھڑا کر دیا اور پیٹ پر رائفل کی نال ٹکا کر دھکیلتا ہوا گھر میں لے آیا۔ اندر اس کا باپ بے ہوش ہو چکا تھا۔

بچن' ہوشیار اور کرپال نے ملی ہوئی اطلاع کے مطابق تھوڑا سا مال باورچی خانے کی زمین سے نکالا مگر ایسے زبردست بیوپاری کے گھر سے چار پانچ ہزار کا مال لے کر واپس جانا ان کی توہین تھی۔ جگت سوچنے لگا بیوپاری کے ہوش میں آنے تک کا انتظار کیا جائے یا

نہیں؟

گھر کی خواتین اور بچے کمرے کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے تھے۔ جگت نے ان سے کہا۔ ”تم لوگوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اگر تم بالکل خاموش رہے۔“

مکان میں بالکل سناٹا تھا۔ اسی لمحے ہنومان بیوپاری کے لڑکے کو لے کر مکان میں داخل ہوا۔

”یہ کون ہے ہنومان؟“ جگت نے تعجب سے لڑکے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

ہنومان نے بے ہوش بیوپاری کو لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”اس گدھے کا بچہ ہے حرام زادہ پولیس کو اطلاع دینے جا رہا تھا۔“ یہ سنتے ہی بیوپاری جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لڑکا پولیس کو لے آئے گا اس انتظار میں وہ بے ہوش ہونے کی اداکاری کر رہا تھا۔

اب جگت کو غصہ آ گیا۔ پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کرنے والے شخص پر وہ برہم ہو جاتا تھا۔ جگت نے اپنے فولادی ہاتھ پھیلا کر بیوپاری کا چہرہ بری طرح جکڑتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔

”سور کا بچہ، پولیس کو اطلاع دینے کی کوشش کر رہا تھا؟“

جگت کے دونوں ہاتھوں کی گرفت بیوپاری کی گردن کے گرد سخت ہوتی گئی اور بیوپاری کی آنکھیں ابل پڑیں۔ اس کی پیشانی کی نسیں پھول گئیں۔ باپ کی موت سامنے دیکھ کر لڑکے نے عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”مم...... میں بتاتا ہوں دولت کہاں چھپائی ہے آپ انہیں چھوڑ دیں۔“

لڑکے کے الفاظ نے جگت کو اور مشتعل کر دیا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے ایک تھپڑ اس کے جڑ دیا اور وہ چکرا کر رہ گیا۔ مگر ایک فائدہ یہ ہوا کہ جگت کے ہاتھوں سے اس کے باپ کی جان بچ گئی۔ بیوپاری بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ بے ہوش آدمی کو جان سے مارنا جگت کا اصول نہ تھا۔ اس کے باپ کو چھوڑ کر جگت لڑکے کی جانب متوجہ ہوا۔

”مال کہاں چھپایا ہوا ہے یہ بتا دے پھر میں تجھے پولیس کو اطلاع فراہم کرنے کی کوشش کی سزا نہیں دوں گا۔“

لڑکے نے سب کچھ بتا دیا۔ لڑکے کے بتائے ہوئے ٹھکانوں سے سب زیورات اور دولت نکال لی گئی۔ ایک طرف سونے چاندی کے زیورات اور چاندی کے سکوں کے بنڈل بنائے جا رہے تھے جبکہ دوسری جانب جگت اور ہنومان نے بیوپاری کے لڑکے کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیر اچھی طرح کسنے کے بعد اسے کنویں میں الٹا لٹکانے کا انتظام کر لیا۔

گھوڑوں کی پیٹھ پر لوٹ کا مال باندھ لیا گیا۔ بیوپاری کے بیوی بچے کمرے میں دبکے بیٹھے تھے۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر لیا اور روانگی کی تیاری کرنے لگے۔ روانگی سے پہلے جگت نے کرپال سے کہا۔

”مکان میں قلم، دوات اور کاغذ تلاش کر لاؤ اور میں جس طرح بتاؤں لکھ دو۔“

کچھ دیر کی جدوجہد کے بعد کرپال مطلوبہ چیزیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اس نے جگت کے حکم پر لکھنا شروع کیا۔

”جگت سنگھ عرف جگا تحریر کر رہا ہے کہ پولیس انسپکٹر سنہا تمہارا پولیس ڈپارٹمنٹ کافی کنجوس واقع ہوا ہے۔ میرے سر کے لیے صرف دو ہزار روپے کا اعلان کر کے تم نے میری ہتک اور اپنی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔ انعام کے لالچ میں مجھے گرفتار کرانے کا خطرہ

مول لینے والے کو میں زندہ نہیں چھوڑتا اور ان کے خون کی ذمہ داری پولیس ڈپارٹمنٹ پر ہو گی۔ جگت کی طرف ہاتھ بڑھانا آسان نہیں۔ تم لوگوں میں ہمت ہے تو خود آؤ مقابلہ کرو، ہم ہر وقت کھلے عام سر پر کفن باندھ کر گھوم رہے ہیں اور تم تو سرکار سے تنخواہ پا کر بھی موت سے ڈرتے ہو۔ دوسروں کو موت کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی دعوت مت دو۔ خود آؤ میں ہر وقت تیار رہوں گا۔ کبھی بھی اور کسی جگہ پر بھی مقابلے کے لیے تیار رہنا۔“

پولیس کے نام چیلنج لکھنے کے بعد خط کو گھر کے بیرونی دروازے پر لٹکا دیا اور وہاں سے پانچوں ساتھی خاموشی سے غائب ہو گئے۔

دوسرے دن انسپکٹر سنہا اطلاع ملنے پر پولیس پارٹی کے ساتھ بیوپاری کے گھر پہنچا۔ دروازے پر ہی جگا کا چیلنج لٹکا دیکھ کر اسے جھپٹ لیا اور تیزی سے پڑھنے لگا۔

جگا کا پیغام پڑھ کر برہم ہو گیا اور ہاتھ کی مٹھیاں میز پر مارتے ہوئے چیخا۔

”جگت اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے؟ کوئی ڈاکو زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ سینے میں پولیس کی گولی یا گلے میں پھانسی کا پھندا کوئی ایک انجام اس کے ہاتھ کی لکیروں میں لکھا ہوا ہے اور یہ اس کا مقدر بن چکا ہے۔ میں اسے اچھی طرح سبق دوں گا کہ سیر پر کوئی سوا سیر بھی ہے۔“

انسپکٹر سنہا جوش و غضب سے بھرا ہوا واپس آ گیا۔ وہ رات بھر سو نہ سکا۔ جگا کا زور روز بروز بڑھتا ہی جا رہا تھا اور پولیس کا وقار مجروح ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

وہ سوچتا تھا کہ لوگوں پر ظلم کرتے ہوئے بھی ظالم ڈاکو کو گرفتار کرانے میں پولیس کی مدد کے لیے لوگ آگے آنے کی بجائے عوام اس کی بہادری کے گیت کیوں گاتے ہیں؟ حالانکہ جگا کی انسانیت دوستی کے قصے سن کر اکثر وہ بھی اس الجھن میں گرفتار ہو جاتا تھا کہ ایسا ظالم انسان اتنا رحم دل کس طرح ہے؟ کیا یہ لوگوں کے دل جیتنے کا نسخہ تھا یا پھر اس کے اچھے خاندان کا خون اس کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہا تھا؟

خیالات کی یلغار نے انسپکٹر سنہا پر حملہ کر دیا تھا۔ جگا کی جانب سے ملے ہوئے چیلنج میں اس کا غرور جھلک رہا تھا۔ جب تباہی کی جانب انسان بڑھتا ہے تو اس پر غرور اور تکبر سوار ہو جاتا ہے یہی اس کے بھیانک انجام کی پیش بندی ہوتی ہے۔ جگا کا انجام بھی اب قریب ہے اور وہ بھی اس کے اپنے ہاتھوں۔

انسپکٹر سنہا سوچ میں گم ہو گیا۔

صبح سب سے پہلے انسپکٹر سنہا نے اعلان کیا۔

”آج سے چھ ماہ کے اندر اندر میں جگا کو ختم نہ کر سکا تو اپنے ڈپارٹمنٹ سے استعفیٰ دے کر نوکری سے چلا جاؤں گا۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے جگا کے سر کی قیمت دو ہزار سے بڑھا کر پانچ ہزار کر دی۔

جگت نے جو کچھ سوچا تھا وہی ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا انسپکٹر سنہا کو چیلنج لکھ کر وہ سنہا کو مشتعل کر دے گا۔ مگر کوئی انعام کی لالچ میں آ کر اسے گرفتار کرا دے یا کسی ساتھی کی غداری اسے جال میں پھنسا دے اس سے بہتر یہی تھا کہ انسپکٹر سنہا جیسے بہادر افسر کا مقابلہ کر کے موت کو گلے سے لگانے میں ہی وہ اپنی عزت محسوس کرتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے مسکرا کر کہا۔

”چلو سنہا نے چھ ماہ کی مدت دی ہے۔ انعام کی رقم بھی بڑھا کر پانچ ہزار کر دی ہے۔ اب مقابلہ ذرا سخت رہے گا۔“

”اس کی بجائے کیوں نہ سنہا کو ہی ختم کر دیں۔“ ہنومان نے مشتعل ہو کر مٹھیاں کستے ہوئے کہا۔

’’پولیس ڈپارٹمنٹ میں ہمارے مخبروں کی جانب سے انسپکٹر سنہا کی نقل و حرکت کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ ہم سب مل کر اس پر ٹوٹ پڑیں۔‘‘

’’ایسا کرنا ممکن ہے۔‘‘ ہوشیار نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے کہا۔

’’یہ مجھے اچھا نہیں محسوس ہوتا۔‘‘ جگت نے مردانہ وار جواب دیا۔

’’مزہ تو تب ہے کہ وہ ہمیں فنا کرنے آئے اور خود فنا ہو جائے۔‘‘ جگت کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ’’اس سے پیشتر مجھے بچن والا کام ختم کرنا ہے۔ نہیں تو اطمینان کی موت نہیں مر سکوں گا۔‘‘

❁ ..... ☆ ..... ❁

دیوالی آنے تک جگت نے اپنے گروہ کو اچھی طرح منظم کر لیا۔ اب اس کے ہمراہ با اعتماد اور بہادر افراد کے علاوہ ایسے ذہین لوگ بھی تھے جو اس کے لیے مخبری کے فرائض انجام دیتے تھے۔

گروہ میں ان نو واردوں کو مکمل تربیت اور نئے اسلحہ کی فراہمی کے لیے جگا نے پے در پے کئی کامیاب ڈاکے ڈالے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ آہستہ آہستہ پنجاب پر اپنا اثر بڑھائے اور اس کے لیے اسے بہت سے جاں نثاروں کی ضرورت تھی۔ پولیس کے متعلق اپنے مخبروں کے ذریعے اسے پل پل کی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اس کے لیے اس نے اپنے کئی آدمی پولیس ڈپارٹمنٹ میں شامل کر دیے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ساتھیوں پر بھی اس کی کڑی نظر تھی تاکہ ان میں سے کوئی اس کے ساتھ غداری کا مرتکب نہ ہو۔

اب تک جگت سنگھ کے گروہ کا پولیس سے دو بار مقابلہ ہو چکا تھا مگر وہ صرف ہلکی جھڑپیں تھیں۔ ایک بار تو دونوں پارٹیوں کے درمیان شدت کی فائرنگ کا تبادلہ ہوتا رہا۔ کون سی پارٹی کہاں ہے اس سلسلے میں دونوں پارٹیاں لاعلم تھیں۔ آدھے گھنٹے کی زبردست فائرنگ کے بعد جگت کی پارٹی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کب غائب ہو گئی یہ پولیس پارٹی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

دوسری بار دریا کے دونوں کناروں کی جانب سے گولیوں کی بوچھاڑ کی وجہ سے کافی خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی۔ چاندنی رات تھی اس لیے صحیح نشانے کی سہولت دونوں کی تھی مگر بہتے ہوئے دریا میں پانی چھ فٹ سے زیادہ اونچائی پر تھا۔ پولیس کے لیے دریا پار کرنا مشکل تھا۔ جھاڑیوں کی آڑ میں ڈاکوؤں اور پولیس کے درمیان کافی دیر تک گولیوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ اس دوران دو پولیس مین جگا کا ایک نو تربیت یافتہ ساتھی زخمی ہو گئے۔

جگا نے جب محسوس کیا کہ پولیس پارٹی کی فائرنگ میں شدت نہیں رہی تو وہ مشکوک ہو گیا شاید پولیس پارٹی کسی دوسرے راستے سے دریا پار کرنے کی تجویز پر عمل کر رہی ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں گھیرا جا رہا ہو جگت کی چھٹی حس اسے خطرے سے پہلے ہوشیار کر دیتی تھی جب خطرہ سر پر ہوتا تو جگت طاقت کے بجائے ذہن کو حرکت میں لاتا اس نے اپنی پارٹی کو حکم دیا۔

’’فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹتے جاؤ۔‘‘

اس نے صحیح اندازہ لگا لیا تھا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہی پولیس دوسرے کنارے پر پہنچ چکی تھی۔ مگر انہیں ناکام واپس لوٹنا پڑا اس لیے جگت موقع سے فائدہ اٹھا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

دیوالی قریب آ گئی۔

دیوالی میں تقریباً ہفتہ بھر باقی تھا جب جگت نے بچن سے کہا۔

’’چلو! آج ہم تمہاری محبوبہ کے گھر جا کر تمہارا بھی فیصلہ کر دیتے ہیں۔‘‘ جگت کے لبوں پر پر شفقت مسکراہٹ تھی۔

جگت اور بچن جب اس گاؤں میں پہنچے جہاں بچن کی محبوبہ رہتی تھی تو رات کے تقریباً نو بج چکے تھے۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی بچن کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ دو سال پہلے کسی کی بیاہتا بنی ہوئی اپنی محبوبہ کو اغوا کرنے کے لمحات جس قدر قریب ہو رہے تھے اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ سب سے اہم سوال جو اس کے ذہن میں بچھو کے لگا رہا تھا وہ یہ تھا۔

’’کیا اچلا آج بھی اسے اسی طرح چاہتی ہو گی؟ کیا وہ اپنے شوہر کا گھر چھوڑ کر میرے ساتھ آنے پر تیار ہو جائے گی؟‘‘

اچلا کے ساتھ بچن کا پیار بچپن کی یاد تھی مگر اچلا کے جواری باپ نے دولت کے لالچ میں اپنی بیٹی کا دور کے گاؤں بیاہ کر دیا۔ بچن کو اطلاع ملی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شکستہ دل بچن اچلا کے باپ کو قتل کرنے پر تیار ہو گیا مگر قدرت نے بچن کی خواہش پوری کر دی جوئے کے سلسلے میں اچلا کے باپ کا جھگڑا ہو گیا جس میں اچلا کا باپ زخمی ہو گیا مگر اس سے پہلے اس نے اپنے جواری ساتھی کو قتل کر دیا اور اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ اس کے بعد اچلا تنہا رہ گئی۔

اب دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا جس سے وہ اپنا دکھ کہہ سکتی۔

دل شکستہ بچن فوج میں بھرتی ہو گیا۔ مگر اچلا اس کی روح میں سمائی ہوئی تھی۔ اس کی تصویر کے نقوش وہ کوشش کے باوجود اپنے دل سے نہ مٹا سکا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ سے اچلا بھی بے خبر نہ ہو گی اور اس یقین کی بنیاد پر وہ جگت کے ساتھ اچلا کو اغوا کرنے کے سلسلے میں اپنی منزل کی جانب بڑھ رہا تھا۔

پیچ در پیچ تنگ گلیاں پار کرتے ہوئے دونوں ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رک گئے۔ جگت نے کہا

’’بچن! میں اکیلا اندر جاؤں گا۔ تم اپنی رائفل مجھے دو اور میرا پستول تم رکھ لو۔ اس طرح کونے میں دبک کر کھڑے ہو جاؤ کہ کسی کو شک نہ گزرے۔ میں جب اچلا کو لے کر باہر آؤں فوراً ہی تم اسے گھوڑے پر بٹھا کر فرار ہو جاؤ گے۔ باقی کام میں خود نمٹا لوں گا۔‘‘

دور کونے میں دبک کر کھڑے ہوئے بچن نے دیکھا کہ جگت نے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا دروازہ کھلا آنے والے کا چہرہ دیکھنے کے لیے لالٹین بلند کی گئی۔ لالٹین کی روشنی میں بچن نے دیکھا وہ اچلا ہی تھی۔

’’تو کیا اس کا شوہر گھر میں موجود نہیں؟‘‘ بچن نے سوچا۔

’’کس کو تلاش کر رہے ہیں؟‘‘ دروازے پر کھڑے ہوئے جوان سے اچلا نے دریافت کیا۔ جوان کے شانے پر رائفل دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔

’’اچلا بہن آپ کا نام ہے؟‘‘ جگت نے اطمینان کی خاطر پوچھا۔ ’’میں آپ کے رشتے داروں کی جانب سے آیا ہوں۔ بچن کا دوست ہوں۔‘‘

بچن کا نام سنتے ہی اچلا کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر دکھ کے سائے منڈلانے لگے۔ اس کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی مگر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

’’تشریف لائیے وہ جب تک کھانا کھا رہے ہیں آپ یہیں بیٹھیے۔‘‘ اچلا نے چارپائی بچھاتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اس کے شوہر کی آواز سنائی دی۔ ’’کون آیا ہے؟‘‘

اچلا دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جگت نے دیکھا لالٹین دونوں کمروں کے دروازے کے درمیان لٹک

رہی تھی۔ جس سے دونوں کمروں میں مدھم سی روشنی تھی۔ مکان کی حالت اچھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اچلا کے حسین چہرے پر سکھ کی لالی نہیں تھی۔

"زبردستی بیاہی ہوئی اچلا شاید بچن کا گھر آباد کرے گی۔" جگت کے دل میں امید جاگ اٹھی پھر اس نے اچلا کے شوہر کی آواز سنی۔

"بھائی! اندر تشریف لائیے۔"

جگت اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر دوسرے کمرے میں داخل ہوا اسی لمحے اچلا نے پھرتی سے چارپائی اٹھا کر کمرے میں لا کے بچھا دی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی جگت کی پہلی نظر جھولے پر پڑی اور وہاں سے گزرتی ہوئی اچلا کے شوہر پر آ کر جم گئی۔ حیرت سے آنکھیں پھیلائے جگت اسے دیکھنے لگا۔ اس جوان شخص کے دونوں ہاتھ کلائیوں سے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے کٹے ہوئے ہاتھ ہلا کر جگت کا استقبال کیا۔ جھولے میں سوئے ہوئے بچے اور کھانے پر بیٹھے ہوئے شوہر کے درمیان اچلا دو کام ایک ساتھ انجام دے رہی تھی۔ دائیں ہاتھ سے وہ اپنے شوہر کے منہ میں روٹی کا نوالہ دے رہی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ جھولے کو ہلا رہا تھا۔ اس منظر نے جگت کا دل ہلا دیا۔ چارپائی کے قریب رکھا ہوا پانی کا گلاس جگت نے ایک سانس میں حلق میں انڈیل لیا۔

"میں نے ابھی سنا ہے کہ آپ بچن سنگھ کے دوست ہیں۔" اچلا کے شوہر شاردول سنگھ نے کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں اگر شادی سے پہلے مجھے اس بات کا پتا چل جاتا تو میں شادی سے انکار کر دیتا۔" اس نے نوالہ حلق سے نیچے اتار لیا۔ اس دوران خاموشی چھا گئی۔ اچلا نظریں جھکائے اپنے کام میں مشغول رہی۔ شاردول نے مزید کہا۔

"ویسے بھی مجھ سے بیاہ کر اس بے چاری کو کون سا سکھ ملا ہے؟ ایک طرف گھر میں جھولا بندھا دوسری طرف میرے ہاتھ کٹ گئے۔ کارخانے کی مشین سے یہ حادثہ ہوا۔"

اپنے شوہر کے لبوں سے پانی کا گلاس لگاتی ہوئی اچلا بولی۔

"پہلے آپ اطمینان سے کھانا کھا لیں ابھی تو آپ آ کر بیٹھے ہی ہیں۔"

مگر شاردول پانی پی کر پھر کہنے لگا۔ "بچے اور شوہر کی تیمارداری کا بار اٹھا کر زندگی برباد کر رہی ہے۔ لوگوں کے گھر کام کر کے تھوڑا بہت کما لاتی ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت مجھے کھانا کھلا رہی ہے۔"

جگت کا دل دہل رہا تھا۔

"کارخانے کے مالک نے اس کا کوئی معاوضہ دیا؟" جگت نے دریافت کیا۔

"معاوضہ؟" شاردول سنگھ کے لبوں پر حقارت آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"مجھے دھکے دے کر نکال دیا گیا۔ میں نے بڑی عاجزی کی کہ سیٹھ صاحب میں اپنے پیروں سے جو کچھ کام ہو سکے گا کرنے کو تیار ہوں میری روزی مت چھینو مگر اس نے ہاتھ کٹنے کے بعد ڈاکٹر کو علاج کے پیسے تک نہ دیے وہ روزی کیا دیتا؟"

شاردول کھانا کھا چکا تو اچلا نے بھیگے ہوئے ہاتھ سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

کھانے سے اٹھتے ہوئے اس نے شوہر سے کہا۔

"اب تم بھی کھانا کھا لو اتنی دیر میں ان سے بات کر لوں۔" جگت نے دیکھا کہ شاردول کے برتن میں جو جوٹھا بچا ہوا تھا اچلا وہی کھانے لگی۔ شاید یہ ان کا روز کا معمول ہوگا۔

اب تک جگت نے جو کچھ دیکھا تھا اس سے اس کا ذہن الجھ کر رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ سخت کشمکش میں مبتلا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

"قدرت نے جس شخص کے ہاتھ چھین لیے ہوں کیا ایسے اپاہج سے اس کی بیوی چھینی جا سکتی ہے؟"

شاردول نے جگت سے اس کا نام پتا اور کام دریافت کیا۔ اس وقت جگت نے بات اڑا دی۔ جب بچن کے متعلق سوالات کے جواب میں اس نے کہا۔

"ہاں، وہ فوج میں بھرتی ہوا تھا مگر وہاں سے فرار ہو کر اب جگا ڈاکو کی پارٹی میں شامل ہے۔"

"اوہ۔" شاردول نے متعجب انداز میں کہا۔

اچلا نے بھی اس بات سے سخت ذہنی اذیت محسوس کی۔

"یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔" شاردول نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اگر میں اچلا سے بیاہ نہ کرتا تب بچن سنگھ اس راستے پر نہ ہوتا۔"

جگت نے کنکھیوں سے اچلا کی آنکھوں کے کونوں پر تیرتے ہوئے آنسو دیکھے۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کچھ حاصل کرنے آیا تھا اور کچھ حاصل کیے بغیر واپس لوٹنے کو تیار ہو گیا تھا مگر اسی وقت اسے بچن سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا لیکن کچھ سوچ کر اس نے سر جھٹک دیا اور شاردول سنگھ سے بولا۔

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اچلا بہن سے ایک کہنا چاہتا ہوں۔"

"ارے، خوشی سے اگر کہیں تو میں باہر چلا جاؤں؟" شاردول نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اچلا کو کافی حیرت تھی۔ ایک انجان شخص اس کے ساتھ تنہائی میں کیا بات کرنا چاہتا تھا؟ کیا بچن سنگھ نے کوئی پیغام بھیجا ہے؟ مگر اس نے دیکھا کہ بات اس کے برعکس نکلی۔

جگت نے اس کی طرف جھک کر آہستہ سے کچھ کہا اور جانے سے پہلے جھولے میں لیٹے ہوئے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور روپوں کی تھیلی جھولے میں رکھ کر پر اسرار طور پر تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کے باہر چلا گیا۔ اچلا نے دروازے کے درمیان کھڑے ہو کر دیکھا کہ دو گھڑ سوار اندھیرے میں چادر میں چھپ گئے۔ وہ سمجھ گئی یقیناً دوسرا شخص بچن سنگھ ہے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے اپنے شوہر سے کہا۔

"اجنبی شخص جگا ڈاکو تھا۔"

جگت کو خالی ہاتھ واپس لوٹتے دیکھ کر بچن مایوس ہو گیا مگر جگت کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی کی چادر دیکھ کر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ دونوں خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے دور نکل آئے۔ بچن نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے پوچھا۔

"جگت! کیا ہوا؟ اچلا کیوں نہیں آئی۔ کیا اس کے شوہر نے اسے روک لیا؟" پھر اس کی آواز میں تلخی پیدا ہو گئی۔

"کیا وہ اتنا بہادر تھا کہ تم جیسے کو وہاں سے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا؟"

"بچن......!" جگت نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"وہ اتنا کمزور تھا کہ میں اس سے اس کی بیوی نہ چھین سکا۔ اچلا کے شوہر کے ہاتھ کٹ گئے ہیں جبکہ وہ ایک بچے کا باپ بھی ہے۔" جگت نے پوری کہانی بچن سنگھ کو تفصیل سے سنا دی۔ اچلا سے تنہائی میں کی گئی بات سن کر بچن سنگھ سوچ میں گم ہو گیا۔ اچلا نے کہا تھا۔

"جگت بھائی! جبکہ میرے شوہر کو میری ضرورت ہے اس وقت میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں تو عورت کے نام کو دھبہ لگ جائے گا۔ مگر آپ بچن کا خیال رکھیے گا۔ اسے کسی اچھی لڑکی سے بیاہ دینا اپنے بچے کا نام

بھی میں نے بچن سنگھ ہی رکھا ہے یا اسے بتا دینا۔"
بہت دیر تک بچن خاموش رہا۔ جگت اس کا دکھ جانتا تھا اس نے بچن کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔
"مرد ہو کر اتنے کم ہمت نہ بنو دوست اب میں نے تمہارے حصے میں سے کچھ رقم اچلا کے گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس طرح تم اس کو زندگی دے سکتے ہو اور اپنے دل کا بوجھ بھی ہلکا کر سکتے ہو۔" اس کے بعد دونوں خاموشی میں ڈوب گئے۔

☆
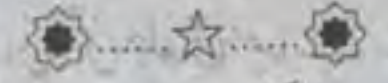
دیوالی سے پہلے جگت کا ماموں ہزارہ سنگھ سوا سال کی قید بھگت کر جیل سے باہر آیا۔ اس وقت جگت کے نانا جیل کے دیوہیکل دروازے کے سامنے کھڑے ہوئے انتظار کر رہے تھے۔ ہزارہ سنگھ کا دل اپنے والد کو دیکھ کر بھر آیا۔
بیٹا باپ سے اچھی طرح واقف تھا۔ بھانجے کا انتقام لیے بغیر گھر واپس نہ لوٹنے والا باپ فولادی جگر کا انسان دس پندرہ میل پیدل چل کر صبح کے وقت ہی اسے لینے کے لیے آ گیا۔
اس بات سے ہزارہ سنگھ متعجب تھا۔ محبت سے جھکتے ہوئے ہزارہ سنگھ نے ان کے پیر تھام لیے مگر اسی لمحے اس کے شانے تھام کر اس کے والد نے اسے سینے سے لگا لیا۔
مرد کی آنکھ میں دکھ تو کیا مسرت کے آنسو بھی نہیں ہوتے۔ اس بات پر یقین رکھنے والے بہادر نانا خون کی گرمی سے پگھل گئے اور ان کی آنکھیں برسنے لگیں۔
بیٹے کو آنسو نظر نہ آئیں اس لیے انہوں نے ہزارہ سنگھ کا سر اپنے سینے میں دبا لیا اور جلدی سے صافے کے کنارے سے آنسو خشک کر لیے۔ والد کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہزارہ نے پوچھا۔
"باپو آپ کافی دبلے ہو گئے ہیں۔"
"یہ تو بیٹے بڑھاپے کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے۔ اب تو آنکھوں کی روشنی بھی مدھم ہو گئی ہے۔ پانی بھی بھر آتا ہے۔" یہ کہہ کر پھر ایک بار انہوں نے آنکھیں خشک کیں۔ پھر بولے۔
"مگر بیٹے! تمہیں تو جیل کی خوراک بھا گئی ہے۔ مجھے تو محسوس ہوتا تھا کہ جیل کی خوراک تمہیں کمزور کر دے گی کیونکہ جیل میں کھانا کم اور مزدوری زیادہ کرنا پڑتی ہے تمہارا جسم بھی حرام خوروں نے جلا دیا ہوگا۔ مگر تم تو پہلے سے زیادہ تندرست نظر آ رہے ہو۔"
"یہ بھی عمر کی وجہ سے باپو۔" پہلی بار ہزارہ نے باپو سے پر مذاق لہجے میں کہا۔
"جوانی میں تو جسم مضبوط ہوتا ہی ہے اور دوسرے بھانجے کی وجہ سے بھی۔"
نانا سمجھے کہ جگت بڑا ڈاکو بن گیا ہے اس لیے مسرت کے سبب اس کی صحت پر اچھا اثر پڑا ہے۔ لیکن ہزارہ نے تفصیل سے بتاتے ہوئے کہا۔ "پہلے تو مجھے ان لوگوں نے نو مہینے تک بہت پریشان کیا مزدوری بھی ڈبل کراتے جبکہ آدھی خوراک ملتی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگلے چھ ماہ میں میرا جسم ٹوٹ جائے گا اور جب آپ سے ملاقات ہوگی تو میرا جسم سوکھ کر کانٹا ہو چکا ہو گیا مگر جب جگت ڈاکو بن گیا تو ساری جیل مجھے ڈاکو کے ماموں کے نام سے جاننے لگی۔ لوگ میری عزت کرنے لگے۔ بات بات پر ڈانٹنے والا داروغہ تو ایک دن میں نرم ہو گیا۔ پھر تو ڈبل کھانا اور آدھا کام ہو گیا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ پھر داروغہ خود ہی مجھے اطلاع دیتا تھا کہ تمہارے بھانجے نے آج فلاں جگہ ڈاکہ مارا ہے اور فلاں کو قتل کیا ہے۔"
نانا کو مسرت ہوئی۔

"یہ بات ہے جگت نے باہر تو باہر جیل میں رعب طاری کر دیا ہے۔"
باپ بیٹے دونوں آگے بڑھنے لگے۔ راستے کے ایک جھگی نما ہوٹل میں دونوں نے ایک ایک گلاس لسی پی اور اٹھ کھڑے ہوئے لیکن انہیں جانا کہاں ہے؟ یہ دونوں میں سے کوئی نہیں کہتا تھا اور نہ ایک دوسرے سے معلوم کرتا تھا۔
نانا سوچ رہے تھے کہ انتقام لیے بغیر بیٹے کو گھر نہ آنے کو کہا ہے۔ شاید وہ جیل سے باہر آ کر گھر آنے کے متعلق سوچ رہا ہو۔ لہٰذا اسے کسی طرح روکنا چاہیے۔ ہزارہ اس خیال سے خاموش تھا کہ سوا برس جیل میں گزرے ہوئے بیٹے کو ابا گھر چلنے کے لیے کہے گا تو وہ انکار کس طرح کر سکے گا؟
"آج میں انہیں یاد دلاؤں گا باپو! آپ نے مجھے حساب صاف کیے بغیر گھر آنے کے لیے منع کیا تھا۔"
ہزار سوچ رہا تھا۔
اس الجھن میں راہ چلتے ہوئے وہ دونوں ایسی جگہ آ کر رک گئے جہاں سے دو راستے الگ ہوتے تھے۔ ایک رتیا کی جانب اور دوسرا دھرم پور کی سمت۔ دونوں کے قدم ایک ساتھ رک گئے۔ خاموش خاموش سے دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ دونوں سمجھ گئے کہ وہ ابھی تک اس بات کو بھولے نہیں ہیں۔
باپو کی الجھن ختم کرنے کی غرض سے ہزارہ سنگھ نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔
"باپو! آپ بھی میرے ساتھ رتیا چل رہے ہیں؟ راہ میں باتیں کرتے ہوئے چلیں گے وہاں بہن اور بہنوئی آپ کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔ شام کو گھر لوٹ جائیے گا۔"
نانا سمجھ گئے کہ بیٹا بھی ان کی طرح بات کا دھنی ہے۔ وہ کچھ کہتے کہ ان سے پہلے ہزارہ نے مزید کہا۔
"باپو! مجھے پتا ہے کہ ابھی ایک دشمن زندہ ہے۔ اسے ختم کرنے کے لیے مجھے وہاں جانا پڑے گا۔ مجھے تعجب اس بات پر ہے کہ جگت نے اتنے مہینوں سے ڈاکو بننے کے بعد اسے زندہ کیسے رہنے دیا؟ شاید یہ قتل اس نے اپنے ماموں کے لیے بچایا ہے۔ اچھا ہی ہوا! بھانجے کے ساتھ ڈاکو بننے کے لیے کچھ بہانا تو چاہیے۔"
ہزارہ کی زبانی اتنی جلدی ایسا سننے کے متعلق نانا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بیٹا جیل سے چھوٹ کر ابھی گھر نہیں پہنچا تھا اور قتل کرنے کے منصوبہ بنا رہا تھا۔ نانا کی چال دھیمی ہو گئی مگر انہوں نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اب ان کی چال میں تیزی آ گئی تھی۔
جس بیٹے کو خود انہوں نے انتقام کے راستے پر ڈال دیا اسے کس منہ سے روک سکیں گے؟ رتیا گاؤں میں جب وہ دونوں داخل ہوئے تو لوگ انہیں دیکھ کر آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔
"جگا کا ماموں جیل سے باہر آ گیا ہے اس لیے اب موہن سنگھ لمبے عرصے تک نہیں جی سکے گا۔ پولیس کی نگرانی اور حفاظت کے سبب وہ جگت سنگھ سے تو بچ گیا ہے مگر اب اس کے ماموں سے بچ کر کہاں جائے گا؟"
جگت کی ماں نے دروازہ کھولا اپنے سامنے بھائی اور والد کو کھڑے دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہوا۔ ہزارہ آج رہا ہوگا یہ تو انہیں پتا تھا مگر وہ رہا ہو کر سیدھا یہیں آئے گا اس بات کی انہیں امید نہیں تھی۔ ہزارہ نے بہن کے پیر چھوئے۔ بہن نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔
"جیتا رہ ویر۔"
پھر اس نے اپنے باپ کے قدم چھو کر کھڑکی بند کر دی۔ اس نے دیکھا باہر کھڑے ہوئے متجسس لوگ

ان کے دروازے کو بند ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔
"دیکھیے تو ہمارے گھر کون آیا ہے؟" جگت کی ماں نے اندر کی طرف رخ کرتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔ اپنی جگہ سے کھڑ ہو کر جگت کے باپو باہر آئے۔ انہوں نے پرمسرت نظروں سے سسر اور سالے کو دیکھا اور متعجب انداز میں استقبال کیا۔
"معلوم ہوتا ہے کہ ہزارہ کو لے کر آپ سیدھے یہیں آئے ہیں۔"
وہ لسی پیتے ہوئے ایک دوسرے کو معلومات فراہم کرنے لگے۔ ہزارہ نے دیکھا بیٹے کی جدائی نے بہن کے چہرے پر جھریاں ڈال دی تھیں۔ انہیں اطمینان دلانے کی غرض سے اس نے کہا۔
"بہن جگا نے تو سارے علاقے پر رعب طاری کر دیا ہے۔ میں نے سوا برس جیل کی سلاخوں کے پیچھے برباد کیا جبکہ اس نے چھ ماہ ہی میں شیخو پورہ کی حکومت لے لی ہے۔"
نانا نے اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔
"ہاں اور اس گھر میں رانی بھی آنے والی ہے ایک دو ماہ میں۔"
"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" ہزارہ نے متعجب آواز میں پوچھا۔ "جیل میں مجھے بہت سی اطلاعات سننے کو ملیں مگر یہ میرے لیے نئی اطلاع ہے۔"
"ایسی باتیں کیا عام ہوتی ہیں؟" نانا نے مدہم آواز میں کہا۔
"چندن کور نے خود بیاہ کی دعوت دی تھی۔ پھر اس سے انکار کس طرح ہوتا؟ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر باجے گاجے سے بارات لانی ہے ہمیں۔"
"اس کی فکر نہ کریں۔ بھانجے کو اطلاع پہنچا دیں کہ ماموں جیل سے رہا ہو کر آ گیا ہے دیکھتا ہوں اس کے بیاہ کو کون روکتا ہے۔" ہزارہ نے پرجوش لہجے میں کہا۔
"ہزارہ تم باہر آ گئے ہو اس بات کی اطلاع جگا کو پہلے ہی مل چکی ہے۔ پرسوں ہی اس کا مخبر سادھو کے بھیس میں گھر آیا تھا۔" سوہن سنگھ نے کہا۔ "تمہارے بھانجے نے پیغام بھیجا ہے کہا ہے ماموں سے کہنا نانا کا خیال رکھیں اور فی الحال رتیا میں ہی قیام کریں۔"
"اس میں اس نے نئی بات کیا کی ہے؟ میں فی الحال یہیں مقیم ہوں۔" ہزارہ نے کہا۔
اسی لمحے جگت کی ماں نے درمیان میں کہا۔ "جگت نے پیغام بھیجا ہے یہ ٹھیک ہے مگر تمہیں باپو کے ساتھ دھرم پور رہنا ہوگا۔ ہمیں جس قدر تمہاری ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ باپو کو ضرورت ہے۔ اس عمر میں بے چارے باپو کو.....!" یہ کہتے ہوئے ان کا دل بھر آیا۔
بیٹی کی بات سن کر نانا نے فوراً کہا۔
"بیٹی! ہزارہ کے لیے ہم کیوں فکر کریں؟ یہاں رہے کہ وہاں، یہ چند دن کا مہمان ہے۔"
"یعنی..... آپ کا مطلب کیا ہے؟" جگت کے ماں باپ نے ایک ساتھ پوچھا۔
"یہ بھی بھانجے کے ساتھ شامل ہو جائے گا باقی بچے ہوئے دشمن کو بھی ٹھکانے لگانا ہے۔"
کیا.....؟" ماں جی چیخ اٹھیں۔
"باپو! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں کیا گھر میں جتنے لوگ ہیں سب کو ایک انتقام کی آگ میں جھونک دیں گے؟ بیٹا تو گیا مگر اب بھائی کو میں اس راستے پر نہیں جانے دوں گی۔" پھر آنسو بہاتے ہوئے انہوں نے کہا۔ "اگر ایسا ہوا تو آپ مجھے زندہ نہیں دیکھیں گے۔"
سوہن سنگھ درمیان میں بولے۔ "تم تو رونے لگیں

اور اپنے بیٹے کے بیاہ کے متعلق باپو کو کہنا بھول ہی گئیں۔" پھر نانا نے کہا۔ "جگت نے پیغام بھیج کر شادی کا دن اور وقت مقرر کر دیا ہے جس میں اب صرف ڈیڑھ ماہ باقی ہے۔ اس نے کہلوایا ہے کہ شادی کی تمام تیاریاں مکمل کر لی جائیں اور یہ کہ شادی کی رسومات آدھی رات کے وقت کسی انجان جگہ پر ہوں گی۔ اس نے یہ بھی کہلوایا ہے کہ شادی کے بارے میں کسی کو پتا نہ چلے صرف گھر کے افراد بیاہ میں حاضر ہوں۔"
"بہن! اب تو آپ ساس بن جائیں گی۔" ہزارہ نے ماں جی کی ڈھارس بندھانے کی غرض سے کہا۔
"بھائی..... یہ تو بھگوان جانے تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہی ہوگا۔ مجھے تو پولیس انسپکٹر سنہا کا خوف ستا رہا ہے چھ ماہ میں جگت کو گرفتار کرنے کا اس نے عہد کیا ہے۔"
"بیٹی! تو ایسی اچھی بات کے درمیان منحوس باتیں کیوں کر رہی ہے؟" نانا نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "سنہا کیا خدا کا بیٹا ہے؟ وہ کہتا ہے تو کیا وہ جگت کو چھ ماہ میں گرفتار کر لے گا؟" پھر سوہن سنگھ کی جانب منہ کر کے کہنے لگے۔
"تم دودھیا گاؤں جا کر شادی کی تیاری کی بات کر آؤ۔"
"میں بھی اپنے بہنوئی کے ساتھ جاؤں گا۔" ہزارہ نے پرمسرت لہجے میں کہا۔
مگر نانا نے انکار میں سر ہلا دیا۔
"نہیں، تم دونوں جاؤ گے تو پولیس مشکوک ہو جائے گی لہٰذا انہیں اکیلے جانے دو دیوالی کے اوقات میں جائیں گے تو کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔"

⊛.....☆.....⊛

شادی کے دن اور تاریخ کے بارے میں سن کر چندن کور اور اس کے باپ کو مسرت ہوئی۔ ان کے علاوہ کانے کو بھی بے حد مسرت ہوئی۔ تین چار ماہ کے دوران اس نے چندن کور کے مکان میں اپنا اڈہ بنا لیا تھا۔ جگت اور ہنومان جس رات چندن کور سے ملاقات کی غرض سے آئے اسی وقت سے اس نے جگت کے سر پر مقرر کیا ہوا انعام حاصل کرنے کی غرض سے کوشش شروع کر دی تھی۔ خود کو بے آسرا اور بے کار ظاہر کر کے وہ چندن کور کے باپ کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے گھر کا جھاڑو وصفائی اور دوسرا چھوٹا موٹا کام کانے کے ذمہ تھا۔ اس کے بدلے میں اسے پیٹ بھر روٹی ملتی تھی۔ دو تین ماہ تک وہاں اسے شادی کے متعلق کوئی آثار نظر نہیں آئے اس لیے انعام پانے کی تمنا مایوسی میں بدلنے لگی۔ انہی دنوں اسے امید کی کرن نظر آئی۔ بشن سنگھ نے چپ چاپ چندن کور کے لیے بیاہ کے جوڑے سلوانے کی غرض سے گھر میں درزی بٹھایا۔ چندن کی چال میں بھی نئی امنگ نظر آنے لگی۔ اس کے چہرے پر پھوٹتی ہوئی مسرت کی روشنی کنواری لڑکی کے بیاہ کی پرمسرت خبر کی گواہی دے رہی تھی۔
کانا گھر کے کام کے بہانے باپ بیٹی کی ہر بات سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران جگت کے ابا دیوالی کے بہانے بشن سنگھ سے ملنے آئے۔ اس دن کانا بیماری کا بہانہ کر کے دن بھر گھر میں رہا۔ اس کے تیز کانوں نے شادی کا پروگرام سن لیا اور اس کا دل ناچ اٹھا۔ اس کو تین مہینے تکلیف جھیلنے کے بدلے میں تین ہزار سے زیادہ انعام ملنے والا تھا۔ وہ قدرت کی مہربانی دیکھ رہا تھا۔ اس زمانے میں سرمایہ دار کہلوانے کے لیے پانچ ہزار روپے کافی تھے۔ کانا اپنی ایک آنکھ سے سرمایہ داری کے خواب دیکھنے لگا۔
دو دن بعد دور کے رشتے دار سے ملنے کا بہانہ کر

کے کانا انسپکٹر سنہا کے گھر پہنچا۔ مکان پر پہرہ دیتے ہوئے پولیس مین نے اسے روکا ملنے کی وجہ بتانے کے متعلق اس پر دباؤ ڈالا مگر اس نے ہاتھ جوڑ کر عاجزانہ لہجے میں کہا۔

"مجھے ایک بار سنہا صاحب سے ملنے کی اجازت دیں۔"

سنہا کو پہلی نظر میں کانا کوئی خطرناک قسم کا مجرم دکھائی دیا۔ اس نے دو تین بار اس سے پوچھا بھی۔

"بتا تجھے مجھ سے کیا کام ہے؟"

مگر کانا اپنی ایک آنکھ کو کمرے میں چاروں سمت گردش دیتا ہوا خاموش رہا۔

سنہا اچانک چوکنا ہوگیا۔ اس نے پیٹی سے پستول نکال کر اس کا نشانہ لے لیا شاید وہ جگا کا آدمی ہو یہ سوچ کر اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "تیرے لباس کے نیچے اگر کوئی اسلحہ ہے تو اسے فرش پر پھینک دے ورنہ میں تجھے پھونک دوں گا۔"

کانا لرزنے لگا۔ سنہا صاحب الٹا سمجھ بیٹھے۔ یہ سمجھ کر اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"صاحب، آپ مجھ پر غلط شک کر رہے ہیں۔ میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" سنہا نے پستول کی نال کا رخ کانے کی جانب کر کے سخت لہجے میں پوچھا۔

"ایک اہم اطلاع دینا چاہتا ہوں۔" کانے نے سنہا سے کہا پھر اطراف میں نظریں دوڑانے لگا۔

"جو کچھ کہنا ہے کہو یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔"

"صاحب جگا کو قابو کرنے کا سنہرا موقع ہے۔"

"اچھا.....!" سنہا نے اس کے چہرے کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "انعام حاصل کرنے کے چکر میں آیا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتا؟"

"حضور! مجھے انعام اور آپ کو نام ملے گا۔" کانے نے دھیمے لہجے میں کہا۔

سنہا نے سوچا آدمی کام کا معلوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی اسے چیک کرنا ضرور تھا۔

"اگر تیری اطلاع غلط ہوئی اس صورت میں تجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ٹھونس دوں گا۔ تم جگا کی پارٹی سے الگ تو نہیں ہوئے ہو؟"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے جناب؟ اس کا ساتھ دے کر پھانسی ہی مل سکتی ہے مگر میں نے اپنی ایک آنکھ سے اسے غور سے دیکھا ہے اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں یہ میرے کانوں سے سنی ہوئی بات ہے۔"

کانے کی باتیں سن کر انسپکٹر کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔ جگا کو ختم کرنے کے لیے اسے اب چھ ماہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ بلکہ اگر کانے کی اطلاع صحیح ہے تو ایک ماہ کا عرصہ کافی ہے۔ کانا کافی چالاک ثابت ہوا۔ اس نے سنہا کو جو اطلاع دی اس میں ایک خاص نقطہ چھوڑ گیا۔

"شادی کس دن اور کہاں ہونے والی ہے یہ ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہوسکا۔ کچھ دن اور ہمیں انتظار کرنا پڑے گا۔ اس کی اطلاع میں بہت جلد فراہم کردوں گا۔"

سنہا محسوس کر رہا تھا کہ اس شخص کو ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے اس نے کانے کو یقین دلایا۔

"تمہاری اطلاع کے ذریعے اگر جگا زندہ یا مردہ گرفتار ہوگیا تو اس صورت میں اس کے سر پر مقرر کی ہوئی رقم پانچ ہزار روپے کے بلا شرکت غیرے تم مالک ہو گے۔ جو کچھ تمہیں معلوم ہو اس کی اطلاع فوراً مجھ تک پہنچاتے رہو۔ تمہیں مجھ تک آنے سے کوئی نہیں روکے گا۔"

کانا واپس لوٹنے کے لیے اپنی جگہ سے کھڑا

ہوگیا۔ سنہا نے اسے خبردار کیا۔

"مگر چوکس رہنا انہیں ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے کہ تم مجھے اطلاع فراہم کرتے ہو۔"

"قطعی فکر نہ کریں جناب! میں جگا کے سسرال میں پوری طرح گھس چکا ہوں اور اندر داخل ہو کر وہاں کا راز کس طرح چوری کرنا ہے میں اسے بہتر سمجھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر کانا دروازے کی جانب بڑھا اور سنہا کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

سنہا جیسا جہاندیدہ پولیس آفیسر ایسا نہیں تھا کہ اس طرح کسی پر ایک دم اعتماد کرلے۔ اس نے کانے سے ملی ہوئی اطلاعات کو چیک کرنے کے سلسلے میں کانے کی نگرانی شروع کرادی۔ فوراً ہی اسے اطلاع دی گئی کہ کانا وہاں سے سیدھا چندن کور کے مکان پر گیا ہے سنہا کو اب کسی قدر اطمینان ہوا۔ سنہا کو یہ ایک مہینہ گزارنا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے سی آئی ڈی کو بھی کام پر لگادیا۔ جگا کے گھر، اس کے نانا کے گھر اور چندن کور کے گھر میں ہونے والی ہر سرگرمی پر اس کی گہری نظر تھی۔ بیاہ کے وقت جگا اور اس کی پارٹی کو کس طرح گھیرا جائے؟ اس کے متعلق پلان مکمل کرلیا گیا۔ پندرہ یوم بعد کانے کی جانب سے مزید اطلاع فراہم ہوئی۔ بیاہ کا دن جگہ کا تعین سب کچھ معلوم ہوگیا۔

❁......☆......❁

چاند آہستہ آہستہ آسمان پر بلند ہونے لگا اور چاندنی نے پورے گاؤں پر روشنی کی سفید چادر پھیلا دی۔ ٹھنڈی ہوا جسم میں کپکپاہٹ سی پیدا کر رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ رضائیاں اوڑھے بستروں میں گھسے بیٹھے تھے۔ جاگنے کے شوقین فالتو اور دکھی لوگ جن کی تعداد بہت کم تھی گاؤں کے چوک میں لکڑیاں جلا کر خود کو گرم کر رہے تھے۔ وہ آپس میں گپ بازی کر رہے تھے۔ دور سے ایک تال پر گونجتا ہوا بھجن ماحول میں عجیب سی پاکیزگی بکھیر رہا تھا۔ کبھی کبھی دو چار کتے اپنی عادت کے مطابق بھونک کر خاموشی اختیار کرلیتے تھے۔

آدھی رات گزرتے ہی پورے گاؤں پر سناٹے کی حکمرانی ہوگئی۔ سنہا اضطرابی انداز میں بار بار پاکٹ واچ نکال کر وقت دیکھ رہا تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گھڑی کی سوئی کسی مریل بیل کی طرح گھسٹ رہی ہو۔ اس کا ہاتھ بار بار پہلو میں لٹکے ہوئے پستول کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کرلیتا تھا۔ وہ چھت پر سے سناٹے میں ڈوبے ہوئے دیہات میں چاروں سمت تیز نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر وہ چونک کر سیدھا ہوجاتا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کے لیے اس کے کان ہوا کی سرسراہٹ سننے کی کوشش کر رہے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ہولناک سناٹا کبھی نہیں ٹوٹے گا۔

ایک بج گیا...... پھر وہ...... اس کا اضطراب بڑھنے لگا۔ اتنی بہت ساری تیاریاں کرنے کے باوجود اگر جگا نہیں آیا تو کیا ہوگا؟ وہ یہ سوچ رہا تھا وہ جس گھر میں مہمان تھا وہاں سے دبے قدموں سے باہر نکل آیا۔ اسے خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں آدھی رات گزرنے کے بعد اس کی فورس کے جوان سو نہ جائیں۔ گاؤں میں چکر لگا کر گاؤں کے باہر اس نے اپنی فورس کو چیک کیا اس کا ایک ایک آدمی اپنی جگہ جاگ رہا تھا۔

"تو کیا نصیب سو رہا ہے؟" اس نے سوچا۔

اسی اضطراب میں مزید تین گھنٹے گزر گئے۔ سحر نمودار ہوتے ہی مرغے کی اذان اس کے کانوں نے سنی۔ سنہا کا دل بیٹھنے لگا۔ چاند بھی اب دھندلا رہا تھا۔ سب سے پہلے اسے کانے کا خیال آیا کہ اس نے انہیں بے وقوف بنایا تھا۔ مگر ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ خود

اس کی سی آئی ڈی نے اطلاع پر تصدیق کی مہر ثبت کی تھی۔ لیکن اطلاع صحیح تھی تو جگا کے گھر کا کوئی فرد شادی میں حاضر کیوں نہیں ہوا؟

اچانک سحر کی چادر میں سے ایک گھڑ سوار نمودار ہوا۔ وہ پولیس فورس کا آدمی تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے اطلاع دی۔

''آدھی رات کے وقت مڈ بلوچ گاؤں پر جگا نے چھاپہ مارا اور بہت ساری دولت سمیٹ کر لے گیا۔''

سنہا نے دانت پیس کر کہا۔ وہ ایک سو پچیس ہوشیار پولیس والوں کے ساتھ یہاں ساری رات جگا کے انتظار میں جھک مارتا رہا تھا۔ جبکہ وہاں سے صرف پچیس میل کے فاصلے پر جگا کامیاب ڈاکا ڈال کر لوٹ چکا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے دل کے زخم پر نمک پاشی کی گئی ہو۔ سخت سردی کے باوجود اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تیرنے لگیں۔

⊛.......☆.......⊛
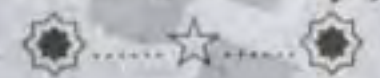
پولیس ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والے جگا کے مخبر کی جانب سے تین دن پیشتر ہی اطلاع مل چکی تھی کہ بیاہ کہاں اور کس وقت ہونے والا ہے۔ اس کے متعلق پولیس کو انفارمیشن مل چکی ہے۔ اس رات جگا کو تمام پارٹی سمیت گھیر کر ختم کرنے کا پلان بنایا گیا جس کے متعلق تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔

جگا بر وقت ہوشیار ہو گیا۔ فوراً ہی ایک آدمی کو روانہ کیا گیا۔ شادی کی تاریخ کچھ اور آگے بڑھا دی گئی۔ یہ سن کر جگت کی ماں مایوس ہو گئی۔ جگت نے ماموں ہزارہ سنگھ کو خاص تاکید کرائی تھی کہ ہمارے متعلق کسی شخص نے پولیس کو اطلاع کی تھی۔ اس کا کھوج لگائیں۔ جس پر آپ کو شک گزرے اس کے پتے ٹھکانے سے مجھے آگاہ کر دیں۔ میں اسے فنا کر کے بیاہ کے منڈپ میں بیٹھوں گا۔ چندن کور کے ہاں بھی اس کے متعلق آگاہ کر دینا۔ ماں سے کہنا تیرے بیٹے کو شادی سے روکنے والا ابھی اس دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ یقین رکھو ایک ماہ کے اندر تمہاری بہو تمہارے گھر کے آنگن میں پہنچ جائے گی۔

جگت کا خون جوش غضب سے گرم ہو گیا تھا۔ سنہا کی عیاری کا جواب اسی رات دینے کا اس نے ارادہ کر لیا۔ اگلے دن ہی اس نے پلان تیار کر لیا کہ جس رات سنہا کی پولیس پارٹی اسے پھنسانے کے لیے گوبند پور گاؤں میں جال بچھائے بیٹھی ہو اسی رات دوسری قریب کی جگہ ڈاکا ڈالا جائے گا۔ اس طرح سنہا کو ڈبل شکست دی جائے۔

اس نے بچن کو ایک جانب بلا کر کہا۔

''کل اس کارخانے کے مالک کے گھر ڈاکا ڈالا جائے گا جس نے اچلا کے شوہر شاردول کے ہاتھ کٹ جانے کے باعث اسے معاوضہ دینے کی بجائے دھکے دے کر ملازمت سے الگ کر دیا تھا۔ اس کا انتقام لینا ہمارا فرض ہے۔ نیند میں بھی شاردول کے اپاہج ہاتھ میرا سکون برباد کرتے ہیں بچن! اس کارخانے کے مالک کا پورا پتا تمہیں لانا ہو گا۔''

''کہاں سے لاؤں؟'' بچن نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اچلا کے گھر سے۔''

یہ سن کر بچن سنگھ سناٹے میں رہ گیا۔ جگت نے اسے سمجھایا۔

''اس کے گھر ہم دونوں جا چکے ہیں تمہارے اور میرے سوا کسی اور کو بھیجنا مناسب نہیں ہے۔ تم نے اس کے شوہر کو نہیں دیکھا اگر میں نے اسے دوسری بار دیکھ لیا تو مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکوں گا۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اس لیے جاؤ اور شام سے پہلے لوٹ آؤ۔''

جگت کے احکام کو ٹھکرانے کی بچن میں قوت نہیں تھی۔ اس نے سوچا اچلا کو کھو کر وہ کس اضطراب سے زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ جبکہ جگا اس مظلوم عورت کی مظلومیت اور مجبوری کی وجہ سے کڑھ رہا ہے۔

بچن روانگی کی تیاری کرنے لگا تو جگت نے مسکرا کر کہا۔

''دیکھو! ایک مرد کی طرح باہمت رہنا اچلا کو دیکھ کر کہیں محبت کے جوش کا اظہار نہ کر دینا۔ ورنہ اس کے شوہر کے دل کو صدمہ ہو گا۔ اس خوش اسلوبی سے کام کرنا یہ تمہارا امتحان ہے۔''

''یار اگر یہی بات تھی تو میں اسی رات تم سے جھگڑا کر کے بھی اچلا کو اغوا کر لاتا' مگر نہیں۔'' بقایا الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔ وہ جگت کے شانے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا کر بولا۔

''میں تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مردانگی کا مظاہرہ کروں گا۔'' بچن کا سینہ پھول رہا تھا جیسے اس نے ذہن میں مضبوط گرہ لگا لی ہو جگت نے اسے سینے سے لگا لیا۔

بچن جب اچلا کے گھر پہنچا تو اچلا کا شوہر اپنے ننھے بچے کو دو پیروں پر سلا کر اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے اسے کھلا رہا تھا۔ شاردول نے دیکھ کر پوچھا۔

''آیئے بھائی' آپ کون ہیں۔ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

بچن باری باری بچے اور اچلا کے شوہر کی جانب دیکھنے لگا۔ بچے کو فرش پر لٹا کر شاردول اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ بیٹھنے کے لیے اس نے چارپائی بچھا دی۔ اسی لمحے بچن خیالات کی یورش سے چونک گیا۔

''ارے..... آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔''

چارپائی پر بیٹھ کر بچن تیز نظروں سے گھر کا جائزہ لینے لگا۔ اچلا باورچی خانے سے ابھی باہر آئے گی اس خیال سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔

شاردول نے کہا۔

''گھر میں اس بچے کی ماں نہیں ہے کیا آپ کو ان سے کچھ کام ہے؟''

بچن نے فوراً اپنے آپ پر قابو پا کر کہا۔

''نہیں مجھے آپ سے کام ہے آپ کے ہاتھ کس کارخانے میں کٹ گئے تھے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔''

شاردول نے دیکھا اجنبی بات اس سے کر رہا تھا مگر اس کی نظریں بچے پر جمی ہوئی تھیں۔

''آپ یہ معلوم کر کے کیا کرنا چاہتے ہیں جوان؟''

''آپ کے ہاں کچھ روز پیشتر جو مہمان آئے تھے انہوں نے معلوم کرایا ہے۔'' بچن نے پہلی بار شاردول کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اوہ۔'' شاردول اب چوکنی نظروں سے اسے دیکھ کر سوچنے لگا۔

شاید جگا ڈاکو جو اس کے گھر آیا تھا اس کی اطلاع پولیس کو مل چکی ہے۔ اس لیے وہ یاد کرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

''ہمارے ہاں ایسا کوئی مہمان بہت دنوں سے نہیں آیا۔'' اس کا جھوٹ نہ پکڑا جائے اس خطرے کے پیش نظر فوراً بچے سے کھیلنے لگا۔

بچن سمجھ گیا کہ وہ بات کو اڑانا چاہتا ہے۔

''آپ مجھے پہچانتے نہیں ہیں لیکن نام سے ضرور پہچان لیں گے۔''

شاردول نے سر اٹھایا۔

''کیا بات ہے آپ کا؟''

''اس بچے کا نام کیا ہے؟'' بچن نے سوال کیا۔

''بچن سنگھ۔''

''بس یہ میرا نام ہے۔''

"اوہ..... تو آپ بچن سنگھ ہیں۔" شاردول کی آواز سنائی دی۔

بچن سوچ رہا تھا اس کا نام سن کر شاردول غصے میں دیوانہ ہوجائے گا مگر یہاں کچھ اور ہی ردعمل ہوا۔ شاردول کی آنکھوں میں دکھ کی پرچھائیاں رقص کرنے لگیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے جیسے وہ کہہ رہا ہو۔

"دوست انجانے میں نے تیری دنیا میں اجاڑ دی ہے۔"

شاردول نے دکھی آواز میں کہا۔

"ہم دونوں روزانہ آپ کو یاد کرتے ہیں کیونکہ اس بچے کا نام آپ ہی کے نام پر ہے۔" پھر وہ اسی طرح کھڑا ہوگیا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ "آپ اطمینان سے تشریف رکھیں وہ برابر والے محلے میں کام کرنے گئی ہے۔ میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔"

مگر بچن نے اسے روک دیا۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے کارخانے کے مالک کا پتا بتادیں کیونکہ اب میں جاؤں گا۔"

شاردول سمجھ گیا کہ بچن اچلا سے ملنا نہیں چاہتا۔

"میں آپ کو پتا دے رہا ہوں۔ مگر جگت سنگھ سے گزارش کرنا کہ میری تقدیر میں جو کچھ ہے بھگت رہا ہوں کارخانے کے مالک کو پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟" بچن کچھ نہیں بولا۔ شاردول کا دیا ہوا پتا ذہن نشین کرلیا اور اس کی جانب معصوم نظروں سے دیکھتے ہوئے بچے کے رخسار پر ہلکی سی چپت مارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ مگر جانے سے پہلے جب اس نے شاردول کی جانب دیکھا، شاردول بولا۔

"کیا اچلا سے کچھ کہنا ہے۔"

بچن کا سر جھک گیا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"اب کیا کہنا ہے۔ میرا جو کچھ لٹ چکا ہے اس کا غم ہلکا کرنے کے لیے میں دنیا سے انتقام لے رہا ہوں۔ اس سے کہنا اس کے خلاف میری کوئی فریاد نہیں۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل گیا۔

شاردول کافی دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔

☆

جگا نے اس رات کارخانے کے مالک کے گھر پر ڈاکہ ڈالا جس رات پولیس گوبند پور میں اس کی منتظر تھی۔ پانچ ہزار کی رقم چھیننے کے بعد اس نے کارخانے کے مالک کو دھمکی دی۔

"تم لوگ غریبوں کا خون چوس کر سرمایہ دار بنتے ہو اور ان مظلوموں کی آمد سے ہمارے جیسے ڈاکو وجود میں آتے ہیں۔ بتاؤ! جس شخص کے ہاتھ کٹ گئے اسے تم نے معاوضہ کیوں نہیں دیا؟"

"کک..... کسے جناب؟" کارخانے دار نے کپکپاتے ہوئے پوچھا اور جگا نے طیش میں آ کر ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر مارا۔

"یہ بھی بھول گئے؟ مشین چلتی رہے اور نفع تمہاری جیب میں جمع ہوتا رہے۔ مزدور جئیں یا مریں تمہیں اس سے کیا؟"

"مگر جناب اس کی غفلت کے سبب اس کے ہاتھ کٹ گئے اس میں میرا کیا قصور؟"

"سور وکیل کی طرح باتیں کر رہا ہے۔" جگا نے ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پچیس سال تک اس کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔"

"پچیس سال مگر وہ اپاہج تو مجھ سے اس وقت پچاس روپے مانگ رہا تھا۔" سیٹھ کا دل بیٹھ گیا۔

"اور تم نے اتنا معاوضہ دینے سے بھی انکار کردیا۔ پچیس سال بعد اس کا لڑکا جوان ہوگا۔ اس وقت تک

سال کے سو روپے کے حساب سے جس قدر معاوضہ ہو تمہیں اسے دینا ہے۔ نہیں تو.....!"

"مگر حضور! اس طرح تو کل ڈھائی ہزار بنتے ہیں۔" وہ آگے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر رائفل کی نال گردن کے قریب لے جا کر جگا نے کہا۔

"میں کچھ نہیں جانتا کل وہ رقم اپاہج کے گھر پہنچ جانی چاہیے۔ دوسری صورت میں میں تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ دوں گا۔" یہ دھمکی دے کر جگت اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے غائب ہوگیا۔

اس طرح اس نے سنہا کو ڈبل شکست دی لیکن اس کے باوجود سنہا کو یقین تھا کہ جگا شادی ملتوی ضرور کرچکا ہے لیکن رشتہ ختم نہیں کرے گا۔ لہٰذا جلد یا بدیر اسے جال میں پھنسنا پڑے گا۔

چھ دن بعد بیاہ کی دوسری تاریخ مقرر ہوئی۔ اس کی خبر بھی کانے نے سنہا کو پہنچادی۔ جگت نے اس بار دوسرا داؤ کھیلا تھا۔ انفارمیشن پہنچ رہی ہے یا نہیں؟ اس نے اپنے چار پرانے ساتھیوں کے علاوہ کسی کو سن گن نہیں دی تھی۔ چاروں پر بداعتمادی کی کوئی وجہ نہیں تھی اور گھر میں ماں، باپو، نانا اور ماما کے علاوہ کسی کو خبر نہیں تھی تو پھر چندن کور کے یہاں سے بات پھوٹ جاتی ہوگی؟

کرپال سنگھ نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"جگت! کہیں تمہارے سسر کی نیت خراب نہ ہوئی ہو کیونکہ پانچ ہزار کا انعام چھوٹی رقم نہیں ہے۔"

"کرپال۔" جگت گرجا۔ "کبھی تم اس خاندانی شخص کے نام کو ان باتوں کے درمیان نہیں لاؤ گے۔"

سنہا بھی سوچ رہا تھا کہ پولیس کے بیاہ کے وقت گھیرے کی اطلاع جگا تک کس طرح پہنچ گئی؟ دوسری بار اس سلسلے میں کافی رازداری سے کام لیا گیا۔ مگر جگت نے پولیس کو بے وقوف بنانے کے لیے دوسری تاریخ دی تھی۔ حقیقتاً اس نے گھر اطلاع پہنچائی تھی کہ تیاریاں اسی طرح کرنا مگر آخری وقت پر پروگرام ملتوی کردینا۔

اس طرح دوسری بار بھی کچھ نہ ہوا۔ تیسری بار رات کے وقت چندن کور کی خالہ کے گھر شادی کا پروگرام طے کیا گیا۔ رات دس بجے تک سنہا نے کسی قسم کی سرگرمی کا مظاہرہ نہ ہونے دیا۔ اس بار عقب سے اچانک چھاپہ مارنے کا پروگرام تھا مگر جگت کا پلان دوسرا تھا۔

دریا کے کنارے بیس گز کے فاصلے پر جنگل میں درختوں کے پیچھے شام ڈھلے تیں چالیس مسلح افراد کو چھپ جانا تھا۔ جگت کو آدھی رات کے قریب چار ساتھیوں کے ساتھ وہاں آنا تھا۔

"اس سے پیشتر اگر پولیس حملہ آور ہو تو ہنگامہ شروع کردیا جائے۔" یہ جگت کا حکم تھا۔

پولیس کا پلان دو طبقوں میں تھا۔ اس بار سنہا نے پچیس پولیس والوں کو پیدل اور کچھ کو تین چار کشتیوں میں روانہ کیا۔ کشتیاں جیسے ہی گاؤں کے قریب پہنچیں انہوں نے ٹارچ کی روشنی کنارے پر ڈال کر جانچ شروع کردی جگت کے ساتھی سمجھ گئے کہ پولیس آ گئی ہے۔

تقریباً گیارہ بجے پہلی گولی سنسناتی ہوئی کشتیوں کی جانب بڑھی۔ فوراً جواب میں چار فائر کیے گئے۔ اسی لمحے دونوں کناروں سے گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ گہرے اندھیرے کی چادر مسلط تھی۔ صرف آواز اور حرکت پر نشانے لے کر فائرنگ ہوسکتی تھی۔

دس پندرہ منٹ تک ہنگامہ ہوتا رہا۔ اندھیرے میں کسے کس قدر نقصان ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس گڑبڑ میں پولیس کی کشتیاں بری طرح ڈولنے لگیں۔ پولیس والے کشتیوں کی آڑ سے ہوا میں

فائرنگ کررہے تھے۔ جگت کے آدمی خبردار ہوگئے۔ یقیناً پولیس کا دستہ پیدل آرہا ہے اس لیے دریا والی پولیس سگنل کے طور پر ہوائی فائر کررہی تھی۔ گھیراؤ سے پہلے سب لوگ سرکنے لگے۔ دوسری جانب فائرنگ سے سنہا کا دستہ' جگت اور اس کے ساتھی چوکنے ہوگئے۔

دریا کے کنارے سے دور ایک غار میں جگت چھپ گیا۔ چاروں ساتھی اس نے مختلف سمتوں میں روانہ کیے۔ یہ بنجاروں کے اسی پڑاؤ کے قریب والا غار تھا جہاں سے جگت ڈاکو بننے کے پہلے دن گزارا تھا۔

گھوڑوں کی ٹاپیں قریب گونجنے لگیں۔ فوراً ہی بوڑھے بنجارے نے جگت سے کہا۔

''تم ہماری عورتوں کے درمیان چارپائی پر لحاف اوڑھ کر سو جاؤ باقی سب کچھ میں نمٹ لوں گا۔''

جگت پہلے ہچکچایا۔ دس بارہ چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر تمام عورتیں لیٹی ہوئی تھیں اور کوئی صورت نہیں تھی۔ جگت لحاف اوڑھ کر ان کے درمیان سو گیا۔ بوڑھا آگ کے پاس بیٹھ گیا اور جگت کی گھوڑی بنجاروں کے گھوڑوں کے درمیان کھڑی کردی گئی۔

سنہا اور اس کے ماتحت' کانے کے ساتھ وہاں پہنچے۔ بوڑھا متعجب نظروں سے انہیں دیکھتا ہوا اپنی جگہ کھڑا ہوگا۔

''اے بوڑھے یہاں کوئی ڈاکو آیا ہے؟''

''ڈاکو صاحب کچھ دیر پہلے تین چار گھڑ سوار یہاں سے گزرے ہیں۔ کیا وہ ڈاکو تھے؟'' یہ کہہ کر بنجارہ اس طرح کانپنے لگا جیسے وہ ڈاکوؤں کے ذکر سے خوفزدہ ہو۔ وہ پھر ہانپتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''بھگوان بلا کرے ہم بچ گئے۔ اس قافلے میں ویسے بھی آج کی رات کوئی مرد نہیں۔ میرے علاوہ سب ایک دوسرے گاؤں گئے ہوئے ہیں جہاں کل ہمارا پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ہے عورتیں اور بچے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ اگر ان پر ان ڈاکوؤں کی نظر پڑ جاتی تو کیا ہوتا؟''

سنہا نے بنجارے کی باتیں سنتے ہوئے تیز نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا پھر وہ مضبوط قدموں سے چارپائیوں کی جانب بڑھا۔ بنجارے کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ گھبرا گیا۔ قدموں کی آواز سن کر لحاف اوڑھے ہوئے جگا نے ضرورت پڑنے پر مقابلہ کرنے کی خاطر اپنی رائفل سنبھال لی۔

سنہا ایک چارپائی کے قریب رکا' لحاف اٹھا کر دیکھا پھر برابر والی چارپائی پر سونے والے کا لحاف اٹھا کر چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

اب اس کا ہاتھ تیسرے لحاف کی طرف بڑھ رہا تھا۔ یہی وہ لحاف تھا جس میں جگا چھپا ہوا تھا۔ لیکن عین اس وقت دور سے رائفل کا دھماکا سنائی دیا۔ انسپکٹر سنہا کا بڑھتا ہوا ہاتھ رک گیا وہ پھرتی سے گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسی سمت روانہ ہوگیا جدھر سے آواز سنائی دی تھی۔ بنجارے نے سکون کا سانس لیا۔ کانا مناسنگھ وہیں رک گیا۔ اس کی نیت بنجارے سے شراب مانگ کر پینے کی تھی۔ نشے میں دھت کانا بکواس کرنے لگا۔

''یار! یہ جگا ہر بار چکمہ دے کر نکل جاتا ہے۔ ورنہ پانچ ہزار روپے اپنی جیب میں ہوتے۔ گھر میں ایک خوب صورت بیوی ہوتی اور اپنی عیش میں کٹتی۔''

جگت نے یہ بات سنی تو اس کا خون کھول اٹھا۔ یہی شخص انعام کی لالچ میں اطلاعات فراہم کرتا رہا ہے۔ اس کی آواز جانی پہچانی سنائی دی۔ ذہن پر زور دے کر اس نے یاد کیا اور اسے سازش کی کڑی مل گئی۔ یہ وہی شخص ہے جسے اس نے چندن کور کے مکان کے قریب پکڑ کر بعد میں چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت بھی

ہنومان کو اس پر پورا شک تھا۔

''آج میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔'' جگت نے ارادہ کیا۔

وہ سر پر لحاف اوڑھ کر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر بنجارے نے کانے کو وہیں بٹھایا اور چارپائی کے قریب آیا۔ جگت نے اس کے کان میں کہا۔

میں دوسری طرف جارہا ہوں اگر وہ غدار میرے تعاقب میں آئے تو روکنا نہیں۔''

کانے نے دیکھا کوئی چارپائی سے اٹھ کر اندھیرے میں جارہا ہے۔ بنجارے نے فوراً کہا۔

''لڑکی کو حاجت ہوئی ہے سردی تیز ہے لہٰذا بے چاری لحاف اوڑھ کر جارہی ہے۔'' کانا لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوگیا

''اچھا...... پھر بھی جارہا ہوں۔''

بنجارے نے اسے روکا نہیں کانا جگت کے پیچھے فاصلے سے چل رہا تھا۔ اس کے دل میں برائی جنم لے چکی تھی۔ شراب کا نشہ اور عورت کی بھوک دونوں نے اس کا ذہن خراب کردیا تھا۔

کچھ دور جا کر جگت رک گیا۔ اس نے لحاف ہٹایا تھا وہ عقب سے آنے والے شخص کی آہٹ سننے لگا۔ نزدیک آ کر کانے نے چال چلی۔

''بوڑھے کو احمق بنا کر تم تنہائی میں آگئیں یہ اچھا ہوا۔ بہت سمجھدار ہو میرے پاس آج کچھ نہیں مگر میں جگا کو گرفتار کرا کر سرمایہ دار بن جاؤں گا تو......!'' اتنا کہہ کر کانے نے اس کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھا۔ فوراً ہی لحاف ہٹا کر جگت نے اس کے سامنے ہوگیا۔ اس کے ہاتھ میں چھری چمک رہی تھی اور آنکھیں شعلے برسا رہی تھی۔ کانے کی لالچی نظروں میں خوف چھا گیا۔ اس کے چیخنے سے پہلے ہی جگت نے چھری اس کے سینے میں گھونپ دی۔

''تجھے انعام چاہیے تھا یہ لے۔'' اتنا کہہ کر اس نے دوسرا وار کیا کانا زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

بنجارے نے دور سے یہ سب منظر دیکھا اور جگت کی گھوڑی مانک اسی طرف روانہ کردی۔ صبح کے آثار نمودار ہونے سے پہلے ہی جگت وہاں سے جاچکا تھا۔

❁......☆......❁

چاروں ساتھی جگت کا بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ گروہ کے تمام لوگ صحیح سلامت اپنے اڈے پر پہنچ چکے تھے۔ ہنگامے کے دوران دو افراد زخمی ہوئے۔ ہنومان کی قسمت اچھی تھی جو بچ گیا ورنہ اس کے صرف ایک انچ اوپر سے گزرنے والی سنسناتی گولی ہنومان کو دوسری دنیا میں پہنچا دیتی۔

ہنومان کو انسپکٹر سنہا پر خار تھی۔ اس کے دوست اور سردار کی شادی میں رکاوٹ پیدا کرنے والے اور چھ ماہ میں ختم کرنے کا عہد کرنے والے پولیس افسر کی بہادری کا وہ معترف بھی تھا۔ سنہا کی زندگی جگت کے لیے خطرہ تھی۔ وہ انسپکٹر سنہا کو پہچانتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ہنگامے کے دوران اس کا سنہا سے سامنا ہو جائے مگر اسے موقع ہی نہ ملا۔

''کیا جگت گرفتار ہوگیا؟'' ہنومان نے مضطربانہ انداز میں پوچھا۔

''بنجارے کے پڑاؤ کی جانب سے دھماکے سنائی دیے تھے کیا انہوں نے اسے زندہ؟'' کرپال نے مشکوک انداز میں کہا مگر ہنومان نے برا سامنہ بنا لیا۔

''کیا بکتے ہو؟ جگت زندہ پکڑے جانے سے سینے میں گولی مار کر اپنے آپ کو ختم کرنا بہتر سمجھے گا۔''

اسی لمحے دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ سب چونک کر ادھر دیکھنے لگے۔

''یہ تو جگت کی گھوڑی مانک کی ٹاپوں کی آواز ہے۔'' ہنومان جگت کی گھوڑی کو دور سے آتے دیکھ کر

بولا۔

جگت نے ان کے قریب پہنچ کر گھوڑی کی پیٹھ پر سے جست لگائی اور گھوڑی کو تھپتھپانے لگا اور اس کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''شاباش مانک، تو نے تو کمال کر دیا۔''

''ملکھان اور کندن زخمی ہیں انہیں پٹیاں باندھ کر سلا دیا گیا ہے۔'' ہنومان نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تو آپ کی فکر ستا رہی تھی۔ اتنی دیر کس طرح ہوئی؟''

''اس ذلیل کو میں نے ختم کر دیا۔''

''کسے...... سنہا کو؟''

''نہیں، سنہا دشمن ہونے کے باوجود ذلیل نہیں۔ شادی کے متعلق اطلاعات فراہم کرنے والے لالچی کانے کو میں نے ختم کر دیا۔''

سب لوگ منہ پھیلائے اس کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ جگت مسکرا دیا پھر اس نے ہنومان کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

''ہنومان! یاد ہے ہم چندن کور کے مکان پر گئے تھے اور ہم نے ایک بدشکل شخص کو شک کی بنا پر پکڑا تھا۔ وہی شخص، تمہارا شک کرنا صحیح تھا۔ وہ ہماری سرگرمیوں پر نظر رکھتا تھا۔ بدمعاش کو انعام کی رقم حاصل کر کے شادی کرنا تھی۔ اسے بیوی خریدنے کے ارمان تھے۔ میں نے ایک مظلوم لڑکی کو ایسے بدشکل کی بیوی بننے سے بچا لیا۔'' جگت نے ہنستے ہوئے کہا۔

ہنومان سر کھجانے لگا۔

''نہیں یار! اس کی منحوس شکل دیکھ کر مجھے متلی ہونے لگی تھی۔''

پھر جگت نے انہیں تفصیل سے واقعہ بتا دیا۔

''مجھے اس بنجارے کی دوستی پر فخر ہے جس نے مجھے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے قبیلے کی عورتوں کے درمیان سلا دیا تاکہ میری جان بچ جائے۔'' پھر اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''جب تک ہماری نیت ٹھیک ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔''

چار دن بعد پھر جگت گھوڑی پر سوار ہو کر شادی کی غرض سے روانہ ہوا۔ اس بار اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ شادی کر کے واپس لوٹے گا یا جنگ لڑتے ہوئے اپنی زندگی ختم کر لے گا۔ یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔ اس کے ساتھی بھی یہی فیصلہ کر چکے تھے۔ بار بار شادی ملتوی کرنا ان کی بے عزتی تھی۔

''اس بار ہمیں چاہے موت سے جنگ کرنی پڑے ہم جگت کو بیاہ کر ہی لائیں گے۔'' یہ تمام ساتھیوں کا عہد تھا۔ بہادروں کا فیصلہ تھا۔

تمام انتظام پہلے ہی مکمل کر دیا تھا۔ اس بار جگت کے ایک چچا کے گاؤں میں شادی کا انتظام کیا گیا۔ چندن کور کو شادی کے منڈپ تک میک اپ میں لے آنے کی ذمہ داری اس کے ساتھیوں کے ذمہ تھی۔ جگت کی ماں کو پولیس کی نظروں سے بچا کر وہاں پہنچانے کی ذمہ داری جگت کے ماموں ہزارہ سنگھ کی تھی۔

جگت نے اپنی پارٹی کے دو حصے کر دیے۔ ہنومان اور بچن اپنے بیس ساتھیوں کے ساتھ شادی کی تمام رسومات کے ذمہ دار تھے جبکہ دوسرے گروپ کے پندرہ آدمیوں کو شادی کے وقت دوسرے گاؤں میں ڈاکہ ڈالنا تھا تاکہ پولیس کی توجہ شادی کی جانب سے ہٹائی جا سکے۔ رات کو تین بجے دوسرے گروپ کو ڈاکہ ڈالنا تھا شادی کا وقت صبح کے قریب رکھا گیا تھا۔

سنہا کو کانے کے قتل کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے اپنی خفیہ فورس کو خبردار کیا چندن کور اپنے ماموں کے گھر سے کہاں جاتی ہے اس کی نگرانی کے لیے دو آدمی مقرر کر دیے گئے انہیں ڈاج دے کر جگت کے ساتھی چندن کور کو نکال لائے۔ کنیا دان کے لیے چندن کور کے پتا آدھی رات کو گھر سے روانہ ہوں گے۔ یہ پروگرام طے کیا گیا تھا۔ ان کو لے جانے کے لیے گاؤں کے باہر ایک گھڑ سوار موجود تھا۔ شادی کی رسومات کے لیے دھرم گرو کا انتظام جگت کے چچا نے کیا۔ جگت اپنی زندگی کا سب سے خطرناک کھیل کھیل رہا تھا۔

آدھی رات کے بعد ہی مخبر نے سنہا کو گہری نیند سے بے دار کیا۔

''سر چندن کور کا باپ اپنے گھر سے غائب ہو چکا ہے۔ مکان میں روشنی ہو رہی ہے مگر دروازے پیٹنے پر بھی اندر سے جواب نہیں ملا۔ برآمدے کی دیوار پھاند کر اندر جانے پر پتا چلا کہ باپ بیٹی دونوں غائب ہیں۔''

''تمہیں کیا جھک مارنے کے لیے وہاں ڈیوٹی سپرد کی گئی تھی؟'' سنہا نے گرجدار آواز میں چیخ کر کہا۔ اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ مخبر کے رخسار پر چانٹے مار مار کر سرخ کر دے۔ اس نے جلدی سے اپنی وردی پہنی اور بیلٹ میں پستول پھنسا کر فوراً ہی باہر آ گیا۔ آج اسے اپنی عزت خطرے میں محسوس ہو رہی تھی۔

انہیں کہاں تلاش کیا جائے۔ اس خیال سے اس کا ذہن چکرا گیا۔ فوراً اس نے دو آدمی رتیا کی جانب دوڑائے۔

''جاؤ دیکھو جگت کے گھر میں اس کے ماں باپ ہیں یا نہیں۔'' اس نے دانت پیستے ہوئے مٹھیاں کستے ہوئے کہا۔

''اگر جگت کی شادی کا معاملہ ہے تو وہ نہیں ہوں گے کسی نہ کسی طرح مکان میں داخل ہو کر انہیں چیک کرو سمجھے، گھنٹے میں مجھے جواب چاہیے۔''

''بہتر جناب۔'' انہوں نے ایڑیاں بجا کر کہا۔

''اگر وہ وہاں نہ ملیں تو پھر؟''

''پھر بھی تم لوگ اپنی منحوس شکل مجھے ضرور دکھاؤ گے۔'' سنہا نے غصے میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ وہ ایک گھنٹہ سنہا نے اضطرابی کیفیت میں گزار دیا۔ علاقے کے ڈھائی سو گاؤں میں سے کس گاؤں میں جگا کی شادی ہو رہی ہے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔

''پولیس ڈپارٹمنٹ سوتا رہتا ہے۔ اس سے تو بہتر گلی کے خارش زدہ کتے ہیں جو رات بھر ایک اچھے چوکیدار کی طرح اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔'' سنہا سوچ رہا تھا۔

برق رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا ایک شخص سنہا کے قریب آ کر رکا۔

''گھر میں جگت کے پتا ہیں ماں نہیں ہے۔ ہمارے دریافت کرنے پر پہلے تو وہ ادھر ادھر کی ہانکنے لگا پھر انہوں نے بتایا کہ وہ میکے گئی ہوئی ہیں۔''

سنہا کے ذہن میں برقی رو دوڑ گئی۔ شاید وہیں شادی کا پروگرام ہو۔

''جگت کا ماموں دکھائی دیا؟''

''نہیں، وہ بھی ان کے ساتھ ہی گیا ہے۔''

''تب تو وہ آج ہی بیاہ کر لے گا۔ اس کی وجہ تم لوگوں کی غفلت کے علاوہ کچھ نہیں۔'' تقریباً بیس مسلح سپاہیوں کے ساتھ وہ دھرم پور کی جانب تیزی سے روانہ ہو گیا۔

جگت کے نانا جاگ رہے تھے۔ وہ گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر چونک گئے۔

''شاید جگت اپنی بیوی کے ساتھ آشیرباد لینے آ رہا ہوگا۔ مگر شادی تو صبح ہو رہی تھی جبکہ ابھی آدھی رات

باقی تھی۔ تو کیا شادی کیے بغیر جگت لوٹ آیا ہوگا؟'' وہ مسلسل سوچ رہے تھے۔

''مکان میں کوئی ہے؟'' کسی نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے کہا۔

''اتنی بلند آواز میں پکارنے والے جگت کے ساتھی نہیں ہوسکتے۔ یہ یقینی بات تھی۔ دوسری بار پکارے جانے پر وہ کھڑے ہوگئے اور چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھول دیا۔ ایک شخص گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ نمایاں تھی۔

''کیوں بھائی' اس وقت کیا بات ہے؟'' نانا نے پوچھا۔

''سنہا کا سکھایا ہوا شخص بولا۔ ''میرے بزرگ میں رتیا سے آیا ہوں اہم اطلاع پہنچانی ہے سوہن سنگھ کے سینے میں اچانک درد ہوگیا ہے لہٰذا وہ جگت کی ماں کو یاد کررہے ہیں۔ میں انہیں لینے آیا ہوں۔''

پہلے تو نانا پر گھبراہٹ طاری ہوگئی مگر وہ جلد باز نہیں تھے لہٰذا زیادہ یقین کرنے کی غرض سے انہوں نے پوچھا۔

''آپ اکیلے آئے ہیں کیا؟''

وہ شخص لمحہ بھر کے لیے بوکھلا گیا۔ مگر پھر سنبھل کر چاروں سمت گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''جی ہاں' ہزارہ سنگھ جگت کے والد کی خدمت کر رہے ہیں۔''

جہاندیدہ نانا سمجھ گئے کہ یہ شخص بے وقوف بنا رہا ہے۔ انہوں نے ایک سے زیادہ گھوڑوں کی ٹاپیں سنیں تھیں۔ یقیناً اس چکر میں کوئی راز ہے۔ لہٰذا انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

''جگت کی ماں یہاں نہیں ہیں۔''

''نہیں ہیں۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے اسے سخت دھچکا محسوس ہوا ہو۔

''پھر وہ کہاں ہیں آپ مجھے بتائیں تاکہ میں وہاں جاکر انہیں اطلاع کردوں۔''

نانا ادھ کھلی آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ اس کا جھوٹ پکڑا جاچکا تھا وہ سمجھ گئے تھے کہ آنے والا شخص کس کے اشارے پر جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے تو صرف اس قدر معلوم کرنا ہے کہ جگت کی ماں کہاں ہے لہٰذا پولیس کو الٹے راستے پر لگانے کا یہ سنہری موقع تھا۔ لہٰذا وہ نرمی سے بولے۔

''جگت کی ماں تو اس وقت رتیا پہنچ چکی ہوں گی کیا تمہیں راستے میں کوئی ریہڑہ نظر نہیں آیا؟''

''نہیں۔'' اجنبی نے کہا اور اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ نانا نے یہ بات محسوس کی وہ جارہا ہے لہٰذا نانا اسے روک کر بولے۔

''سوہن سنگھ سے کہنا صبح اس کی خیریت پوچھنے آؤں گا۔''

سنہا کو یہاں بھی ناکامی ہوئی فراڈ کا جواب جگت کے نانا نے دے دیا تھا۔ یہ بات سنہا سمجھ گیا۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی منزلیں طے کررہی تھیں۔ سنہا کی حالت کسی بھٹکے ہوئے راہی کی طرح تھی جو اندھیرے میں راستے کی تلاش میں ہو وہ دوبارہ پولیس اسٹیشن آگیا وہاں ایک شخص اس کا منتظر تھا۔ اس نے سنہا سے کہا۔

''جلدی کیجیے جناب ہمارے گاؤں پر ڈاکوؤں نے حملہ کردیا ہے۔ شاید وہ جگت کی پارٹی ہے۔''

سنہا کے چہرے پر روشنی پھیل گئی۔

''تم کون ہو؟ تمہیں اطلاع دینے کے لیے کس نے بھیجا ہے؟''

''گاؤں کے مکھیا نے ڈاکو تقریباً تین بجے گاؤں میں داخل ہوئے ہیں۔''

سنہا نے پاکٹ واچ پر نظر ڈالی ساڑھے چار بج چکے تھے پانچ میل کا فاصلہ تھا سوچنے کا وقت اس کے پاس نہیں تھا۔ پچیس تیس مسلح پولیس والوں کو لے کر سنہا متاثرہ گاؤں کی طرف روانہ ہوا جگت کو گھیرے میں لینے کی امنگ میں وہ اپنے گھوڑوں کو برق رفتاری سے دوڑا رہے تھے۔

پولیس کو دیکھ کر مجمع لگا کر کھڑے ہوئے لوگ منتشر ہوگئے۔ ایک منہ پھٹ شخص کی آواز سنہا کو سنائی دی جو کہہ رہا تھا۔

''ہمیشہ ڈاکوؤں کے فرار ہونے کے بعد پولیس آتی ہے۔ لٹ جانے والوں کو تسلی دے کر آپ بھی لوٹ جائیں گے۔''

پوچھ گچھ پر پتا چلا کہ جگا کے گروہ نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ یہاں شادی وغیرہ کا چکر نہیں تھا۔

''پارٹی میں جگا خود بھی موجود تھا یا نہیں؟'' اس نے جلدی سے دریافت کیا۔

''اسے کوئی جانتا ہو تو یہ پتا چلے جناب پھر چہرے پر ڈھاٹے باندھے ہوئے ڈاکوؤں کی پہچان کس طرح ہوسکتی ہے؟''

''پھر تم نے مجھے لیٹ اطلاع کیوں بھیجی؟'' انسپکٹر نے غصیلے میں کہا۔

''اطلاع؟'' مکھیا نے متعجب لہجے میں پوچھا۔

''ڈاکو گاؤں کا محاصرہ کیے بیٹھے تھے وہاں اطلاع کون لے جاتا جناب؟ گاؤں سے باہر جانے کا ارادہ کرنے والوں کو انہوں نے گولی مارنے کی دھمکی دی تھی۔''

''مگر مخبر نے مجھے بتایا تھا کہ مکھیا نے اسے اطلاع پہنچانے کے لیے میرے پاس بھیجا ہے۔'' مکھیا کو اس معاملے میں کوئی اور ہی چکر نظر آیا۔ آنکھیں پھیلا کر سنہا کو دیکھ رہا تھا۔ پھر گردن انکار میں ہلا کر بولا۔

''ہم میں سے کسی نے اطلاع نہیں بھیجی جناب' آپ آگئے ہمیں اس پر تعجب ہے۔''

سنہا خاموش ہوگیا۔ ضرور اس میں کوئی چال ہے تو کیا وہ جگت کا آدمی تھا جسے اطلاع کرنے کی غرض سے بھیجا گیا مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟

کچھ سپاہی مفرور ڈاکوؤں کی تلاش میں روانہ کیے گئے کچھ کو وہاں بغرض تفتیش روک دیا تاکہ وہ لوگ رپورٹ تیار کرسکیں اور خود سنہا دو پولیس افسران کے ساتھ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ پولیس کو چکر دینے کے لیے جگا نے یہ سارا کھیل کھیلا ہے۔ گھر پہنچ کر ابھی وہ ستایا بھی نہ تھا کہ ایک شخص لنگڑاتا اور ہانپتا کانپتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

''صاحب۔'' کہتے ہوئے وہ بری طرح لڑکھڑایا مگر سنہا نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں تھام لیا۔ سنہا نے دیکھا اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں اور تیزی سے چلنے والا سانس اس کے خون کی تیز گردش کی گواہی دے رہا تھا۔

سنہا نے اسے فرش پر آہستگی سے لٹادیا۔

''تم بہت زیادہ زخمی ہو۔ اسپتال کے بجائے میرے پاس کیوں آئے۔''

''صص...... صاحب......!'' وہ کہنا چاہتا تھا مگر اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ سنہا نے پانی کا گلاس منگوا کر اس کے ہونٹوں سے لگایا اور زخمی شخص جلدی جلدی پانی پینے لگا جیسے پیاس سے اس کا حلق خشک ہو رہا ہو وہ بڑی مشکل سے دھیمے لہجے میں بولا۔

''ہمارے گاؤں میں جگا کی شادی ہورہی ہے صاحب میں اطلاع دینے کی غرض سے چھپ کر

گاؤں سے باہر آرہا تھا مگر ڈاکوؤں کو پتا چل گیا اور ایک ڈاکو کی گولی نے میری ران چیر دی۔ بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچا ہوں۔ غریب آدمی ہوں حضور لہٰذا انعام مجھے دلایئے گا۔"

اس شخص کے آخری الفاظ کے ساتھ اس پر ہچکیوں کا دورہ پڑ گیا اور ایک لمبی ہچکی کے ساتھ اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی۔

سنہا اس مفلس شخص کے بے جان چہرے کو دیکھنے لگا۔ مگر اچانک وہ چونک گیا۔ اسے خیال گزرا کہ ایک غلطی رہ گئی۔ مرنے والا شخص اپنے گاؤں کا نام نہیں بتا سکا تھا۔ پھر اب کیا کرنا چاہیے؟

سنہا کے ہونٹوں پر تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ایک لفظ کی وجہ سے پوری اطلاع بے کار ہوگئی۔ بالکل اسی طرح جیسے پیاسے کے قریب پانی کا بھرا ہوا گلاس لا کر فرش پر انڈیل دیا جائے۔ سنہا غور سے مقتول کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹ کھلے ہوئے تھے۔ مگر زبان ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ اب وہ سنہا کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ اسے صرف ایک لفظ کی ضرورت تھی اور وہ لفظ گاؤں سے مقتول کے جسم تک خون کی لکیر پر جم گئیں اور اس کے ذہن میں برقی رو دوڑ گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

وہ تیزی سے پلٹا اور خون کی لکیر دیکھتا ہوا اپنے مکان سے باہر سڑک پر آ گیا۔ اس وقت کچھ سوچنا فضول ہی تھا۔ آٹھ دس سپاہیوں کے ساتھ وہ خون کی لکیر کے سہارے آگے بڑھنے لگا۔

❁......☆......❁
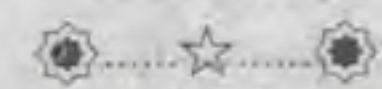
آسمان سے سورج کی پہلی کرن نے زمین پر آ کر صبح کا اعلان کیا۔ اسی لمحے جگت اور چندن مقدس گرو گرنتھ کے سامنے بیٹھ کر دھرم گرو کی آواز میں اپنی آواز ملا کر مقدس کتاب کے الفاظ دہرانے لگے پھر پھیرے شروع ہوئے۔ جہاں تک مقدس الفاظ کی ایک سطر پوری ہوتی دلہا دلہن گرنتھ صاحب کا پورا چکر لگاتے ہوئے بیٹھ جاتے جگت کے سر پر سہرا بندھا ہوا تھا اور چندن کور کا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ آنگن میں بندھے ہوئے شامیانے کے نیچے شادی کی رسومات ادا ہو رہی تھیں۔ جگت کی ماں، چندن کے پتا، ہزارہ سنگھ اور دوسرے کچھ قریب کے رشتے دار موجود تھے۔

دھرم گرو جب مقدس کتاب کے چار پھیرے کے الفاظ پڑھ لیں تو شادی کی رسم پوری ہوتی ہے۔ دلہا، دلہن کو پھیرے لگاتے دیکھ کر مسرت سے لبریز مسکراہٹ کے ساتھ جگت کی ماں بھگوان کا شکر ادا کر رہی تھی۔

"بھگوان! میرے خاندان کی لاج رکھنا۔"

چوتھا پھیرا ختم ہوتے ہی دور سے بندوق کا دھماکہ سنائی دیا۔ سب چونک کر ہوشیار ہو گئے۔ جگت کی ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جگت کی شادی کی خوشی میں پولیس موت کا پیغام بن کر آئی ہے۔ ہر لمحہ موت سے قریب ہونے والا دکھائی دیتا تھا۔ سب سناٹے میں تھے۔

"آپ رسم جاری رکھیں ہم پھیرے کرتے رہیں گے۔ اب شادی نہیں رکے گی۔" جگت کی مضبوط اور ٹھہری ہوئی آواز گونجی۔

دنادن رائفل کے دھماکے سنائی دینے لگے۔ چندن کور نظریں جھکائے ہوئے جگت کے ساتھ پھیرے کر رہی تھی۔ اس کے قدم مضبوطی سے حرکت کر رہے تھے۔ نئی زندگی کے راستے پر چلتے ہوئے اس کے قدم نہیں ڈگمگانے چاہیے یہ سوچنے والی لڑکی کے چہرے پر شجاعت کی روشنی جگمگا رہی تھی۔

جیسے ہی شادی کی رسومات ختم ہوئیں جگت نے دھرم گرو کے چرن چھو کر اپنے چہرے سے سہرا ہٹایا۔

چندن کور کو پیار بھری نظروں سے دیکھا دونوں ماں کے پیر چھونے لگے۔ بہادر ماں نے آنسو بھری آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے انہیں دعا دی۔

"تمہاری جوڑی سلامت رہے۔"

رائفلوں کے دھماکے اب قریب سنائی دے رہے تھے۔ شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ ماں نے بہو اور بیٹے کو مکان کے دروازے کے درمیان کھڑا کر کے جلدی جلدی چند رسومات ادا کیں۔ دوسرے ہی لمحے جگت اپنی پیاری گھوڑی پر سوار ہو کر فرار ہو گیا۔ ماں اور نئی دلہن دور جاتے ہوئے جگت کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ اسی لمحے سنہا دو سپاہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ ماں اور چندن جس سمت دیکھ رہی تھیں اس سمت سے اٹھتے ہوئے غبار کی جانب پستول کا رخ کر کے سنہا فائر کرنے لگا مگر پستول کے فائر بے کار ثابت ہوئے اس نے سپاہیوں سے گرج کر کہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو گولی چلاؤ۔"

پستول سے زیادہ رائفل لمبا فائر کر سکتی تھی مگر جگت کی گھوڑی سمجھدار تھی۔ نشانہ خالی دینے کے لیے جگت نے لگام سے اسے اشارہ دیا اور مالک پوری رفتار سے دوڑنے لگی۔ مضطرب سنہا نے ایک پولیس مین سے رائفل چھین کر دو تین فائر داغ دیے مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی اور گھوڑی اپنے سوار کے ساتھ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ہاتھ لگی ہوئی بازی لمحے بھر میں ہار جانے کی وجہ سے سنہا کو سخت دھچکا محسوس ہوا۔ چند لمحے وہ تھکن ذہنی دھچکے کی وجہ سے خاموش رہا۔ اس کا ذہن چکرانے لگا۔ جگت کی ماں دوڑ کر اندر گئی اور پانی کا گلاس لے کر سنہا کے قریب آ گئی۔ اپنے لاڈلے دلہا بیٹے پر فائرنگ کرنے والے پولیس افسر کو پانی کا بھرا ہوا گلاس دینے والی ماں کو سنہا متعجب نظروں سے دیکھنے لگا۔ پانی پی کر وہ کچھ کہے اس سے پیشتر جگت کی ماں نے اپنی بہو کو حکم دیا۔

"بہو بیٹی! سنہا صاحب کے چرن چھوؤ۔"

ساس کا پہلا حکم چندن کا امتحان تھا۔ جو شخص اس کا سہاگ لوٹنے شادی کے منڈپ تک آ پہنچا تھا اس کے چرن چھونے کا حکم تھا۔ یہ حکم اس کے ذہن کو ہلانے لگا۔ مگر اسے اس پولیس افسر کی دعا لینی تھی۔ چندن ساس کے حکم پر آگے جھک گئی۔ اس نے سنہا کے سامنے سر جھکا لیا۔ جگت کی ماں کی اس حرکت نے سنہا کو امتحان میں ڈال دیا۔ ابھی ابھی بیاہی ہوئی لڑکی اسے پرنام کر رہی تھی۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا نہ دیتا یہ ظلم تھا۔ دائیں ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول کو اس نے بیلٹ میں بنے ہوئے کیس میں رکھ لیا۔ وہ چندن کور کو سر پر ہاتھ رکھ کر بھیگے ہوئے لہجے میں بولا۔

"چند لمحے پہلے میں تمہارے شوہر پر گولی چلا رہا تھا مگر اس وقت میں قانون کے نگہبان کا فرض انجام دے رہا تھا۔ مگر اب ایک بزرگ کی طرح میں اپنی بیٹی کو دعا دیتا ہوں تیرا سہاگ ہمیشہ سلامت رہے۔"

چندن نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ اس کے آنسو جسم کی روشنی میں دھرتی ماں پر موتی بکھیر رہے تھے۔

❁......☆......❁
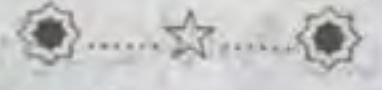
رم جھم کرتا ہوا سجا ہوا ریڑھا گاؤں میں داخل ہوا۔ ریڑھے میں بندھے ہوئے بیلوں کے گلے میں بجنے والی گھنٹیاں عجیب سے ساز کی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ گاؤں کے لوگ چونک کر سجے ہوئے ریڑھے کو دیکھنے لگے۔ مست سفید بیلوں کی جوڑی اپنے مڑے ہوئے سینگ اچھالتی ہوئی ریڑھے کو کھینچ کر گاؤں میں داخل ہو رہی تھی۔ بیلوں کے گلے کی گھنٹیوں کی آواز کی مندر میں سنائی دینے والی گھنٹیوں کی مقدس آواز سے

مشابہ تھیں۔ ستارے بھری ہوئی ریشمی رنگین چادر سے سجائے گئے ریڑھے میں سب سے آگے ریڑھا چلانے والے کے قریب ہزارہ سنگھ سینہ تانے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک فاتح مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ متجسس نظروں سے اس سجے ہوئے ریڑھے کو دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ہزارہ سنگھ اور اکڑ گیا۔ ریڑھے کے اندر سہاگ کے لباس میں لپٹی ہوئی چندن کور تھی۔ حیا سے سمٹ کر بیٹھی ہوئی شاید یہ پہلی لڑکی تھی جو بیاہ کر سسرال اکیلی جا رہی تھی۔ اس کا شوہر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر دکھ کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں عجیب طرح کا خمار تھا۔ وہ صرف ایک مرد سے نہیں بیاہی تھی اس کا بیاہ ایک گھر سے ہوا تھا جس گھر میں وہ آج پہلی بار داخل ہوئی۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی جگت کی ماں اپنی بہو کا حسین سرخ و سفید چہرہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں۔ جس کے قدموں سے بیٹے بغیر سونا گھر پھر آباد ہونے والا تھا آج تک دکھوں میں سلگنے والا دل چندن کور کی صورت دیکھ کر ٹھنڈک محسوس کر رہا تھا۔ جس وقت وہ بہو کو سجے ہوئے ریڑھے میں بٹھا کر روانہ ہوئیں اس وقت انہوں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ وہ اپنی بہو کو ایسا سکھ دیں گی کہ آج تک کسی ساس نے نہیں دیا ہوگا۔ اس لڑکی نے ان کے خاندان کی لاج رکھ لی ہے۔ وہ ہمت نہ کرتی تو کبھی جگت کی ماں کے گھر میں بہو کے قدم نہ آتے۔

ریڑھا مکان کے صدر دروازے کے قریب رک گیا۔ ہزارہ سنگھ جست لگا کر نیچے اتر گیا۔ اس نے لباس سے گرد جھاڑی دو ایک بار کھنکارا۔ دل میں اٹھتے ہوئے مسرت کے طوفان کو ظاہر کرنے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے مکانوں کی کھڑکیوں سے نظر آنے والے پڑوسیوں کو دکھانے کے لیے اس نے یہ حرکت کی تھی۔ جگت کی ماں نے ریڑھے سے اتر کر اپنی بہو سے کہا۔

"بیٹی، کچھ دیر بیٹھی رہو۔ میں گھر میں جا کر تمہارے قدموں کے استقبال کی تیاری کرتی ہوں۔"

ہزارہ سنگھ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسی لمحے کا انتظار کرنے والے سوہن سنگھ نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ پہلے انہوں نے مقابل کھڑے ہوئے ہزارہ سنگھ کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی مسرت کو دیکھا پھر ان کی نظر سجے ہوئے ریڑھے پر جم گئیں۔ باپ کا دل مسرت سے جھومنے لگا۔ جگت کے نانا بھی اس نیک وقت کے انتظار میں دو گھنٹے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ فخر سے تنا ہوا سینہ مزید چوڑا کرتے ہوئے مسرت سے لبریز آواز میں انہوں نے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ جگت اس بار بغیر شادی کیے نہیں لوٹے گا۔" پھر دروازے سے آتی ہوئی جگت کی ماں سے بولا۔

"بیٹی آج تیرے جگت نے کمال کر دیا۔"

جگت کی ماں تو مسرت سے دیوانی ہو رہی تھی۔ باپ سے انہیں یہ کہنا چاہیے تھا کہ یہ آپ جیسے بزرگ کی دعا کا اثر ہے لیکن وہ اپنے شوہر اور باپ کی جانب منہ کر کے بولیں۔

"آپ تو راستا روک کر کھڑے ہو گئے ارے میری بہو کو اندر تو آنے دیں۔ ابھی مجھے اس کے استقبال کی رسوم ادا کرنی ہیں گھر میں لچھمی آئی ہے کوئی معمولی بات ہے؟"

ان کی چال میں مسرت کا جوش چھلک رہا تھا۔ نانا ہنس کر بولے۔

"اچھا اچھا اب تم ساس بن گئی ہو اسی لیے رعب جمانے کی آج سے شروعات کر دی تم نے۔"

جگت کی ماں کو باپ کے الفاظ میں بڑی مٹھاس محسوس ہوئی جھٹ سے اندر جا کر استقبالی رسوم ادا کرنے کا سامان لے آئیں۔ ویسے تو یہ سامان بہت دنوں سے تیار رکھا تھا مگر اس کے استعمال کی نیک گھڑی آئے گی یا نہیں یہ فکر ان کو ستاتی تھی۔ بھگوان نے آج ان کے ارمان پورے کیے۔ لوٹتے ہوئے اس نے جگت کے پتا اور نانا کو میٹھی ڈانٹ پلائی۔

"بہو جب آپ لوگوں کے چرن چھوئے صرف دعاؤں سے کام نہ چلائیں بلکہ دوسری تیاری بھی ضروری ہے، سمجھے؟" سسر اور داماد ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرا دیے۔

چندن کور نے جب ریڑھے سے نیچے قدم رکھا پوری گلی پڑوس کی عورتوں سے بھر گئی۔ ہر سال گاؤں میں بہت سی شادیاں کر کے دلہنیں لائی جاتی تھیں مگر چندن کور جیسی عجیب دلہن اس گاؤں کے لیے نئی بات تھی۔ گاؤں کے دوسرے حصوں سے بھی دوڑ دوڑ کر لوگ جگت کی دلہن کو دیکھنے آ رہے تھے۔ ہزارہ سنگھ ان کا تجسس بڑھانے کے لیے خود ہی بڑبڑا رہا تھا۔

"پولیس کو ڈاک دے کر جان کی بازی لگانے کے بعد میرا بھانجا بیاہ کر بہو لایا ہے۔ اس طرح مفت میں صورت دیکھنے کو نہیں ملے گی۔"

چندن کور نے گھونگھٹ کچھ اور کھینچ لیا اور پیر کے انگوٹھے کو مٹی میں حرکت دینے لگی۔ اس کے ہاتھ میں تلوار تھی جس کی گواہی پر اس نے جگت سے شادی کی تھی۔ جگت کی ماں نے آواز دی۔

"ارے لڑکیو! ابھی میری بہو کو کیوں پریشان کر رہی ہو؟ بے چاری کو گھر میں تو آنے دو۔"

دھیمی چال چلتی ہوئی چندن گھر کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ ساس نے چادر بچھا کر اس پر مختلف چیزیں پھیلا دیں اور مسرت بھری آواز میں کہا۔

"بہو اس پر پیر رکھو۔"

چندن کور نے مہندی لگے ہوئے پیر چادر پر رکھ دیے۔

"بس اب گھر میں داخل ہو جاؤ۔" جگت کی ماں نے کہا اور بڑی احتیاط سے چادر لپیٹ کر اٹھا لی۔ چندن کور ان کے چرن چھونا چاہتی تھی۔ مگر اسے روک کر بولیں۔

"پہلے میرے پتا اور اپنے سسر کے چرن چھوؤ۔" یہ کہہ کر انہوں نے چندن کے ہاتھوں سے تلوار لے لی۔

چندن کور کے چرن چھوتے ہی بوڑھے نانا نے ہاتھ بلند کر کے دعا دی جو شاید ان کے دل کی آواز تھی۔

"سکھی رہو اور سب کو سکھ دینا بیٹی، جس بہادری سے تم اس گھر کی بہو بن کر آئی ہو اسی طرح ہمیشہ با رعب رہنا۔" پھر سونے کی چین بہو کے ہاتھوں میں دے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

جگت کے پتا بہو کے گھر میں آمد سے مسرت کے مارے پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ان کے بمشکل ادا ہونے والے الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔

"بھگوان تیرے سہاگ کو سلامت رکھے۔"

بچپن میں گود میں کھلائی ہوئی لڑکی آج ان کی بہو بن کر ان کے گھر میں آئی تھی۔ انہوں نے چندن کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ چندن کور کو اس لمس میں سسر اور پتا کا پیار چھلکتا محسوس ہوا۔

بہو جگت کی ماں کے چرن چھونے کے لیے جھکی تو انہوں نے بہو کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔ ان کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو موتی بن کر ٹپک رہے تھے۔ ان کی دعائیں ٹھنڈے پانی کے بہتے ہوئے جھرنے کی طرح تھیں۔

چندن کور، ماموں ہزارہ سنگھ کے چرن بھی چھونا چاہتی تھی۔ اس طرح کی حرکت سے بے چارہ ہزارہ سنگھ بری طرح بوکھلا گیا مگر اسی لمحے نانا اس کی مدد کو پہنچے۔

''بہو بیٹی' یوں تو ہزارہ جگت کا ماموں ہے مگر یہ تمہارے دیور کے برابر ہے۔''

انہی لمحات میں قریب کی رشتے دار عورتیں مسرت کا اظہار کرنے اور مبارک باد دینے آ پہنچیں۔ انہوں نے کہا۔

''ہاں جی' جگت بھائی کی خاموشی سے شادی کر لی مگر کم از کم مٹھائی تو کھلا دیتیں۔''

نانا جیسے اسی وقت کے انتظار میں تھے فوراً بول اٹھے۔

''کچھ صبر کر لو لڑکیو' بیاہ خاموشی سے کرنا ضروری تھا۔ باجے گاجے سے پورے گاؤں کا منہ میٹھا کریں گے۔ جاٹ کے ایک ایک گھر کو دعوت دی جائے گی۔'' پھر کچھ دیر رک کر منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

''سامنے والے ایک گھر کی بات نہیں کرتا۔''

سب لوگ سمجھ گئے کہ نانا کا اشارہ موہن سنگھ کے مکان کی جانب تھا۔ نانا نے اس وقت ہزارہ سنگھ کی جانب دیکھا۔ ان کی بات میں ایک اشارہ تھا۔ ''باقی بچے ایک دشمن کو زیادہ دن زندہ نہیں رہنا چاہیے۔''

جب باپ بیٹے تنہا ملے تو اس وقت نانا نے یہی بات کی۔

''ہزارہ' پانچ سات دن شادی کی خوشی ہو جائے اس کے بعد اسے ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کی زندگی میرے دل میں آگ بھڑکا رہی ہے۔'' نانا کی آواز میں عجیب سا تاثر تھا۔

''باپو' میں یہ بات جانتا ہوں میرے ہاتھوں میں کئی دنوں سے کھجلی ہو رہی ہے۔ اب اسے قتل کر کے فرار ہونے اور آسرا لینے کی ایک محفوظ جگہ بھی ہے۔ میرے دل میں بھی بھانجے کے ساتھ ڈاکے ڈالنے کے ارمان ہیں۔'' ہزارہ رکا' اسی لمحے نانا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ جان کر ادا کیے گئے الفاظ میں ہزارہ کی نفرت جھلک رہی تھی۔ جو بات ہزارہ اطمینان سے کہنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ وقت اس بات کے لیے مناسب سمجھا۔

''جگت نے مجھے ایسا نہ کرنے کی قسم دی ہے۔''

''قسم......؟'' نانا گرج کر بولے۔

''دشمن کو قتل نہ کرنے کی قسم' جگت کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' ان کا سرخ چہرہ دیکھ کر ہزارہ نے تفصیل میں جانا مناسب سمجھا۔

''باپو! بھانجے نے کہا ہے کہ موہن سنگھ کا قتل میرے ہی ہاتھوں ہو گا۔ مگر ابھی کچھ دیر ہے۔'' نانا کچھ ٹھنڈے ہوئے جگت کی ڈھیل ان کی سمجھ سے باہر تھی۔

''کس بات کا انتظار ہے؟ کیا نجومی سے مہورت لینا ہے دیر ہو گی تو بوڑھے کی جوان بیوی کی کوکھ سے لڑکا جنم لے گا۔ اس کا خیال اسے کیوں نہیں آتا؟'' یہ الفاظ ان کے منہ سے ادا ہوتے ہی بیٹے کی زبان بھی کھلی۔ بیٹا وہ بات کہنے لگا جس کو کہنا مجبوری تھی۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)